

# نیل

ایم اے راحت



## ننید

یہ ہسپتال ہے۔ شاید ملٹری ہسپتال، کیونکہ یہاں فوجی انداز میں ایڑیاں بجنے کی مسلسل آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ لوگ سپاٹ اور جھٹکے دار آواز میں گفتگو کرتے ہیں۔ ہر طرح کے تاثر سے غاری لمبے ہوتے ہیں۔ زنانہ اور مردانہ آوازیں ابھرتی ہیں، یقیناً کچھ نرسیں ہوں گی، کچھ ڈاکٹر ہوں ہوں گے ان کے عمدے فوجی ہوں گے، کچھ آوازیں اجنبی ہوتی ہیں اور کچھ وہ جو اکثر سنائی دیتی ہیں۔ یہ کون ہیں کیسے ہیں، مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ہاں اتنا مجھے معلوم ہے کہ میں ”گوما“ میں ہوں۔ ان کے خیال میں میرا دماغ سو گیا ہے۔ بدن کافی ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ دل کی حرکت بحال ہے اور سانس کی آمدورفت جاری ہے۔ یہ بھی خیال ہے ان کا کہ میں جسمانی طور پر بہت طاقتور ہوں اس لئے میری قوت مدافعت کام کر رہی ہے اور اس بات کے امکانات ہیں کہ شاید میں زندگی کی طرف لوٹ آؤں اس کے بعد ان کے پاس میرا کیا مصروف ہے یہ بات مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔ لیکن راز کی بات یہ ہے کہ میں ان کے خیال میں سو رہا ہوں۔ اگر یہ نیند ہے، بے ہوشی ہے تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ کاش کوئی ایک بار میری طرح بے ہوش ہو کر دیکھے۔ ساری زندگی اس سے زیادہ ہوش مندی کے لمحات اسے نہ ملے ہوں گے۔ شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی کہانیاں اہل علم، اہل دانش کو معلوم ہوں گی۔ میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ کائنات ان لمحات سے زیادہ پرسکون کبھی نہ ہوتی ہوگی۔ ہر فکر سے بے نیاز، ضروریات زندگی سے بے تعلق۔ نرسوں نے میری ناک میں نکلیاں ڈال رکھی ہیں ان کے ذریعے ان کے الفاظ میں وہ مجھے ”فیڈ کراتی“ ہیں۔ کس طرح غذا میرے معدے کو پہنچائی جاتی ہے۔ مجھے کوئی

”ہاں۔۔۔۔۔ بول۔“

”ان کا پتہ لے لینا۔ ان سے پوچھ لینا کہ اگر ہمارا دل چاہے تو ہم کبھی اسے دیکھنے آتے ہیں۔ یا پھر مجھے ان بیگم صاحب کے پاس لے چلو۔ میں خود ان کے ہاتھ جوڑ کر کہوں گی۔“

بیگم بی سال میں ایک دفعہ ہی سہی جی۔۔۔۔۔ بس مجھے دور سے میرے بچے کی شکل دکھا دیا کریں۔“

”تو آرام سے بیٹھ میں ان سے بات کر لوں گا۔“ پھر میرا باپ مجھے انگلی پکڑ کر لے ہاتا تھا۔ جو باتیں اماں اور ابا کے درمیان ہوئی تھیں ان کا مفہوم اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا۔ مگر مجھے ساتھ لے جانے والوں میں کوئی بیگم صاحبہ نہیں تھیں وہ تو خطرناک سی شکل لے سنڈے تھے جو صورت سے فقیر معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے ابا کو پیسے دے کر میری کلائی پکڑ لی تھی اور ابا منہ پھیر کر چلا گیا تھا۔ میں ابا کے پیچھے دوڑا تو ان میں سے ایک نے اپنا کر میرے بال پکڑ لئے اور مجھے گندی گندی گالیاں دے کر بولا۔

”ابے ابا کی اولاد۔۔۔۔۔ بھول جا ابا کو۔“

”میں ابا کے پاس جاؤں گا۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

”ابا کے پاس جائے گا۔“ اس نے کہا اور پھر اس نے ایک زور کا تھپڑ میرے گال پر لگایا اور میں دور جاگرا۔ وہ پھر میرے پاس آیا اور اس نے میرے بال پکڑ کر پوری قوت سے مینے اور مجھے کھڑا کر دیا۔ ”ابا کے پاس جائے گا۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا اور میرے گال پر دوسرا تھپڑ پڑا۔ پھر لائیں گھونے۔ میرے بال تھپوں کی شکل میں اکھڑ گئے تھے اور جگہ جگہ سے خون نکل آیا تھا۔

”ابا کے پاس جائے گا؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا اور جب تک میں ہاں کہتا رہا مجھے مار پڑتی رہی۔ وہ بار بار یہی سوال کرتا رہا تھا۔ ابا کا تو اب کہیں پتہ نہیں تھا۔ اس بار اس نے مجھ سے پوچھا کہ بول ابا کے پاس جائے گا تو میں نے سہم کر کہا۔ ”نہیں۔“ تب وہ مسکرا کر بولا۔

”ٹھیک۔۔۔۔۔ چلیں خیر!“ اس نے دوسرے آدمی سے پوچھا۔

”ہاں چلو۔“ دوسرا فقیر بولا پھر اس نے فپٹ کر مجھ سے کہا۔ ”اوئے آنسو پونچھ

احساس نہیں۔ میری آنکھیں بند ہیں اور میں انہیں کھولنا چاہوں تو نہیں کھول سکتا۔ اپنے بدن کے کسی حصے کو میں جنبش نہیں دے سکتا نہ مجھے اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میرے وجود میں صرف دو چیزیں مصروف عمل ہیں۔ میرے کان جو سنتے ہیں اور دماغ جو ہمیشہ سے زیادہ روشن ہے۔ بدن پر حکمران وہ سارے بند شے کھل گئے ہیں جن کی تعداد ماہرین بیس ہزار بتاتے ہیں۔ مجھے اس تعداد پر یقین ہے کیونکہ اس وقت میں اپنے دماغ کی مملکت کا بے تاج بادشاہ ہوں۔ میں ماضی سے حال تک کا سفر بڑی آسانی سے کر سکتا ہوں۔ وہ ساری باتیں جن کا کبھی مجھ سے تعلق ہو گا میرے دماغ میں محفوظ ہیں اور وہ گھٹیاں جنہیں اول تو میں نے کبھی سلجھانے کی کوشش نہیں کی اور اگر کوشش بھی کرتا تو انہیں سلجھانا ممکن نہیں تھا۔ سب کی سب سلجھ گئی ہیں۔ مثلاً میں نے کئی بار اس دن کے بارے میں سوچا تھا جب میری ماں بلک بلک کر رو رہی تھی اور میرا باپ اسے سمجھا رہا تھا۔

”خدا کی بندی‘ سوچ تو سہی۔ پورے ایک ہزار روپے دے رہے ہیں وہ لوگ ایک ہزار جو ساری زندگی میں نے کبھی نہیں کمائے نہ کبھی کما سکوں گا۔ ایک ہزار میں تو میں دکان ڈال لوں گا۔ آمدنی ہو گی تو یہ باقی اٹھ پل جائیں گے ورنہ ایک ایک کر کے سب فاتوں سے مر جائیں گے۔ ایک کی قربانی دے دے باقی کا بھلا ہو جائے گا۔ آگے تیری مرضی۔“

”سب ہی تو میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ اسے کیسے جدا کر دوں۔“ میری ماں نے کہہ سکتے ہوئے کہا۔

”مانتا ہوں، مگر اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے۔“

”کون لوگ ہیں وہ؟“ ماں نے پوچھا۔

”ارے بڑے نیک لوگ ہیں۔ ایک بے اولاد بیگم صاحبہ ہیں۔ خاموشی سے کسی کو گود لے کر پانا چاہتی ہیں۔ ایک تو ڈھنگ سے پل جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ اسے پڑھائیں لکھائیں بھی۔ کبھی بابو بن کر تیرے سامنے آئے گا تو دیکھتی رہ جائے گی۔“

ماں مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگی ہوئی تھی مگر وہ میرے بابو بن جانے کے تصورات سے مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ”سنو۔۔۔۔۔ ایک کام کرنا!“

"سائیں لونڈا جاندار ہے۔" چھنگا نے کہا۔

”تو پھر۔۔۔۔۔۵“

”مائی کھکی کی گاڑی دھکیلنے والے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے سائیں کو معلوم ہے۔“  
 ”ہوں۔“ سائیں سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ”نیا ہے، شکل سے چالاک بھی معلوم ہوتا ہے۔“

”ہم مر گئے ہیں کیا سائیں، زندہ جلادیں گے سرے کو اگر کوئی گڑ بڑ کی تو۔“ چھٹکا نے خو خوار لہجے میں کہا۔

”ہوں، مائی کھکی کا کام تو رہا پڑا ہو گا۔“

”ہاں سائیں جھومر۔۔۔ حرام خور ہوتی جا رہی ہے۔ آپ فکر مت کرو۔ ہم دور کہاں ہوتے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دور کا بندہ ہے کہیں جا بھی نہیں سکتا۔“

”کسی سے کچھ بول دیا تو.....؟“

”زبان کاٹ لیں گے، کام تو کرنا ہی ہو گا۔“ چھٹنگا بولا۔

”ٹھیک ہے، کام سمجھا دو۔“

مجھے کام سمجھا دیا گیا۔ مائی کھکی بوڑھی عورت تھی۔ کالی بھٹ، دونوں ٹانگیں ٹوٹی ہوئی، سر پر پٹی بندھی ہوئی، اس کے سر میں زخم تھا بلکہ اس کے سر میں کئی زخم تھے۔ یہ زخم ہیرا لگاتا تھا، جب بھی پرانا زخم ٹھیک ہو جاتا ہیرا ہڈیاں کوٹنے والا بغداد مار کر دوسرا زخم لگاتا تھا۔ ہیرا کی ڈیوٹی یہی تھی۔ سائیں جھو مر صرف بچوں سے ہی بھیک نہیں منگواتا تھا، اس کے پاس ہر عمر کے لوگ تھے۔ وہ آدھے شہر کا ٹھیکیدار تھا اور اس کا باقاعدہ آفس تھا جہاں اکاؤنٹنٹ کام کرتا تھا۔ ہر طرح کے حسابات رکھے جاتے تھے۔ کارکنوں کی ڈیوٹیاں لگی ہوتی تھیں۔ تو ہیرا کی ڈیوٹی یہی تھی کہ وہ مختلف ٹھکانوں پر کام کرنے والوں کے زخم لگاتا پھرے۔ میری ڈیوٹی لگائی گئی کہ میں ٹوٹی ہوئی ٹانگوں والی مائی کھکی کی لکڑی کی گاڑی دھکیل کر بتائے ہوئے ٹھکانوں پر لے جاؤں اور اس کے ساتھ بھیک مانگوں میلے کچیلے پھٹے پرانے

۱۔ ”اور میں نے آنسو پونچھ لئے۔ پھر میں نے بس کا سفر کیا اس کے بعد ریل کا اور نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اس کے بعد ایک بڑے سے گھر میں مجھے سائیں جھومر کے سامنے پیش کیا گیا۔ سائیں جھومر آدھا تھا۔ اس کے پاؤں دھڑ کے پاس سے گئے ہوئے تھے۔ بیاں بازو کندھے کے پاس سے غائب تھا اسی طرف کی ایک آنکھ کی جگہ گڑھا تھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا تھا۔ پھر ان دونوں کو دیکھ کر کہا۔

”کیا لوگے؟“

”سائیں سچا سودا ہے۔ اس کے باپ نے اسے بیچا ہے۔ کسی طرف سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پانچ ویئے تھے ہم نے اسے‘ باقی خرچہ الگ۔ اوپر سے جو چاہو دے دو۔“

”سچا سودا ہے۔ سچ کہہ رہے ہو؟“ سائیں نے پوچھا۔

”پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے؟“ خیر نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ دو اوپر لے لو۔۔۔۔۔ ڈھکن۔“ سائیں نے کسی کو آواز دی اور ایک آدمی پاس آگیا۔ ”انہیں سات ہزار دے دو۔“

"سائیں دو تو اوپر سے خرچ ہو گئے ہیں۔" خیرو بولا اور آدھے سائیں نے انہیں اکلوتی آنکھ سے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ ہوائی جہاز میں لائے ہو کیا۔ پیسے لو اور دفع ہو جاؤ۔“

”جو حکم سائیں۔ سائیں کے سامنے گردن تھوڑی اٹھائیں گے۔“ خیر و قمیص نکال کر بولا۔ مجھے ایک بوے سے کنہرے میں بند کر دیا جہاں آٹھ لڑکے اور بند تھے۔ ان میں سے کچھ کے پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ دو کے پاؤں پر پلاستر چڑھے ہوئے تھے۔ کسی کے گال پر زخم تھا کسی کے بازو پر ----- دو تین دن میں میری ان سے دوستی ہو گئی اور انہوں نے مجھے اپنی دردناک کہانیاں سنایں ان کے یہ زخم لگائے گئے تھے ورنہ پہلے وہ ٹھیک تھے۔ اب یہ سب بھیک مانگتے تھے اور شام کو سائیں کو دن بھر کی کمائی پیش کر دیتے تھے۔ بہت مشکل سے یہ سب کچھ میری سمجھ میں آیا تھا۔

”سائیں اس کے لئے کیا حکم ہے۔“ چھنگا نے مجھے سائیں کے سامنے پیش کیا اور سائیں اکلوتی آنکھ سے مجھے گھورنے لگا پھر بولا۔



کپڑے مجھے دیئے گئے۔ چھنگا نے میرے چہرے پر میک اپ کیا اور پھر میرا افتتاح ہو گیا۔ ویسے بھی یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مائی کھکی صدا لگاتی تھی۔

”یتیم بچہ ہے بابو جی۔ معذور ہوں۔ دے دو اللہ کے نام پر۔۔۔“ زندگی ایک نئے تجربے سے روشناس ہوئی تھی۔ شاید پہلا ہی دن بڑا بھاگوان ثابت ہوا تھا۔ شام کو دن بھر کی کمائی آدھے شہر کے آدھے ٹھیکیدار کو پیش کی گئی تو وہ حیرت سے چونک پڑا۔

”بارہ سو اسی۔۔۔۔۔ ابے کیا ڈاکہ مار دیا تھا کہیں۔“

”سائیں چھنگا کی نظریں بہت دور تک دیکھتی ہیں۔ لونڈے کے چہرے کا بھوپن لوگوں کے کیلجے ہلا دیتا ہے۔“

”ہوں۔ قلفی کھاؤ اسے انعام میں۔“ سائیں جھومرنے لگا۔

اس دن سے میری عزت بڑھ گئی۔ میں کماؤ پوت قرار دے دیا گیا۔ مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ گھریا آتا تھا۔ بہن بھائی یاد آتے تھے۔ وقت نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ ابائے املاں سے جھوٹ بولا تھا۔ کوئی بیگم صاحبہ مجھے گود نہیں لینا چاہتی تھیں۔ بس ابائے مجھے ایک ہزار روپے میں بیچ دیا تھا اور اب مجھے یہی کرنا تھا۔ اس وقت ایک سختی سی دل میں ابھر آتی تھی۔

بغیر دانتوں کی مائی کھکی نے ایک دن مجھ سے پوچھا۔ ”گھریا آتا ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کوئی تھا؟“

”نہیں۔“

”ملاں باپ‘ بہن بھائی کوئی نہیں۔“

”کوئی نہیں۔“

”میرے تھے۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

”کون؟“

”میاں تھا۔۔۔۔۔ ایک بیٹا تھا۔“

”میاں چری تھا۔ جب تک جوان رہی اس نے مجھے نکل بٹائے رکھا پھر وہ مر گیا۔“

”بس، زخمی ہو گئی۔“

”بیٹا کہاں گیا؟“

”باپ چری تھا‘ بیٹا ہیرو تھی۔۔۔۔۔ مگر وہ باپ سے زیادہ سنگدل نکلا۔ اس نے مجھے مائیں بھومر کے ہاتھ بیچ دیا اور۔۔۔۔۔ جھومرنے مجھے اپانج کر دیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے میری۔“

مجھے اس کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ساری دنیا بہت بری لگتی تھی سب کچھ برا لگتا تھا۔ نہ کوئی دوست نہ کوئی دشمن۔ مائی کھکی کی عمر بھی خوب تھی۔ زخم پر زخم لہائے جا رہی تھی مگر مرنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ہمارا کام خوب چل رہا تھا۔ آدھا سائیں بھی خوب چل رہا تھا۔ اب مجھے دوسرے کام بھی ملنے لگے تھے۔ کبھی کبھی بغداد بھی استعمال لڑنا پڑتا تھا۔ ویسے زیادہ تر مائی کھکی کے ساتھ رہتا تھا۔ اتفاق تھا ہم دونوں کا جوڑ بڑا منافع بخش تھا۔ میری عمر بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی صحت بھی عمدہ تھی لیکن اب سائیں جھومر کو مجھ پر ہر طرح کا اعتماد ہو گیا تھا اس لئے نہ اسے میری عمر کی پروا تھی نہ صحت کی ورنہ وہ زیادہ آگے بڑھ جانے والوں کا بڑا ”خیال“ رکھتا تھا لیکن تھا فقیر کا فقیر۔ کوئی اونچی سوچ نہیں رکھتا تھا اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میرا چہرہ اس قدر کھردرا کیوں ہو گیا ہے۔ میرے ہونٹ مسکراہٹ نا آشنا کیوں ہیں۔ میرے دل میں ایک جوالا کھکی سا کیوں پکتا رہتا ہے۔ کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ کروں۔ کوئی ایسا کام جو اس پکتے ہوئے، کھولتے ہوئے آتش فشاں پر ٹھنڈک کی ایک بوند ڈال دے۔ مگر کیا۔۔۔۔۔ یہی اب تک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ سمجھ میں آتا تو کر ڈالتا۔

پھر ایک دن خود بخود کچھ ہو گیا۔ مائی کھکی پر ڈیوٹی لگی تھی۔ معمول کے مطابق اس لی گاڑی دھکیل رہا تھا۔ ایک بابو صاحب کار سے اترے۔ ساتھ میں بیگم صاحبہ بھی تھیں۔ دونوں بہت خوبصورت تھے۔ بہت شاندار لباس پہنے ہوئے تھے۔ بہت شاندار کار سے اترے تھے۔

”بابو جی۔۔۔۔۔ اللہ کے نام پر۔۔۔۔۔ میں نے گاڑی ان کے سامنے روکتے ہوئے کہا اور بابو جی بگڑ گئے۔“

”ہٹو سامنے سے۔“ وہ غرائے۔

”یتیم ہوں جی۔ ماں بیمار ہے۔ اس کے علاج کے لئے کچھ دے دو بابو۔“

”بے غیرت کے بچے۔۔۔۔۔ پهلوان کا پهلوان ہے۔ اپنے بازوؤں کی محنت سے ماں کا

علاج نہیں کرا سکتا۔“ بابو صاحب نے کہا۔

”کرا سکتا ہوں بابو جی۔۔۔۔۔ مگر بے غیرت کا بچہ ہوں“ میں نے کہا۔

”دیکھا تم نے رومی۔۔۔۔۔ فلسفہ بگھار رہا ہے۔ گاڑی سامنے سے ہٹاتا ہے کہ

نہیں۔“ صاحب نے یتیم صاحبہ سے کہا۔

”افوہ۔ ناصر۔۔۔۔۔ کچھ دوا سے تاکہ یہ سامنے سے ہٹے۔“ یتیم صاحبہ بولیں۔

”ان لوگوں کو کچھ دینا معاشرے کے ناسوروں کو پروان چڑھانا ہے۔ اسے دیکھو“

جس صحت اور تندرستی کا مالک ہے اس سے تو یہ دیواریں ڈھا سکتا ہے۔ اسے ہاتھ پھیلا کر

مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ یہ چھین سکتا ہے۔ اسے ہاتھ نہیں پھیلا نا چاہئے۔ اسے کچھ

دینا معاشرے کے ساتھ غداری ہے۔“ صاحب نے خالی جگہ سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

مگر میں نے ہاتھ پھیلا کر بابو صاحب کا راستہ روک لیا۔

”اچانک غیرت آگئی ہے بابو جی۔۔۔۔۔ بے غیرت کا بچہ ہوں مگر بے غیرت نہیں۔

آپ نے یاد دلا کر راستہ بدل دیا۔“ یہ کہہ کر میں نے بابو جی کا بازو پکڑ کر اسے موڑا۔ وہ

کراہ کر دہرے ہوئے تو میں نے ان کی جیب سے پرس نکال لیا۔ ان کی ساتھی عورت بری

طرح چیخ رہی تھی۔ بابو جی بھی اچھے تن و توش کے مالک تھے مجھ سے لپٹ گئے مگر میں نے

ان کی گردن میں ہاتھ ڈالا جھکائی دے کر سر پر لا دا اور زمین پر دے مارا۔ اس بار بابو جی بھی

زور سے جھٹکتے تھے اور ان کی ساتھی خاتون زور زور سے چیخ کر بچاؤ بچاؤ پکار رہی تھیں

بھری پری مارکیٹ تھی۔ ایک بینک کے سامنے دو پولیس والے بھی ڈیوٹی دے رہے تھے۔

وہ میری طرف دوڑے تو میں نے بھی ایک لمبی چھلانگ لگا دی۔ اب بے شمار لوگ میرے

پیچھے دوڑ رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔ چونکہ یہ مارکیٹ تھی اور جگہ جگہ پولیس کی ڈیوٹی

ہوتی تھی اس لئے جب میں ایک گلی میں داخل ہوا تو مزید دو پولیس والے اچانک میرے

سامنے آ گئے۔

”خبردار۔۔۔۔۔“ ان میں سے ایک زور سے دھاڑا۔ مگر اسے کھانسی آگئی۔ وہ جتنی

زور سے چیخا تھا اتنی طاقت اس کے بدن میں نہیں تھی کھانسی نے اس کا حلیہ خراب کر دیا

البتہ دوسرے نے مجھ پر رائفل تان لی۔ پیچھے دوڑنے والے بھی قریب آتے جا رہے تھے

ناناچہ میں نے کمزور پر ہاتھ ڈال کر دنیا کا اصول اپنایا اور کھانتے ہوئے کانٹیل کو اٹھا کر برق

رائفاری سے رائفل والے پر دے مارا۔ مگر بد قسمتی سے گولی چل گئی اور پولیس کانٹیل کی

افراش چیخ بھری گولی کی آواز سن پر پیچھے آنے والے رک گئے اور مجھے موقع مل گیا۔ میں

نے پھر آگے چھلانگ لگا دی اور پھر دوڑتا ہوا ایک سڑک پر نکل آیا۔ جیسے ہی میں نے گلی

سے سڑک پر قدم رکھا ایک پک اپ میرے سامنے آئی اور اس نے بریک لگا دیئے۔ اگر

میں ایک قدم اور آگے بڑھتا تو بری طرح اس سے ٹکرا جاتا۔ پھر بھی میں نے دونوں ہاتھ

پک اپ پر ٹکا کر خود کو روکا تھا پک اپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے فوراً

روازے کا ہینڈل کھولا اور چیخ کر بولا۔

”اندر آ جاؤ۔۔۔۔۔ وہ تم تک پہنچ جائیں گے“ فوراً اندر آ جاؤ۔“

صورت حال واقعی ایسی تھی کہ اس وقت سوچے سمجھے بغیر عمل کرنا تھا۔ چنانچہ میں

پک اپ میں بیٹھ گیا اور ڈرائیونگ کرنے والے نے پک اپ آگے بڑھا دی۔ میں نے

ابتداء میں تو سائیڈ مرر میں پیچھے دیکھا اور اس بات کا تعین ہونے کے بعد کہ پیچھے کوئی نہیں

ہے اپنے اس ہمدرد کو غور سے دیکھا۔ چوڑے اور مضبوط بدن کا مالک تھا۔ داہنے گال پر

زخم کا کمر انشان تھا اور داہنا کلاں غائب تھا۔ اس کی جگہ مڑے مڑے گوشت کا ایک پھوڑا سا

اُبھرا ہوا تھا۔ اس نے جب یہ محسوس کیا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں تو وہ بولا۔

”سادو ہے میرا نام۔۔۔۔۔ اس وقت میں برابر کی دکان سے تولیہ خرید رہا تھا جب اس

بابو نے تمہیں بے غیرت کا بچہ کہا تھا۔ اس کے بعد کی ساری کارروائی بھی میں نے دیکھی

تھی اور مجھے خوشی ہوئی تھی کہ تم نے اسے اچھا سبق دیا۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس کے

بعد کیا ہو گا۔ وہی ہوا جس کا میں نے اندازہ لگایا تھا۔ میں اس وقت اپنی پک اپ کی طرف

دوڑ گیا تھا۔ اگر تم اس گلی سے سڑک تک آنے کا فیصلہ نہ کرتے تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔

تمہارا نام کیا ہے۔“

”شکر ہے تمہاری سمجھ میں آگیا۔ اب نام بھی بتا دو۔“  
 ”کمانا کوئی نام نہیں ہے۔ تمہیں گالیاں آتی ہیں۔“ میں نے اچانک اس سے سوال کیا۔

”گالیاں؟“

”ہاں۔ اپنی پسند کی کوئی گالی مجھے دو اور اسے میرا نام سمجھ لو۔“

”کیوں؟“

”یہی سب میرے نام ہیں۔ یقین کرو۔ اس نے مجھے بے غیرت کا بچہ کہا تھا۔ مجھے بالکل برا نہیں لگا بس ان کا چھین لینے کا مشورہ مجھے پسند آیا تھا اور میں نے اسی سے ابتداء کر دی۔ اصل میں پہلے کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔“  
 وہ مجھے ایک فلیٹ میں لے گیا۔ بہت خوبصورت گھر تھا۔ ایک بوڑھی عورت وہاں تھی۔

”یہ تمہاری ماں ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ نوکرانی ہے۔ تم یہاں آرام سے رہو۔ یہ تمہارے سارے کام کرے گی۔“

میں پلتا ہوں۔

”کہاں؟“

”رات کو واپس آ جاؤں گا۔ پھر آرام سے باتیں کریں گے۔“

مگر وہ رات کو واپس نہیں آیا۔ میں آرام سے سو گیا تھا۔ بوڑھی عورت مجھے یوں انہی لگی تھی کہ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور جو کچھ میں نے کہا وہ خاموشی سے لیا۔ کھانا بھی اس نے بہت اچھا پکایا تھا اور دوسری صبح ناشتہ بھی بہت اچھا تھا۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں پیش آئی تھی یہ نیا ٹھکانہ ملا تھا تبدیلی اچھی لگی تھی۔ اگر اس سے پہلے بھی کوئی تبدیلی عمل میں آ جاتی اور مجھے پسند ہوتی تو میں قبول کر لیتا۔ اب نہ مجھے سائیں بمومر کی فکر تھی نہ چھنگا کی۔ البتہ رات کو ایک مزیدار ڈرامہ ہوا۔ ساہو کوئی آٹھ بجے کے قریب آیا تو چھنگا اس کے ساتھ تھا۔ مجھے دیکھ کر بری طرح اچھل پڑا اور جلدی سے بولا۔ ”یہی ہے۔“

”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔

”بتانا نہیں چاہتے؟“ وہ بولا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”میرا کوئی نام نہیں ہے۔ جن لوگوں نے میرا کوئی نام رکھا تھا ان سے مجھے اس قدر نفرت ہے کہ کوئی ان کا رکھا ہوا نام میرے سامنے لے دے تو مجھے اس سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔“

”کون تھے وہ؟“

”کوئی نہیں۔۔۔۔ اور اب تم فضول باتیں مت کرو۔ تمہاری مہربانی کہ تم نے میرے ساتھ یہ احسان کیا۔ مگر اس کے بدلے میں تم نے میرا انٹرویو لیتا ہی شروع کر دیا۔ بس اگلے چوراسے پر مجھے اتار دو۔“ ”مناسب نہیں ہو گا۔“ وہ بولا۔

”کیا۔۔۔۔۔ ۵۔“

”تم نے غور نہیں کیا تھا جس سپاہی کو تم نے دوسرے رائفل والے سپاہی پر دے مارا تھا وہ مر گیا ہو گا۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔ ۵۔“ میں نے سوال کیا۔

”کیا تم پاگل ہو، پولیس تمہیں قتل کے جرم میں گرفتار کر لے گی۔ قتل اور وہ بھی ایک پولیس والے کا۔ عدالت تو تمہیں اس وقت سزا دے گی جب تم سزا کے قاتل ہو گے پولیس خود ہی تم سے اپنا حساب کر لے گی۔“

”کیا کرے گی؟“

”ہڈیاں تک کوٹ دے گی تمہاری۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“ میں نے پوچھا۔

”نی الحال میرے ساتھ رہو۔ میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ تم

مجھ پر اعتبار کرو۔ مجھے دوست سمجھو۔“

”ٹھیک ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ اسے جانتے ہو؟“ ساجو نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔۔۔۔۔ چھنگا ہے۔“ میں نے کہا۔

”سائیں جھومر فرار ہو گیا ہے۔ مائی کھکی گرفتار ہو گئی تھی۔ پولیس نے اس سے تمہارے بارے میں پوچھا تو اس نے سائیں جھومر کے بارے میں بتا دیا۔ پولیس نے جھومر کے اڑے پر چھاپے مارا تو وہاں سے کئی اغواء شدہ بچے حاصل ہوئے اور سائیں جھومر فرار ہو گیا البتہ کچھ لوگ پکڑے گئے۔ یہ چھنگا بھی بھاگتے ہوئے میرے ہاتھ لگ گیا۔ جانتے ہو یہ میرے ہاتھ کیسے لگا؟“ ساجو مسکرا کر بولا۔

میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔ ”یہ تمہاری اور مائی کھکی کی نگرانی کی ڈیوٹی دیتا تھا۔“

”میں جانتا ہوں یہ تو بہت سے لوگوں پر ڈیوٹی دیتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس وقت بھی یہ تمہارے پیچھے تھا اور یہ واحد آدمی تھا جس نے تمہیں میری پک اپ میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ پھر جب میں صورت حال معلوم کر رہا تھا تو اس نے میری پک اپ کا نمبر پہچان لیا۔ اصل میں تمہیں تو صورت حال معلوم نہیں ہو گی۔ کل سے میں تمہارے پاس اسی لئے نہیں آیا کہ تمہارے بارے میں معلوم کر رہا تھا۔ میں نے اپنی تفتیش وہیں سے شروع کی جہاں تم مجھے ملے تھے۔ ان بابو صاحب کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی جنہیں تم نے اٹھا کر پنچا تھا۔ پولیس والا بے چارہ گولی سے ہلاک ہو گیا۔ مائی کھکی کو پولیس لے گئی اور اس نے سائیں جھومر کی ساری پول کھول دی۔ بس، پھر یہ سارا ہنگامہ ہو گیا اور اخباروں میں سب کچھ چھپ گیا۔ اس کے بعد یہ چھنگا صاحب مجھے مل گئے اور انہوں نے میری پک اپ میں چھپ کر سفر کیا پھر مجھے روک کر مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ تم میرے پاس ہو۔“

”ہم لوگ بھیک مانگتے ہیں۔ تجھ سے ڈاکہ زنی کے لئے کس نے کہا تھا؟“ چھنگا آنکھیں نکال کر بولا۔

”میں نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا چھنگا۔ اس بابو نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا اور وہ اپنی خوبصورت ساتھی عورت پر رعب ڈال رہا تھا۔ بس میں نے اس کا مشورہ اسی پر آزما

ڈالا۔“

”اور تیری وجہ سے جو کچھ ہوا ہے وہ تجھے معلوم ہو گیا۔ خیر پولیس نے جسے جسے پکڑا ہے وہ تو نکل آئے گا۔ سائیں جھومر اتنا کچا بندہ نہیں ہے کہ اس چکر کو لہبا چلنے دے دو چار دن میں وہ سب ٹھیک کر لے گا مگر میری ایک بات تو بھی سن لے۔“

”کیا۔۔۔۔۔ ۵۔۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔

”مائی کھکی کی جگہ کچھ دنوں کے بعد تو گاڑی میں ہو گا اور تیرے ہاتھ اور پاؤں کٹے ہوں گے۔“

”نہیں۔ اب سائیں جھومر میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکے گا۔“

”تو کس کھیت کی مولی ہے لونڈے۔ تماشا تو دیکھ کیا ہوتا ہے۔“ چھنگا نے اپنے منہ میں انداز میں کہا۔

”ایا ذیال ہے دوست؟“ ساجو نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”ہیں، دیکھوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔“ ساجو بولا۔

”ایا؟“ میں نے پوچھا اور ساجو نے جیب سے ایک چھوٹا سا ریو الور نکالا اس پر ننھا سا ماسٹر فٹ کیا اور اسے میری طرف بڑھا کر بولا۔

”ب: تم گولی چلاؤ گے تو کوئی آواز نہیں ہو گی۔ اس کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم ا۔ تم کہاں ہو۔ بس یہ ٹرائیگر دباتے چلے جاؤ۔ اس ریو الور سے بہت سی گولیاں نکلیں گی ا۔ تمہارا نشانہ اچھا بھی نہیں ہے تو کوئی نہ کوئی گولی تو اس کے دل میں گھس ہی جائے گی۔“ میں نے اس کی بات سنی چھنگا نے بھی سنی اور میں نے ریو الور ساجو کے ہاتھ سے لے لیا۔

”تو۔۔۔۔۔ تو مجھ پر گولی چلائے گا۔ مجھ پر۔“ چھنگا کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

”اس دنیا میں ہر شخص، ہر شخص پر گولی چلا دیتا ہے چھنگا، بس شرط یہ ہے کہ ریو الور پر سالنسر لگا ہو اور آواز کسی کو نہ سنائی دے۔“ میں نے کہا اور پھر ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔ چھنگا کے بدن میں بہت سے سوراخ ہو گئے تھے۔ جب وہ گر کر ساکت ہو گیا تو ساجو نے پر سکون

”لاش کی تم بالکل پرواہ مت کرو۔ اسے ٹھکانے لگانے میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔“

ساجو کا اصل نام ساجد تھا۔ ہمارے گروہ کے بیٹوں نے میرے بارے میں تفصیل معلوم کر کے مجھے ٹائیگر کا نام دیا تھا۔ میں نے اس پر کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ساجو نے مجھ سے کہا۔

”سائیں جمہور کا گروہ اچھا خاصا ہے مگر ہماری کبھی ان سے چلی نہیں ہے اور وہ بھکاریوں کا گروہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ ہم اس کی صفائی کریں۔ تمہارے بارے میں بھی انہیں کچھ نہیں معلوم، اگر کبھی معلوم ہوا اور سائیں نے تمہارے خلاف کوئی حرکت کی تو اس کے لئے ایک چار پونڈ کا بم کافی ہو گا۔ ماسٹرز اب تمہاری ٹریننگ کرنا چاہتے ہیں۔“

ساجو جس گروہ کا رکن تھا اس کی جڑیں نہ جانے کہاں کہاں پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے کام بہت بڑے بڑے تھے۔ ضرورت کی جگہوں پر بم بلاسٹ کرنا معقول معاوضے لے کر قتل کرنا، ہر طرح کے جرائم معاوضے پر کئے جاتے تھے اور اس کے لئے ماہرین کی تربیت کی جاتی تھی۔ گروہ کے کام بے حد ذہانت سے ہوتے تھے اور ٹریننگ کربتے ہوئے ہر چیز کا خیال رکھا جاتا تھا مثلاً میرے نظریاتی تربیت کے استاؤ نے کہا۔

”انسان کو اخروٹ بالکل نہیں ہونا چاہئے۔ یعنی اوپر سے سخت اور اندر سے نرم۔۔۔۔۔ بلکہ اسے اوپر سے نرم اور اندر سے سخت ہونا چاہئے، سمجھ رہے ہوتا۔۔۔۔۔ ۵“

”تمہارے اندر پلک نہیں ہے۔ طاقتور لکڑی بید کی ہوتی ہے جو پلکدار ہوتی ہے۔ نرم اور دہری ہو جانے والی۔۔۔۔۔ لیکن جس پر بڑے گوشت میں اتر جائے۔ بید کی لکڑی ہو، پلکدار، لیکن طاقتور۔۔۔۔۔“ انہوں نے مجھے کارپینٹر کا کام سکھایا اور میں لکڑی کا فرنیچر بنانا سیکھ گیا یہ بھی ان کے اصولوں کا ایک حصہ تھا۔ خود کو معاشرے کا ایک اچھا فرد ظاہر کرنے کے لئے کوئی ہنر ضروری ہوتا ہے۔

”بات یہ نہیں ہے کہ تمہیں بڑھی کا کام کرنا ہے۔ ایک ہنرمند ہمیشہ باعزت ہوتا

ہے اور کون جانے کون سا ہنر کس وقت کام آجائے ہم اپنے کارکنوں کو ہر طرح محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔“ اس کے علاوہ ہتھیاروں کا استعمال، مارشل آرٹس اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔۔ ہاں میرے اندر ایک فرق ضرور پیدا ہوا تھا۔ بھکاریوں کا وہ گروہ بھی دہشت گردوں کے اس گروہ سے کسی طرح کم نہیں تھا جو بین الاقوامی نوعیت کا تھا لیکن سائیں جمہور کے گروہ میں گھناؤنے کام ہوتے تھے جن سے طبیعت بوجھل رہتی تھی۔ اس گروہ کے کام بے حد خطرناک اور معیاری ہوتے تھے اور ان سے میرے اندر چھپے جنون کی تسکین ہوتی تھی۔ ہم کیا کام کرتے ہیں۔ کس کے لئے کرتے ہیں ہمیں اس سے غرض نہیں ہوتی تھی۔ بس ایک ذمے دار کی طرح وہ کام سرانجام دیتا ہوتا تھا جس کا حکم ملے۔۔۔۔۔ اور میری پھرتی، چستی اور مستعدی نے مجھے گروہ کا مقبول ترین فرد بنا دیا تھا۔ میں ہر وہ کام کر لیتا تھا جس سے دوسروں کی روح کا پتی ہو۔ میرے دل سے رحم نام کا ہر جذبہ نکل چکا تھا۔ حکم صرف حکم۔۔۔۔۔ خوش شکل، توانا جوان میرے سپرد کئے جاتے اور میں ان پر تشدد کر کے وہ معلوم کرتا جو انہیں بتانا ہوتا تھا۔ میرے عمل سے جب کوئی چیخنے لگتا تو میں ان کے چہروں پر اپنے مضبوط پاؤں اور مضبوط جوتوں سے ٹھو کریں مارتا اور لہولہاں ہو جاتے۔ پھر میں ان پر مختلف اوزار استعمال کرتا۔ چمڑے کے تیل میں بھیجے ہنروں سے انہیں اتنا پٹیتا کہ ان کی کھال ادھڑ جاتی اور گوشت ہنریں چپک کر اکھڑ آتے۔ ہم لوگوں کو ہدایت تھی کہ جن لوگوں کو اذیت کے لئے ہمارے حوالے کیا جائے انہیں گولی کبھی نہ ماری جائے بلکہ اگر انہیں ختم کرنا مقصود ہو تو اس قدر اذیتیں دی جائیں کہ وہ حتم ہو جائیں۔ ہم لوہے کی گرم سلاخیں ان کی آنکھوں اور نشتوں میں بے دریغ داخل کر دیتے اور اس وقت کا منظر۔۔۔۔۔ بے حد عجیب ہوتا تھا۔

میرے گروہ نے مجھے جلاذ کا خطاب اس عورت کی زبان کھلوانے کے لئے دیا تھا جس پر سب طبع آزمائی کر چکے تھے۔ جن لوگوں کو اس عورت سے کچھ معلوم کرنا تھا وہ کون تھے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا کام یہ تھا کہ اس عورت کی بند زبان کھلواؤں جو کسی کے بس میں نہیں آ رہی تھی اس کے جسم کو جگہ جگہ سے پکھلا دیا گیا تھا، مگر وہ لٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔

”دیکھیں تمہارے ترکش میں اب کون سا تیر ہے۔ وہ تو جان دینے پر تلی ہوئی ہے۔  
اب بتاؤ کیا کرو گے۔“ میرے ساتھیوں نے مجھے چیلنج کیا۔  
”چھ سات سال کا ایک بچہ درکار ہے مجھے۔“ میں نے کہا۔  
”بچہ۔۔۔۔۔ ۵“ ایک ساتھی نے حیرت سے پوچھا۔  
”مجھ سے سوال کرو گے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اور سنو“ بچہ خوبصورت ہوتا  
چاہئے۔“

یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ گول منول معصوم بچے نے ہوش میں آکر حیرت سے  
زخمی عورت کو دیکھا۔ پھر اپنے گلابی ہونٹ بسورتے ہوئے بولا۔  
”میری مما کہاں ہے۔“ تب جاگنی میں مبتلا عورت نے سرخ آنکھوں سے بچے کو  
دیکھا اور ہم نے اس کی آواز سنی۔  
”کون ہو تم؟“

”ٹونی۔۔۔۔۔ آئی میری مما کہاں ہیں؟“

”میں نہیں جانتی مگر۔۔۔۔۔“

”جان سکتی ہو۔ بشرطیکہ سبز فائل کے بارے میں بتا دو۔“ میں نے عقب سے نمودار  
ہو کر کہا۔ عورت نے نظریں گھما کر مجھے دیکھا پھر انتہائی سرد پٹ لہجے میں بولی۔  
”تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس بچے سے میرا دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔  
تم اسے کہاں سے لے آئے ہو۔“

”تعلق قائم ہو جائے گا۔ تم سبز فائل کے بارے میں بتانا پسند کرو گی۔“ میں نے کہا  
اور عورت نے نفرت سے آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر بچے کی دلدوز چیخ پر اس نے آنکھیں  
کھول دیں۔ میں نے کنٹر پلاس سے بچے کی چھوٹی انگلی اس کے ہاتھ سے الگ کر لی تھی اور  
پتلے تازہ سرخ خون کا فوارہ اس کے ہاتھ سے بلند ہو رہا تھا۔ بچہ ماما چیخ رہا تھا اور میں  
مسکرا کر عورت کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کرب کے عالم میں کہا۔

”خدا کی قسم اس بچے سے میرا دور کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم اسے کیوں اذیت  
دے رہے ہو۔“

”مگر اس بچے کا اپنی ماں سے تعلق تھا جسے اس کے باپ نے ایک ہزار روپے کے  
عوض بیچ دیا تھا۔“ میری غراہٹ خود میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے اسپرٹ کی شیشی  
بچے کے سنہرے بالوں پر انڈیل کر لائٹر نکال لیا۔  
”یہ کیا کر رہے ہو۔ آہ یہ تو اسپرٹ کی بو ہے۔“ عورت متوحش ہو کر بولی۔  
”اور یہ لائٹر ہے۔ میں اسے روشن کروں گا اور اس کے سنہرے بال اور چہرہ جھلس  
کر کالا ہو جائے گا۔“

”ایسا نہ کرو۔۔۔۔۔ میں تمہیں سبز فائل کا پتہ بتاتی ہوں۔“ عورت بولی اور پھر اس  
نے میرے ہر سوال کا جواب دے دیا۔ میرے ساتھ موجود لوگ مجھے عقیدت بھری نظروں  
سے دیکھ رہے تھے۔ بچے کے ہاتھ سے بننے والا خون زمین پر مسلسل جمع ہو رہا تھا اور اس  
کے رخساروں کی گلابی رنگت سفید پڑتی جا رہی تھی۔ اب اس کی آنکھیں چڑھنے لگی  
تھیں۔

”اس کا خون بند کرو کتو۔۔۔۔۔ یہ مرجائے گا۔ میں نے تمہیں سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔  
آہ اسے بچاؤ۔۔۔۔۔!“ عورت کی آنکھوں سے خون بننے لگا۔

”اسے کس نے بچایا تھا جو کہہ رہا تھا کہ میں ابا کے پاس جاؤں گا۔ بچایا تھا اسے کسی  
نے۔ اس کی ماں کہاں گئی تھی۔ وہاں کوئی تمہاری جیسی عورت کیوں نہیں تھی۔“ میں نے  
لائٹر بچے کے سر سے لگا دیا۔۔۔۔۔ اور بچہ دردناک آواز میں چیخنے لگا۔

”ساجو نے کہا۔“ تم واقعی جلا دہو۔۔۔۔۔ اکمال ہے۔“

عورت نے کہا۔ ”سنو میں نے کبھی کسی کو بد دعا نہیں دی۔ پہلی بار تو کوئی انسان  
کسی انسان سے بھی کچھ مانگتا ہے تو وہ اسے دے ہی دیتا ہے۔ میں تو خدا سے مانگ رہی  
ہوں میں تمہارے لئے فنا مانگتی ہوں۔ معبود۔۔۔۔۔ میرے معبود انہیں فنا کر دے۔ انہیں ان  
کے ظلم و ستم کے ساتھ فنا کر دے۔ آہ انہیں فنا کر دے۔ انہیں فنا کر دے۔“

پھر عورت مر گئی۔ بچہ بھی مر گیا۔ مگر ساجو پریشان ہو گیا تھا۔ ”تمہیں پہلے کسی نے  
بد دعا دی ہے۔“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”مجھے کسی نے کچھ نہیں دیا۔“ میں نے جواب دیا۔

”نہ جانے کیوں ٹائیگر۔۔۔ میں ڈر گیا ہوں۔“  
 ”خود کشی کر لو۔۔۔!“ میں نے اسے مشورہ دیا۔

”سمجھا کرو یار۔۔۔ پتہ نہیں اس عورت کی بات میں کیا چیز تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”خیر فائل کا پتہ معلوم ہو گیا ہے۔ اسے حاصل کر کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچاؤ۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا اور ساجو نے گردن ہلا دی۔ مگر اس کے چہرے پر خوف کی لکیر نمایاں تھی۔

پھر ہم سب گرفتار ہو گئے۔ اس وقت چوبیس افراد ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے جب ملٹری نے ہمارا ہیڈ کوارٹر گھیرے میں لے لیا تھا۔ میگافون پر ہمیں گھیر لینے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اس وقت وکیل شاہ مگراں تھا اس نے کہا۔

”مقابلہ کرو۔۔۔!“ یہ مقابلہ سات گھنٹے جاری رہا تھا۔ اس دوران مارٹر گنیں، مشین گنیں، دستی بم، ہر چیز استعمال کی گئی۔ فوج نے صورت حال کا جائزہ لے کر دور دور تک کا علاقہ خالی کر لیا تھا اور مرحلے وار کارروائی کرتی چلی گئی تھی۔ ہم سب کا ایک ہی خیال تھا وہ یہ کہ کسی نے اعلیٰ درجے کی مخبری کی ہے پولیس کے بجائے ملٹری کا ریڈ اسی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہمارے کچھ بندوں نے مگراں کے حکم سے انحراف کر کے فرار ہونے کی کوشش کی وہ یا تو گرفتار ہو گئے یا مارے گئے یا پھر ہو سکتا ہے کہ فوج نے کسی طرح منٹوں میں ان کی زبان کھلوا کر اندر کی چویشیں معلوم کر لی ہو۔ کیونکہ آخری حربے کے طور پر انہوں نے ہم پر خواب آور گیس استعمال کی تھی اور ہم گہری نیند سو گئے تھے۔ اس کے بعد جس جگہ آنکھ کھلی تھی وہ ایک عقوبت خانہ تھا۔ بات بہت بڑے گروہ کی تھی جو دہشت گرد تھا اس لئے کسی بھی شخص کے ساتھ رعایت کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً وہ ملٹری انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران تھے جو اس بارے میں تحقیق کر رہے تھے۔ عقل و دانش سے آراستہ۔ وہ جانتے تھے کہ گرفتار ہونے والوں میں کون کون ہے، کون دماغ۔۔۔ سزا تو سب کے لئے تھی لیکن اس وقت دانش وروں کی شامت آئی تھی کیونکہ گروہ کے راز وہی بتا سکتے تھے۔ ان میں سب سے بڑا دانشور میں تھا جس نے بڑی صفائی سے اپنے لئے ایک بہتر مقام

حاصل کر لیا تھا۔ افسران تفتیش سے میں نے کہا۔

”آپ یقین کیجئے میں نے اتنے لوگوں کو قتل کیا ہے جن کی تعداد بھی میں نہیں بتا سکتا۔ میں مختلف طرح کی اذیتیں دینے کا ماہر ہوں اور میں آپ کو گروہ کے ایسے بہت سے نام بتا سکتا ہوں جو اب تک آپ کے علم میں نہ آئے ہوں۔ میں ایسا یوں کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بھی نہ بچ سکیں جو ہمیشہ ہی بچ جاتے ہیں لیکن اس کے علاوہ میں اتنے ہی بڑے ایک اور گروہ کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو شاید آپ کے علم میں ابھی تک نہ آیا ہو۔“

”بتاؤ۔۔۔!“ مختصراً کہا گیا اور میں نے سائیں جھومر کے بارے میں ایک ایک لفظ انہیں بتا دیا۔ پھر واقعی اس وقت میری خوشیوں کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے بے شمار پرانے دوستوں کو اس عظیم الشان عقوبت خانے میں آتے ہوئے دیکھا تھا یہاں تک کہ سائیں جھومر بھی ایک اسٹریچر پر ڈال کر لایا گیا تھا۔ وہ اب بوڑھا پھونس ہو گیا تھا لیکن آدھے سائیں کی شان و شوکت وہی تھی۔

بعد میں۔۔۔۔۔ کافی دن کے بعد ایک تفتیشی افسر نے مجھ سے کہا۔ ”تمہاری جان بخشی کی خصوصی سفارش کی گئی ہے۔ کیونکہ تم نے ایک ایسے گروہ کو گرفتار کرایا ہے جس کے جرائم تمہاری تنظیم کے جرائم سے کسی طرح کم نہیں تھے۔“

میں نے اپنی جاں بخشی کو بہت سی گالیاں دی تھیں۔ ایسی فضول چیزوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر سزاؤں کا موسم شروع ہو گیا۔ گروہ کے جس قدر جوان گرفتار ہو سکے تھے انہیں سزائیں ہونے لگیں۔ ساجد کو بھی موت کی سزا ہو گئی۔ پھانسی سے پہلے اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے پھیک مسکراہٹ سے مجھ سے کہا۔

”ٹائیگر۔۔۔۔۔ یاد ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔ ۵“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ اس عورت کی بات میں کوئی چیز تھی جو ٹھیک سے دل پر جا کر لگی تھی۔“

”ہاں جس نے بد عادی تھی۔“

”ہاں۔ اسی کی بات کر رہا ہوں۔“



پھر جلال خان آگیا۔ کارپینٹر کا کام جانتا تھا اس لئے اسے میرا ساتھی بنا دیا گیا تھا۔  
 بظاہر اجڑ اور گنوار نظر آتا تھا۔ مگر جب مجھ سے بے تکلف ہوا تو اس نے بتایا کہ وہ دنیا کی  
 آٹھ زبانیں جانتا ہے اور سمندری جہاز پر خلاصی کا کام کر کے آدمی کے قریب دنیا دیکھ چکا  
 ہے۔ اس نے کہا۔

”ہمیشہ خود کو بے وقوف ظاہر کرو اور دنیا کو یقین دلاتے رہو کہ تم احمق ہو۔ ورنہ  
 خود کو عقلمند سمجھنے اور ظاہر کرنے والے تمہارے دشمن بنے رہیں گے لوگ بے وقوفوں کو  
 زیادہ پسند کرتے ہیں اور ایسا وہی لوگ کرتے ہیں جو اصل میں بے وقوف ہوتے ہیں۔ یہ  
 آدمی مزیدار تھا اور مجھے پسند آیا تھا اور میں نے اس پر اظہار کر دیا۔

”اگر تم میرے ساتھ رہو تو زیادہ بہتر ہے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ تم اچھے انسان ہو۔“

”میں نے کچھ اور کہا تھا تم سے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خود کو بے وقوف ظاہر کرو  
 بی بی بے وقوف بننے کی کوشش نہ کرو۔“

”جو کہہ رہے ہو مجھے سمجھاؤ۔“ میں نے کہا۔

”سمجھو۔۔۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنی مرضی کے تابع نہیں ہیں۔ کیا ہم اپنی  
 فطرت سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ جواب دو۔“

”ہاں، یہ تو مشکل ہے۔“

”دوسری بات تم نے کہی کہ میں اچھا انسان ہوں۔“

”میرا یہی خیال ہے۔“

”غلط ہے۔۔۔ بلکہ بالکل غلط ہے۔“

”کیوں؟“

”اپنے لوگ وہ ہوتے ہیں جو سماج، معاشرے کے بتائے ہوئے اچھائی کے معیار پر  
 ہارے اترتے ہیں۔ اس معیار کی بات جانے دو کیونکہ اسی معیار سے اختلاف کی بنیاد پر  
 میں نے اچھائیاں چھوڑ دیں۔ دوسری بات یہ کہ اچھائیاں چھوڑنے کے بعد میں نے انسانوں

”مگر اس نے بددعا تو مجھے دی تھی۔“

”ہم سب ایک ہی تو تھے۔ مگر سنا ہے تمہیں سزائے موت نہیں دی جا رہی۔“

”میں ان سے کہوں گا کہ وہ لوگ غلطی کر رہے ہیں۔“

”کیوں؟“

”میں انہیں بتاؤں گا کہ میرا بہترین مشغلہ کسی کو قتل کر دینا ہے۔ وہ لوگ۔۔۔  
 انسانوں کے لئے ایک خطرے کو زندگی دے رہے ہیں۔“ پھر ہم زیادہ باتیں نہ کر سکے  
 کیونکہ ساجو کو لینے والے آگئے تھے۔

میرا خیال بالکل ٹھک تھا جس افسر نے مجھے میری جاں بخشی کی اطلاع دی تھی اس  
 نے اپنی دانت میں مجھے خوشخبری سنائی تھی لیکن یہ خوشخبری مجھے اس وقت بھی خوشخبری  
 نہیں لگی تھی کیونکہ اس کے بعد کی زندگی کا مجھے اندازہ تھا اور یہ۔۔۔ اندازہ غلط نہیں نکلا۔  
 فلک بوس سیاہ کلاہی زدہ پتھروں کی فصیلوں سے گھری یہ عمارت ایک مسلسل عذاب گاہ  
 تھی۔ میرے ساتھ اور بھی کچھ لوگوں کی جاں بخشی ہوئی تھی۔ ابتداء میں ہماری شناسائیاں  
 ایک دوسرے سے نہیں پھر سب بیزاری کے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔ کبھی ان کی  
 آنکھیں سرخ اور چہرے خونخوار ہوا کرتے تھے لیکن اب وہ سوکھ کر نکلتے جا رہے تھے۔  
 ٹھوس جسم پگھل کر ہڈیوں میں ڈھلتے جا رہے تھے۔ قید خانے کے محافظ اب وہ کام کرتے  
 تھے جو کبھی ہم خود کرتے تھے۔ قیدیوں پر رعب قائم کرنے کے لئے ان کی مرمت ضروری  
 سمجھی جاتی تھی اور معمولی سے معمولی بات پر انہیں کلکیوں سے باندھ کر ان کے جسم  
 کوڑوں سے لہولہا کر دیئے جاتے تھے۔ ایسا ان لوگوں کے ساتھ خاص طور سے ہوتا تھا جو  
 بے ہنر تھے۔ گروہ کے ارکان نے مجھے کارپینٹر کا کام سکھایا تھا جو اس وقت میرے بہت کام  
 آیا تھا۔ اول تو ایک مشغلہ مل گیا تھا پھر جیل کے حکام کی توجہ بھی، کیونکہ میں ان کے ذاتی  
 کام بھی خوشی سے کر دیا کرتا تھا بلکہ ذاتی کام زیادہ خوشی سے کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ مجھ  
 سے خوش تھے۔ اب شاید مجھے دنیا داری بھی آگئی تھی البتہ اگر اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ  
 میری فطرت کی تندہی میں کوئی کمی ہو گئی ہے تو سمجھنے والے کی بھول ہے۔ اس میں میرا  
 کوئی قصور نہیں۔



سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ چنانچہ اب میں نہ اچھا ہوں نہ انسان ہوں۔“  
 ”واقعی تمہارے اندر سب سے بڑی خرابی کا میں نے اندازہ لگا لیا ہے۔“ میں نے  
 ہنس کر کہا۔

”وہ کیا؟“

”تم کو اس بہت کرتے ہو۔ ایسی بکواس جس پر غور کرنے کے لئے دماغ پر زور بہت  
 ڈالنا پڑتا ہے۔“

”جسم میں موجود ہر چیز کو استعمال کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہ زنگ آلود ہو جاتی  
 ہے۔ جیسے دماغ۔۔۔۔!“

”بہت سی چیزوں کا استعمال بھی بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے  
 کہاں۔

”مثلاً۔۔۔۔۔“ اس نے سوال کیا۔

”جیسے دماغ۔۔۔۔۔!“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ جب میں دماغ استعمال کرتا ہوں تو مجھے ماضی کی وہ بہت سی باتیں یاد آتی  
 ہیں جنہیں یاد کر کے مجھے دکھ ہوتا ہے اور جب مجھے دکھ ہوتا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ  
 میں ہر شخص کو دکھی کر دوں۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے کبھی مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں نہیں پوچھا۔  
 خوش قسمتی سے میرا اور اسکا ساتھ جاری رہا، ہم دونوں کا رپینٹر کام کرتے تھے صبح سے شام  
 تک لکڑی تراشنا، پھیلنا، ٹھونکنا۔۔۔۔۔! زندگی اسی کھٹ پٹ میں گزر رہی تھی اور اس  
 احساس نے اور بیزار کر دیا تھا کہ باقی زندگی بھی اسی طرح گزارنی ہے لیکن ایک دن جلال  
 خان نے کہا۔

”جیل توڑو گے؟“

پہلے تو میں اس کے الفاظ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر میں نے چونک کر کہا۔ ”کیسے  
 ممکن ہے۔“

”ناممکن کو ممکن بنانا ہے۔“

”کوشش کریں گے۔“

”کرو۔۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ اس نے خاموشی سے گردن ہلا دی۔ وہ اس  
 بارے میں مجھے بہت کم بتاتا تھا بس ایک بار اس نے اتنا ضرور کہا تھا۔

”ہماری تعداد گیارہ ہو گئی ہے۔ یعنی وہ جو ہمارے پروگرام میں شریک ہو چکے  
 ہیں۔“

”قابل بھروسہ ہیں۔ اس منصوبے کا انکشاف تو نہیں کر دیں گے۔“

”امکان تو نہیں ہے لیکن خطرہ تو مول لینا پڑتا ہے۔“ جلال خان رخسار کھجاتا  
 :ہ ابوالاب جلال خان اس سلسلے میں کہاں تک پہنچا میں نہیں جانتا تھا لیکن ایک دن میں اپنے  
 نام میں مصروف تھا کہ چھ مسلح سپاہی میرے پاس پہنچ گئے۔  
 ”مائیکر تم ہو؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نیل کے اعلیٰ حکام کی طرف سے تمہاری طلبی ہوئی ہے۔ چلو۔“ مجھ پر تو کوئی  
 خاص اثر نہیں ہوا تھا لیکن جلال خان کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ میں سپاہیوں کے ساتھ جانے  
 لے لئے تیار ہو گیا۔ جلال خان کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے ایک تحریر نظر  
 آئی۔

”ایسے ہی موقع امتحان کے ہوتے ہیں دوست اور اگر یہ امتحان پاس کر لئے جائیں تو  
 آزادی کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔“ میں نے یہ تحریر پڑھی اور خاموشی سے سپاہیوں  
 کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

اس وقت میں جس کیفیت کا شکار تھا اسے خوف کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا جس شخص  
 کو اپنے مستقبل سے کسی بہتری کی امید ہو وہ خوف کا شکار ہو سکتا ہے۔ میں ایسی کسی غلط  
 فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ اور پھر جہاں تک خوف کا تعلق ہے میں تو بذات خود خوف تھا  
 ”سر۔ انسانوں کے لئے البتہ اس بات پر مجھ کو حیرت تھی کہ اگر جلال خان کا منصوبہ منظر  
 عام پر آگیا ہے تو اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے مائیکر کو کیوں طلب کیا

گیا ہے، ممکن ہے جیل کے اعلیٰ حکام صرف اس لئے مجھے طلب کر رہے ہوں کہ میں جلال خان کے قوانین کو قانون سمجھتے ہیں اور ہمیں اپنی ذات سے کوئی تکلیف نہیں خان کا ساتھی ہوں یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ جلال خان نے ذہانت سے کام لے کر فرار کے لئے دیتے۔

اس منصوبے کا سربراہ ان گیارہ ساتھیوں کو جن کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا "ٹھیک ہے ٹائیگر، تم اطمینان رکھو، ہم تمہارے بارے میں کوئی بہتر فیصلہ کرنے مجھے بتایا ہو اور کسی ذریعے سے جیل کے اعلیٰ حکام کو یہی خبر پہنچی ہو، حالانکہ یہ حقیقت ہے اے ہیں، بس اسے واپس بھیج دیا جائے۔"

کہ قید کی زندگی اپنانے کے بعد میں نے آج تک جیل کے حکام کو شکایت کا کوئی موقع نہیں میں واپس تو چل پڑا تھا لیکن میرا ذہن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ طلبی بے دیا تھا اور اپنی فطرت یکسر تبدیل کر لی تھی یا پھر آپ یوں سمجھ لیجئے کہ جس شخص کو اپنی مقصد تو نہیں ہے، ویسے بھی جیل کے علاوہ وہ دونوں افراد مجھے چروں سے انتہائی شاطر قوت بازو پر یا اپنی ذہانت پر یا اپنی شخصیت پر ضرورت سے زیادہ ہی بھروسہ ہو۔ وہ جب وہاں ہو رہے تھے، جب اپنی کوٹھڑی میں واپس پہنچا تو جلال خان شدیدہ بلڈ پریشر کا شکار تھا، سکون سے بیٹھتا ہے تو اپنی فطرت سے بالکل مختلف بن کر یہ لمحات گزارتا ہے۔ جس وسیع اس فائدہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں ابل رہی تھیں جب میں اندر داخل ہوا اور سنتری کمرے میں مجھے پہنچایا گیا تھا وہاں تین افراد موجود تھے۔ خوبصورت لباسوں میں ملبوس، ہاتھ چلے گئے تو اس نے جیل کی طرح مجھ پر جھپٹا مارا تھا۔

اچھی شخصیتوں کے مالک، ان میں سے ایک جیلر تھا اور اس کی سخت گیری کی داستانیں "بہت جلد واپس آگئے، تم خیریت سے تو ہونا۔"

ناصرف میں نے کانوں سے سنی تھیں بلکہ کچھ واقعات اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے تھے یہ "ہاں ہاں خیریت سے ہوں، لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔" میں نے الگ بات ہے کہ میرے جیسے شخص کے لئے یہ واقعات ایک مذاق کی حیثیت رکھتے تھے اولاً وہ جلال خان کو ساری تفصیل بتا دی اور جلال خان گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ میں نے انہیں کبھی سنجیدگی سے نہیں دیکھا تھا، البتہ جیلر نے جب کھڑے ہو کر مجھے اس نے لیا۔

مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو کچھ لمحوں کے لئے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہاتھ "تو ایسا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں بے مقصد بلایا گیا ہے اگر تمہاری رپورٹ اچھی ہے بڑھانے کا مضموم کیا ہے، یہ تو ایک ناقابل یقین سی بات تھی جس پر بہت حیران ہوا، بہر حال اس کے لئے کوئی بہتر کام کرنا ہی چاہتے ہیں تو کیوں تمہیں آزادی نہیں دے دیتے، میں نے اس سے ہاتھ ملا لیا تھا، جیلر نے دوسرے دو آدمیوں کی طرف رخ کر کے کہا۔

"یہ ہے ٹائیگر اور میں آپ کو اس کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ انتہائی نفیس انسان، یہ نہ ہونا، ویسے میں اب بھی مطمئن نہیں ہوں، اس بلاوے کے پیچھے کوئی خاص بات

ہے، آج تک اس کے بارے میں قید کے بعد ایسی کوئی رپورٹ نہیں ملی جس سے اس کی "نہ نہ مل؟" میں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔

بلکی فطرت کی نشاندہی ہو سکے۔

"اس کا نام، اس کی جسامت، چہرے کی رنگت اور کشادہ پیشانی سے بڑی مطابقت رکھتا ہے، یقیناً یہ ٹائیگر ہی ہوگا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آپ نے ایک ٹائیگر کو اتنے چھوٹے کام پر لگا رکھا ہے اسے کسی بڑے کام پر ہونا چاہیے تھا۔"

"ایہ پوری لہیپ یہاں سے منتقل کر دی گئی ہے اور اسے کسی اور جیل میں بھیجا گیا

اس لہیپ میں وہ گیارہ افراد بھی ہیں جو میرے ساتھ یہاں سے فرار کی تیاریاں کر رہے ہیں، میں نے میرا پروگرام مکمل ہوا تھا اور اب میں اسی جگہ کھڑا ہوا ہوں جہاں سے میں اپنے اس منصوبے کا آغاز کیا تھا کیا سمجھتے؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ منصوبہ ختم ہو گیا، یعنی ہمارے فرار کا منصوبہ۔"

"عارضی طور پر، لیکن میں بد دل نہیں ہوں، جیل سے فرار ہونا میرا محبوب مشغلہ

"آپ کی خواہش کے مطابق میں نے آپ کی اس سے ملاقات کرا دی ہے اگر آپ اس کے لئے کوئی موثر کام تلاش کر سکیں تو مجھے بھی ایسے لوگوں کی مدد کر کے خوشی ہوتی

کھال اتروانے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہے، جیلر نے پھر کہا۔

”اور اس کے بعد جب بھی یہاں تمہاری طلبی ہو، تمہیں اس طرح آنا ہوگا جیسے تم کارپینٹر کا کام کرنے کے لئے جا رہے ہو، بلکہ تم یوں کہہ دینا کہ ایک بہت بڑے سے ہال میں فالتوں کے رکھنے کے لیے ریک بنا رہے ہو، تاکہ کسی کو تمہارے بار بار آنے پر شک بھی نہ ہو۔“

”بہت بہتر جناب۔ آپ مجھے اپنی ہدایات سے منحرف نہیں پائیں گے۔“ میں نے کہا اور پھر ایک سفری نے اندر داخل ہو کر سیلوٹ کیا اور مدہم لہجے میں بولا۔ ”فیروز جاہ صاحب آگئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، انہیں احترام کے ساتھ اندر لے آؤ۔“

آنے والا انہی دو افراد میں سے ایک تھا، اس کے جسم پر انتہائی اعلیٰ تراش کا سوٹ تھا اور اس کی شخصیت بہت رعب دار نظر آرہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیلر نے بھی بڑے احترام سے اس کا استقبال کیا تھا اور اس شخص نے جیلر کے بجائے میری طرف رخ کر کے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ آج بہت بڑے بڑے لوگوں سے مصافحے ہو رہے تھے بہر حال میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس نے کہا۔

”مائیکر، تمہارے بارے میں تو مجھے تفصیلات معلوم ہو ہی چکی ہیں، میرا نام فیروز جاہ ہے، بیٹھو۔“ اس نے سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

”جناب کیا مجھے آپ کے سامنے کرسی پر بیٹھنا چاہیے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں تمہیں اس کی اجازت دے رہا ہوں اس وقت تم صرف ایک قیدی نہیں بلکہ ایک ایسی شخصیت بھی ہو جس سے میرے کچھ معاملات منسلک ہیں، ہمیں کچھ باتیں کرنا ہونگی اور مسٹر آپ براہ کرم ہمیں تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع دیجئے اور یہ بات تو آپ جانتے ہیں کہ آپ کی ڈیوٹی کیا ہے، نہ تو ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سنی جائے اور نہ ہمارے قرب و جوار میں کوئی موجود ہو، آپ جانتے ہیں کہ یہ میرا نہیں بلکہ بہت اوپر کا حکم ہے اور اس کی تعمیل نہ ہونے کا مقصد۔۔۔۔۔“

”آپ مطمئن رہیں فیروز جاہ صاحب، میری جانب سے مکمل تعاون حاضر ہے۔“

ہے ایک منصوبہ اگر ناکام ہو گیا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، نیا منصوبہ بنایا جائے گا البتہ تم ایک کام کرنا، اگر وہ تمہیں دوبارہ طلب کریں اور تمہارے ساتھ کوئی رعایت کر چاہیں تو تم مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کر لینا۔“ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ جلال خان کی بات کا جواب کیا دیتا، بڑی معصوم سی خواہش تھی ایک قیدی کی سفارش پر کسی خطرناک قیدی کو بھلا رعایت کیوں دی جاتی، لیکن تین دن کے بعد میری پھر طلبی ہو گئی، اس وقت بھی میں اپنا کام کر رہا تھا، والدہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تمہیں اپنے اوزار بھی ساتھ لے جانے ہیں، اصل میں جیلر صاحب کو لکڑی کا کوئی کام کرانا ہے تم سے، اس لئے تمہیں طلب کیا گیا ہے۔“

”کس طرح کا کام ہے تاکہ اسی طرح کے اوزار لے لیے جائیں۔“

”شاید کچھ فرنیچر بنانا ہے، لمبا ہی کام ہے، شاید تمہیں کئی دن لگ جائیں۔“

”جی“ میں نے آہستہ سے جواب دیا اور کچھ دیر کے بعد میں پھر اسی کمرے میں پہنچ گیا جہاں پہلی بار میری ملاقات ان تین افراد سے ہوئی تھی جن میں ایک جیلر تھا، اس وقت صرف جیلر یہاں موجود تھا اس نے پھر اسی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

”اس دن جن دو افراد سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی وہ ابھی چند لمحوں کے اندر اندر آنے والے ہیں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں، اور ممکن ہے یہ باتیں تمہارے فائدہ ہی کی ہوں، چونکہ وہ بہت بڑی حیثیت کے مالک ہیں اور اوپر سے مجھے یہ احکامات ملے ہیں اس لئے میں تم سے اس بات کا خواہشمند ہوں کہ تم کسی سے ان باتوں کا تذکرہ نہیں کر گے، میرا مطلب ہے اپنی کوٹھڑی میں موجود اپنے ساتھی قیدیوں کو حقیقت نہیں بتاؤ۔ اور یہ بات تمہاری بہتری کے لئے ہے، سمجھو تو سمجھ لینا، نہ سمجھ پاؤ تو نقصان کے ذمے دا خود ہو گے، میں صرف تمہیں ایک اچھے دوست کی حیثیت سے سمجھا رہا ہوں اور تم۔ محسوس بھی کر لیا ہوگا کہ اچانک ہی ہمارے دلوں میں تمہاری عزت اور توقیر میں اضافہ ہو رہا ہے۔“

میرے ہونٹوں پر ایک بے اختیار مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی، لفظ عزت و توقیر میرے لیے بڑا مضحکہ خیز تھا لیکن بہر حال بہت زیادہ پر مزاح بننے کی کوشش بھی بدن

اپنے اس اوزاروں کے تھیلے کے ساتھ آنا اور اپنے ساتھیوں کو یہی بتانا کہ تم کچھ لکڑی کا کام کر رہے ہو، اور مسٹر جیلر تمہیں اسی لیے طلب کرتے ہیں۔“

”کیا جیلر صاحب ان واقعات کے بارے میں جانتے ہیں، میرا مطلب ہے کیا انہیں اس بات کا علم ہے کہ آپ۔۔۔“

”ہرگز نہیں، یہ معاملہ بہت اونچی سطح کا ہے اور کسی عام آدمی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جاسکتا فی الحال یوں سمجھ لو کہ صرف میں اور تم اس گفتگو میں شریک ہیں اس دن تم نے میرے ساتھ ایک شخص کو بھی دیکھا ہوگا اسے تک ان واقعات کی حقیقت نہیں معلوم۔“

”جی سر“

”تو پھر ہماری آج کی ملاقات اس گفتگو کے بعد ختم ہو جانی چاہیے یا تمہیں اور کچھ اور بھی پوچھنا ہے مجھ سے؟“

”سر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر مجھے اس تکلیف دہ کوٹھری سے نجات دلا دی جائے۔“

”یہ بھی ہو جائے گا۔“

”اس کے علاوہ میں ایک شخص کی سفارش اور کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں سر کہ وہ ہر معاملے میں دست راست ثابت ہوگا۔“

”میرے ان الفاظ پر فیروز جاہ نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔“

”وہ کون ہے؟“

”اس کا نام جلال خان ہے۔“

”خیر اس کی سوانح حیات بھی پڑھ لی جائے گی، اگر وہ اس قابل ہو کہ تمہارا ساتھ دے سکے اور ہم اسے قابل اعتماد سمجھیں تو پھر اسے بھی تمہارے ساتھ ہی آزاد کر دیا جائے گا، اچھا ہے ایک سے دو افراد زیادہ بہتر ہونگے، لیکن شرط یہی ہے کہ وہ بھی تمہارے پائے کا انسان ثابت ہو سکے، ہاں یہ ممکن ہے کہ رعایت اسے بھی دے دی جائے، مثلاً عارضی رعایت، کیا اس کوٹھری میں تمہیں تکلیف ہے۔“

جیلر نے کہا اور باہر نکل گیا، دروازہ بند ہو گیا تھا، تب فیروز جاہ نے میری جانب رخ کر کے کہا۔

”جیسا کہ میں نے ابھی جیلر سے کہا کہ جو کچھ گفتگو میں تم سے کرنا چاہتا ہوں وہ میری ذاتی گفتگو نہیں ہے بلکہ بہت اعلیٰ شخصیتیں تمہاری موجودہ حالت سے دلچسپی رکھتی ہیں اور تمہاری مدد کرنا چاہتی ہیں، کیا سمجھ؟“

”کیا میری رہائی کا حکم نامہ آپ کے پاس موجود ہے۔؟“ میں نے سوال کیا۔  
”تمہاری رہائی تو کسی طور پر ممکن نہیں ہے، تمہارے خوفناک کارناموں کی تفصیل لوگوں کو ڈرانے کے لئے سنائی جاتی ہے یہ بتانے کے لئے کہ ایک انسان اندر سے اتنا بھیاںک ہو سکتا ہے، اصل میں وہ لوگ جو تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں وہ کسی اور طریقے سے تمہاری مدد کریں گے اس وقت میں تم سے یہی کہوں گا کہ تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا ہے اور اپنے ذہن کو یہ یقین دلانا ہے کہ میرا ہر قدم تمہاری بہتری کے لئے ہوگا، تفصیلات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“  
”سر آپ بے شک تفصیلات بعد میں بتائیں آپ نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کی جرات دلائی ہے تو میں آپ سے کچھ اور سوالات اسی جرات کے تحت کرنا چاہتا ہوں وہ لوگ جو میری مدد کرنا چاہتے ہیں ان کی اپنی خواہش کیا ہے، کیا وہ بدلے میں مجھ سے کچھ نہیں چاہتے۔؟“

”تم ہوشمند انسان ہو، اور تم نے دنیا کو ہم سے زیادہ گہری نگاہ سے دیکھا ہے، کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی بے مقصد کسی کی مدد کرتا ہو، تمہیں اپنے ساتھ ہونے والی اس رعایت کے صلے میں ان لوگوں کے لیے یا ہمارے لیے بھی ایک کام کرنا پڑے گا۔“  
”میں وہی جاننا چاہتا ہوں، وہ کیا کام ہے؟“ میں نے کہا۔

”اتنی جلدی مت کرو، ابھی تو ہمیں یہ یقین کرنا پڑے گا کہ تم ہمارے کام کے آدمی ثابت ہو بھی سکتے ہو یا نہیں، میری تم سے یہ دوسری ملاقات ہے، پہلی ملاقات کی جو رپورٹ میں نے پیش کی ہے وہ تسلی بخش ہے اور اس دوسری ملاقات کی رپورٹ بھی میں ان لوگوں کو پیش کروں گا جب یقین آجائے گا تو تمہیں تمہارا کام بتا دیا جائے گا۔ اسی لئے تم سے شاید پہلے بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اکثر تمہاری طلبی ہوتی رہے گی اور جب بھی یہاں آؤ

ساتھ بھی یہ سلوک کیا ہے آخر مجھے یہ رعایت کیوں دی گئی ہے؟“

”تمہارا اپنا کیا خیال ہے اس بارے میں؟“

”آہ صرف ایک خیال ہے، تم نے قربانی کے اس بکرے کو دیکھا ہے جس کے گلے میں موتیوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے اس کی رسی پکڑے ہوئے اس کی ناز برداریاں کرتے ہیں اسے عمدہ سے عمدہ کھلایا جاتا ہے اور یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ بارش میں نہ بھیگ جائے، پھر اس کی گردن پر چھری پھیر دی جاتی ہے کسی بکرے کی گردن پر چھری پھرتے ہوئے دیکھی ہے؟“ اس نے مجھ سے سوال کیا اور میں حقارت آمیز انداز میں ہنسنے لگا، اس نے میری ہنسی کو تعجب سے دیکھا اور پھر ایک دم جھرجھری سی لے کر بولا،

معاف کرنا انسان ہی تو ہوں، غلطی ہو جاتی ہے اور اندازہ نہیں رہتا کہ کس کے سامنے گفتگو کر رہا ہوں، بکرے تو بکرے ہی ہوتے ہیں، بھلا گردن اور چھری کا کھیل تم سے بہتر اور کون کھیل سکتا ہے، آئی ایم سوری، کہیں میرے ان الفاظ کو اپنی توہین نہ سمجھ لیتا، اصل میں انسان کسی سے بے تکلف ہو کر بعض اوقات بے نیکی باتوں پر اتر آتا ہے۔“

اسے شاید میرا ماضی یاد آگیا تھا، جس کی کہانیاں اس نے بہر حال کہیں نہ کہیں سے سن ہی لی ہوں گی، بس اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا تھا اور ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو کر اپنے بستر میں جاگھسا تھا مجھے جو رعایت ملی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے میں خود تعجب کی نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

پھر کچھ دن کے بعد میری ایک اور طلبی ہوئی اور جس شخص نے مجھے طلب کیا وہ فیروز جاہ کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا، میں اس کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یقیناً تمہیں آسنائیاں فراہم کر دی گئی ہو گی، میں نے جیل کو اسی وقت ہدایت کر دی تھی اور شاید تمہارے پسندیدہ ساتھی کو بھی، لیکن ایک بات ذہن میں رکھو تم اس پسندیدہ ساتھی کو یہاں مستقل آسنائیاں تو دلا سکتے ہو لیکن اسے تمہارے برابر رعایت نہیں دی جاسکتی، خیر ایک منٹ رکو۔“ اس نے کہا اور جیب سے کچھ کاغذات نکال کر سامنے رکھ

”ہاں بدبو اور غلاطت سے بھرپور، بے شمار آدمیوں کی رہائش گاہ جو ایک دوسرے میں گھس کر سوتے ہیں اور ان کی بدبودار سانسیں برداشت کرنا ایک مشکل کام ہوتا ہے، اگر رعایت ہی دینی ہے تو پہلی رعایت کے طور پر مجھے اور جلال خان کو کسی بہتر جگہ منتقل کر دیا جائے تاکہ میں واقعی یہ سمجھوں کہ مجھے اچھے لوگوں کا ساتھ حاصل ہے۔“

”سنو! ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی تھوڑی سی اہمیت ملنے پر ایسے الفاظ کا استعمال کرنا چاہے جو ناگواری کی شکل اختیار کر جائیں، ابھی ہم نے کوئی ذمہ داری تمہاری سپرد نہیں کی اور تمہیں کسی بھی قیمت پر وہ حقوق مانگنے کی حیثیت حاصل نہیں ہے جس کے بارے میں تم کہہ رہے ہو تاہم میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کرنا چاہتا ہوں، شرط یہی ہے کہ اگر تمہارے ساتھی کو اس بارے میں ایک لفظ بھی معلوم ہو گیا تو ہمارے درمیان شناسائی کی کوئی جھلک بھی باقی نہیں رہے گی۔“

”جی، آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔“ میں نے کہا اور اس کے بعد ایک بار پھر مجھے واپس بھجوا دیا گیا۔

لیکن اسی رات ایک اور عمل ہوا، اور وہ عمل یہ تھا کہ مجھے اور جلال شاہ کو جیل کے ایک دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور اس کمرے کو دیکھ کر ہماری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، کیونکہ یہاں دو بستر بھی موجود تھے اور ملحقہ باتھ روم بھی، اس جگہ کو دیکھ کر جلال خان تو حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا تھا اس نے خوشگوار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہا، ”میں کہتا ہوں آخر یہ ہو کیا رہا ہے، بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی ہے کیا تم سے کوئی کام لیا گیا ہے۔“

”ہاں وہ لوگ شاید مجھ سے کچھ ریک وغیرہ ہونا چاہتے ہیں، آج انہوں نے ناپ تول کرائی ہے، لکڑی کے بارے میں مجھ سے پوچھا ہے، کچھ نشانات بھی لگوائے ہیں، بس اسی لئے یہ رعایت دی جا رہی ہے۔“

”پاگل ہو تم، جو کچھ بھی کر چکے ہو بے شک اس کی اپنی ایک حیثیت ہے لیکن جلوں میں ایسا نہیں ہوتا، اس کے پس منظر میں کچھ اور بھی ہے اب کیا ہے یہ تو تمہیں ہی معلوم ہو سکتا ہے لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے صرف تمہاری سفارش پر میرے

لئے پھر وہ بولا،

”ہمیں جس شخص کی ضرورت ہے وہ تم ہو سکتے ہو مگر پہلے میں مطمئن ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی میں بات آگے بڑھاؤں گا تم اگر چاہو تو اس بارے میں مجھ سے کوئی سوال کر سکتے ہو۔“

”صرف ایک سوال؟“ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”ہاں پوچھو۔“

”میں خود مطمئن ہونا چاہتا ہوں، اس کا طریقہ کار کیا ہو گا؟“

”یقینی طور پر، یقینی طور پر تمہیں اس کا حق حاصل ہے یہ بتاؤ جیل کے اندر کی زندگی سے جیل کے باہر کی زندگی کیسی ہوتی ہے، تمہیں ان دونوں میں سے کونسی زندگی پسند ہے؟“

”یہ ایک پر مزاح سوال ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کی اتنی بڑی شخصیت اور میری معمولی سی حیثیت میرے اور آپ کے درمیان مزاح کا رشتہ نہیں قائم کر سکتی، میں یہی جواب دوں گا کہ جیل کے باہر کی زندگی ظاہر ہے اندر کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے، اب میں ذرا تمہیں تمہارے ماضی کی داستان سنا دوں گا کہ تمہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ تم کیسے کیسے حالات سے گزر چکے ہو اور تمہارے بارے میں ہم نے کس قدر معلومات حاصل کی ہیں، شاید تمہیں اپنے ماضی کی وہ کمائیاں یاد آئیں رہی ہوں جو گزر چکی ہیں کیونکہ تم نے اس کے بعد ایک انوکھا وقت گزارا ہے، کیا تمہیں تمہارے باپ نے کچھ رقم کے بدلے فروخت نہیں کر دیا تھا کچھ جرائم پیشہ لوگوں نے تمہیں خریدا اور تمہاری شخصیت بدل دی، تمہارا باپ ایک فاقہ کش اور مفلس انسان تھا اور اس کے پاس اپنے بچوں کے لئے پیسے نہیں تھے، چنانچہ تمہیں فروخت کر کے اس نے اپنے بچوں کی پرورش کی، پھر اس کے بعد تم اپنے والدین سے دور ہو گئے۔“

”کیا تم نے اس کے بعد بھی میرے بارے میں کوئی سراغ لگایا؟“

”ہاں تھوڑی بہت معلومات ہمارے پاس موجود ہیں تمہارے فروخت کے بعد تمہارے والدین نے وہ علاقہ چھوڑ دیا، تمہارے بہن بھائی منتشر ہو گئے، ہمیں ان کے

بارے میں زیادہ معلومات نہیں حاصل ہو سکیں سوائے تمہاری ایک بہن کے جس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو ہمارے ملک کے سفارت خانے میں کام کرتا تھا اور وہ اپنی بیوی کو لے کر ملک سے باہر چلا گیا۔ وہ اب بھی ملک سے باہر ہی ہے، بعد کے حالات کی تفصیلات ہمیں نہیں حاصل ہو سکیں، لیکن تمہارے بارے میں ہمیں ایک ایک لفظ معلوم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تم خود اپنی تنظیم میں ایک خوفناک جلاّد کے طور پر مشہور ہو یا مشہور تھے خیر اصل میں ان تمام باتوں سے تم پر رعب ڈالنا مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ سمجھ لو کہ تم سے بار بار ملاقاتوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم تمہاری آزادی کا اندازہ لگائیں کہ تم خلوص دل کے ساتھ ہمارے کام میں شریک ہونا چاہتے ہو یا صرف اپنی رہائی کے لئے کوشش کر رہے ہو، دیکھو ان الفاظ کا برا نہ ماننا، ہر شخص کی دہری شخصیت ہوتی ہے اور بعض معاملات میں وہ اپنی پسند کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے، سمجھ رہے ہو نا میری بات، چلو بس ٹھیک ہے آج کی گفتگو ختم۔“

اسی رات جب کھانا تقسیم ہو رہا تھا تو میں دوسروں کے ساتھ لائن میں موجود تھا، وہ دونوں قیدی غالباً اس جیل میں نئے آئے تھے یا اگر نئے نہیں تھے تو کسی دوسری بیرک سے یہاں منتقل کئے گئے تھے اپنی جسامت پر ناز کرتے تھے اور انتہائی بے ہودگی کا مظاہرہ کر رہے تھے، ان میں سے ایک کا قد خاصا لمبا، داڑھی گھنی اور آنکھیں بہت زیادہ سرخ تھیں اور وہ اپنے ساتھی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے مہری طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا، پھر میرے پیٹ میں انگلی چبھو کر بولا۔

”غالباً بہت زیادہ بھوکے ہو تم، تمہاری بے چینی اس بات کا اظہار کرتی ہے۔“

”ہاں واقعی کبھی کبھی میری بھوک اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ میں انسانی گوشت کھانے پر غور کرنے لگتا ہوں۔“ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر لائن سے باہر کھینچ لیا، اور اس کے بعد ایک زوردار گھونسا اس کے جہزے پر رسید کر دیا، وہ لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹا، لیکن اس کے دراز قد ساتھی نے اسے سنبھال لیا تھا اور اس کے بعد سر سے بلند کر کے زمین پر اسے میری جانب دھکیلا تھا۔ میں نے اسے پکڑا اور اس کے بعد سر سے بلند کر کے زمین پر دے مارا اس کی ہڈیاں کہاں کہاں سے ٹوٹی ہو گئی اس کا مجھے کچھ پتہ نہیں تھا، لیکن میں نے

میں نے جواب دیا اور جلال خان گردن جھٹک کر مسکرانے لگا پھر اس نے اپنی قیض اٹھائی اور نئے میں سے دو روٹیاں باہر کھینچ لیں۔ اور ان میں سے ایک میری جانب بڑھاتا ہوا بولا۔

”سالن کا انتظام میں نہیں کر سکا ہوں کیونکہ اسے چھپانے کی کوئی جگہ میرے پاس نہیں تھی۔“ میں نے گھور کر اسے دیکھا، اس نے روٹی میری جانب بڑھا رکھی تھی تو میرا ہاتھ بھی اس کی جانب بڑھ گیا۔

دوسری صبح جیلر نے خاص طور پر مجھے طلب کیا تھا، اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ جیل میں اس سے پہلے تو تم نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت ایک آدمی تمہارے ہاتھوں شدید زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا ہوا ہے، اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ مر ہی جائے۔“

”آپ کو تو معلوم ہے کہ میرا ریکارڈ بہت اچھا تھا اور ویسے بھی میں کسی ایسے آدمی کو کوئی نقصان پہنچانا پسند نہیں کرتا جو میرا راستہ نہ روکے، اس نے جو کچھ کیا تھا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا اور بہت برا آدمی ہونے کے باوجود میں سچ بولتا ہوں اور ہر دیر آدمی ہمیشہ سچ بولتا ہے۔“

”ساری باتیں اپنی جگہ، لیکن ٹائنگر جو کچھ تمہارے لئے کیا جا رہا ہے اس میں تمہیں بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے، جیل میں ہنگامہ بالکل نہ کرو اگر تمہارے ساتھ کوئی رعایت برتی گئی تو بے شمار لوگ سوچنے پر مجبور جائیں گے، تمہیں اندازہ ہے کہ تمہیں ایک اہم کام کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے جس کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو، سمجھ رہے ہو نا کیا دلچسپ بات ہے جس کام کے لئے میں تمہیں آمادہ کر رہا ہوں اس کے بارے میں مجھے بھی ذرہ برابر علم نہیں لیکن یہ بھی ظریفی ہے کہ اگر کسی وجہ سے اس کام میں ناکامی ہو تو تمہارے ساتھ میری بھی شامت آجائے گی، بات سمجھ میں آرہی ہے۔“

”نہیں“ میں نے جواب دیا۔

سوچا کہ اگر دو چار ہڈیاں ٹوٹی ہیں تو پھر فائدہ ہی کیا، انسان کو کم از کم اس کی حماقتوں کی اتنی سزا تو ملے کہ وہ یاد رکھے، چنانچہ میں نے کئی ٹھوکریں اس کے چہرے پر ماریں، لیکن چاروں طرف سے سپاہی مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے اور ضروری تھا کہ ان پر ہاتھ نہ اٹھاؤں، انہوں نے میری مشکلیں کس لیں اور پھر مجھے کھانے کے بغیر کوٹھری میں پہنچا دیا گیا جس شخص کو میں نے زخمی کیا تھا اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا لیکن جلال خان واپس آیا تو اس کے چہرے پر پریشانی کی جھلکیاں تھیں، اس نے کہا۔

”یہ تمہیں اچانک کیا ہو گیا تھا؟“  
”کچھ نہیں۔“

”تم جانتے ہو تم نے اپنی ساری رپورٹ خراب کر لی۔“  
”کیا ہوا ہے کیا نہیں ہوا اس پر مجھے سرزنش کرنے کی کوشش نہ کرو جلال خان، یہ کوشش شاید میں برداشت نہیں کر سکتا؟“

”تم میری بات نہیں سمجھ سکتے، اگر انہوں نے ہم سے یہ آسانیاں چھین لیں اور دوبارہ ہمیں اسی کوٹھری میں پہنچا دیا تو سارے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔“  
”اگر ایسا ہوا بھی تو میرے ساتھ ہو گا تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”ہوں، میں تم پر احسان نہیں جتا رہا، اصل میں اس معاملے میں ملوث تو میں بھی ہو گیا ہوں، جب تم اسے مار رہے تھے تو میں اس کے لمبے ساتھی کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اس کی گردن پر قینچی جما رکھی تھی اور مسلسل عاجزی کرتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا کہ خدا کے لئے لڑائی کو بڑھایا نہ جائے، لیکن اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا میں نے اسے کہ لاکھ کوشش کے باوجود وہ تم تک نہ پہنچے پائے، اگر وہ عقب سے تم پر حملہ کرتا تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں نقصان پہنچ جاتا اور اس بات کو وہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ میزی یہ عاجزی مصنوعی ہے اصل میں، میں نے یہ سب کچھ اسے قبضے میں رکھنے کے لیے کیا ہے اور بعد میں اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ مجھے بھی دیکھ لے گا۔“

”بہر حال جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا، اب جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے، وہ مجھ سے مذاق کر رہا تھا۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ جیل میں کوئی گڑبڑ نہ کرو، تم نے جتنا وقت یہاں گزارا ہے بہت سکون سے گزارا ہے اور میری آرزو ہے کہ تم اب بھی اسی سکون سے وقت بسر کرو۔“

”میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ وہ شخص مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے مجھے چھیڑ کر جھگڑا مول لینا چاہتا ہو، خیر چھوڑیے آپ براہ کرم مجھے اتنا تو بتا دیجئے کہ جس اہم کام کا آپ تذکرہ کر رہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے؟“

”میں نے کہا نا میں عجیب و غریب انسان ہوں، تمہیں ایک اہم کام کے لئے آمادہ کر رہا ہوں لیکن خود اس اہم کام کے بارے کچھ بھی نہیں جانتا۔“ میں خاموشی سے جیلر کی صورت دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔

”لیکن فیروز جاہ سے میری ملاقات تو آپ نے ہی کرائی ہے جناب۔“

”جو کچھ میں نے کیا ہے براہ کرم اس کا تذکرہ اس انداز میں نہ کرو کہ بات کسی دوسرے کے کانوں تک جا پہنچے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم یہاں ریک بنانے کے لئے آئے ہو اور بس اگر اس جگہ تم سے کوئی اور ملتا ہے تو مجھے اس کا بالکل علم نہیں۔“

”کیا مطلب۔ فیروز جاہ کا نام بھی آپ ہی نے مجھے بتایا تھا اور میری اس سے ملاقات۔“

”خدا کے بندے اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں اور تم براہ کرم اپنے آپ کو محتاط رکھو دیکھو میں بھی کچھ مجبوریوں کا شکار ہوں، بات اتنے اوپر اور اتنے اعلیٰ پیمانے کی ہے کہ میری ٹانگ بھی جھگڑے میں پھنس سکتی ہے۔“

”نہیں میں کوشش کروں گا کہ آئندہ ایسا کوئی عمل نہ ہونے پائے جس سے آپ کو پریشانی ہو۔“

پھر تین چار دن گزر گئے، مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ہسپتال میں میرے مصروب کا کیا ہوا، زندہ رہا یا مر گیا لیکن فیروز جاہ نے ایک دن پھر مجھ سے اسی انداز میں ملاقات کی تھی، ”اس کے سامنے ایسا بے بس نظر آتا تھا کہ مجھے خود حیرت ہوتی تھی، ایک معمولی انسان نہ طرح وہ فیروز جاہ کے سامنے مودب ہو جاتا تھا اور اس کے بعد ہم دونوں کو تنہا

چھوڑ کر باہر نکل جاتا تھا۔

”تمہارے بارے میں کچھ اور تفصیلات میرے علم میں آئی ہیں، کیا تم نوشاہی کے بارے میں بتانا پسند کروں گے کہ یہ نوشاہی کیا چیز تھی؟“ میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر آہستہ آہستہ سے بولا۔

”وہ میری محبوبہ تھی، اور شاید میری زندگی میں پہلی بار میرے دل میں کسی ذی روح کے لیے محبت یا ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے تھے۔ اصل میں اس وقت میں نے اپنے چہرے پر نقاب لگائی ہوئی تھی جب اس لڑکی کے گھر میں داخل ہو کر میں نے اس پورے خاندان کو قتل کر دیا تھا وہ تنہا باقی رہ گئی تھی اور اس کے بعد جب میں نے اس کی حالت زار دیکھی تو مجھے اس پر ترس آگیا اپنے کام کو سرانجام دینے کے بعد ایک بہت ہی ہمدرد انسان کی حیثیت سے اس بے بس لڑکی سے ملا اور میں نے اس سے زندگی کے سارے رابطے استوار کر لیے، وہ مجھے ایک اچھا انسان سمجھتی تھی اور مجھے اس پر ہنسی آتی تھی پھر بھی میں نے اس کے ساتھ ایک اچھے انسان جیسا ہی سلوک کیا البتہ جس وقت مجھے گرفتار کیا گیا تو وہ بھی میرے ساتھ تھی، حالانکہ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ لڑکی بے گناہ ہے اور اس کا مجھ سے جو تعلق ہے اس میں یہ بالکل نہیں جانتی کہ اصل میں، میں کون ہوں، پھر مجھے وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا اور نوشاہی کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔“

”اور تم نے اسے زندگی کی وہ ساری آسائیاں فراہم کر دی تھیں جو کسی انسان کو درکار ہو سکتی ہیں؟“

”ہاں، میں اس کا اقرار کرتا ہوں اور اگر کبھی میں اپنی وحشت اور درندگی سے نکل کر محبت کی دنیا میں آسکتا تھا تو اس کا جواز وہی لڑکی بنتی، وہ بے حد حسین تھی اور اس نے مجھ سے کہا تھا چاہے ساری زندگی گزر جائے وہ میرا انتظار کرے گی۔“

”تو کیا اسے آخر تک یہ بات نہیں معلوم ہو سکی کہ تم اس کے خاندان کے قاتل ہو؟“

”ہاں، اور میں نہیں چاہتا کہ وہ کبھی یہ بات جانے اور اس کے لئے میں ہر طرح کی



رہا تھا۔ اصل بات وہی تھی کہ زندگی میں اگر کوئی ڈگر منتخب ہو جائے اور انسان اس پر چلتے دئے اپنے آپ کو مطمئن کر لے تو میں سمجھتا ہوں۔

کہ زندگی چاہے کسی بھی رنگ میں گزر رہی ہو اتنی تلخ نہیں محسوس ہوتی جبکہ کوئی اردو سینے میں سجادی جائے۔ ان لوگوں نے اب تک جو سزائیں مجھے دی تھیں میں آسانی انہیں جھیل گیا تھا، لیکن اب فیروزہ جاہ نے میرے دل میں جو آگ لگا دی تھی یہ آگ مجھے جھلسائے دے رہی تھی، تقریباً چھ سات دن اس اضطراب کے عالم میں گزر گئے۔ میں انتظار کرتا رہا۔ جلال خان میری کیفیات سے ناواقف نہیں تھا اور الٹی سیدھی نیکیں جھاڑتا رہتا تھا یہاں تک کہ ایک دو بار میں نے اسے جھڑک دیا۔

ایک دن پھر میرا بلاوا آگیا اور جب میں اس ہال میں پہنچا تو میں نے فیروزہ جاہ کی بائے اس دوسرے آدمی کو پایا جو پہلی بار فیروزہ جاہ کے ساتھ نظر آیا تھا اس شخص نے سردی سے مجھے دیکھا اور بولا۔

”تم فوراً اپنا کام شروع کرو“ اس دیوار کے ساتھ چھت سے فرش تک اور اس پار کے ساتھ جتنی جلد ممکن ہو ریک بنانا شروع کرو، آج سے اپنے کام کا آغاز کرو بلکہ اب وقت ہے۔“

میں نے ایک لمحے کے لئے اس کا چہرہ دیکھا تھا سپاٹ اور سادہ چہرہ بات ذرا ابھی لی تھی اور فوری طور میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی، لیکن بہر حال جیسا کہ میں نے اپنے سامنے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی فطرت کے خلاف خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کروں گا اور مایہی ہوا، وہ بدبخت میری نگرانی کرتا رہتا تھا، اور میں دیواروں پر اپنی کاریگری دکھا رہا تھا، رے دل میں اضطراب کے طوفان جاگ رہے تھے لیکن شاید یہ بھی میرے صبر کا امتحان پانچ چھ دن مجھے کام کرتے ہوئے گزر گئے اس دوران فیروزہ جاہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا اب تک کہ اس دن میں نے اپنا کام مکمل کیا اور اس کی تکمیل کے بعد اپنی کونٹری میں آیا۔ پہلے میرے چہرے پر جو تیزی طراری چھائی رہتی تھی اب شاید اس میں کمی واقع لی تھی۔ جلال خان شاطر آدمی تھا کہنے لگا۔

”کیس کسی ماہر نفسیات کی خدمات تو نہیں حاصل کی گئیں تمہارے لیے؟“

قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔“

”میرے ان الفاظ پر فیروزہ جاہ کی آنکھوں میں انوکھی چمک پیدا ہو گئی تھی جس کا مضمون اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ بعد ہی میں نے اس پر غور کیا تھا، پھر اس نے مجھ سے آخری بات کہی۔

”ممکن ہے بہت جلد تمہیں جیل سے رہائی مل جائے اور تم باہر کی دنیا میں ایک آزاد زندگی گزار سکو“ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟“

”میں نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

”شاید ایسا ہو جائے لیکن اس کا پس منظر کیا ہو گا۔ یہ میں بالکل نہیں جانتا۔“

”جو پس منظر ہو گا آخر کار پیش منظر میں بدل جائے گا۔“

”وہ تو یہ الفاظ کہہ کر چلا گیا تھا، لیکن یہ رات میرے لئے بڑی سنگین رہی تھی جو کچھ کر چکا تھا اس کے بعد کچھ بات ہے کہ کوئی خواہش دل میں باقی نہیں رہی تھی دو تین بار یہ تصور ذہن میں آیا تھا کہ اگر موقع مل جائے تو نوشاہی کے ساتھ ایسے عام آدمی کی زندگی گزاروں گا جیسے عام آدمیوں کو میں اس دنیا میں متحرک دیکھتا ہوں۔

لیکن بعد میں یہ سارے خواب ادھورے رہ گئے تھے، لیکن وہ کبخت ان خوابوں کو پھر سے جگا گیا تھا گزری ہوئی زندگی صرف ایک تصور نہیں تھی بلکہ اس کا ایک بڑا حصہ میں گزار چکا تھا، اپنی مرضی سے چلنا، اپنی مرضی سے کھانا پینا، ہر طرح کی سیر و تفریح، جہازوں میں سفر، شفاف اور نرم بستر، ہوٹل، ریسٹورنٹ، شاندار لباس، گرم پانی کا غسل، مسکتی ہوئی خوشبوئیں، گرمی اور پرسکون نیند اور پھر، پھر نوشاہی۔ ایک بار میری آنکھوں میں اس حسین دنیا کا تصور آسجا جسے بہر طور مجھ سے چھین لیا گیا تھا جو کچھ مجھے بنایا گیا تھا میں تو وہی بن گیا تھا، ماضی کا ہر نقش میرے دل پر چسپاں تھا مجھے تو دنیا نے آہستہ آہستہ تراشا تھا اور اس تراش خراش کے بعد ہی میں یہ بن گیا تھا جس کی بناء پر مجھے جلال کا خطاب دیا گیا تھا، لیکن خدا غارت کرے اس فیروزہ جاہ کو، جس نے ایک بار پھر میری پرسکون زندگی میں ہلچل مچا دی تھی میں نے تو خود کو دنیا سے دور کا انسان سمجھ لیا تھا ان تمام تصورات سے خود کو الگ کر لیا تھا جو انسانوں کی زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں اور اب میں انہیں تصورات میں جی

”کیا مطلب۔“

”ہو سکتا ہے وہ شخص ماہر نفسیات ہو اور صرف تمہاری تحلیل نفس کر رہا ہو۔“

تمام خوابوں میں گرفتار کر کے تمہیں ایک اچھا انسان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ اپنی کسی بیٹی سے میرا رشتہ کرنا چاہتا ہے۔ میں تو اب

دہشت گرد ہوں اگر وہ تحلیل بھی کرنا چاہتے ہیں تو اس سے انہیں فائدہ حاصل کیا

تمہارے خیال میں وہ زیادہ سے زیادہ مجھ سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“

”جلال خان کے پاس میرے ان الفاظ کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن یہ حقیقت

کہ میری فطرت میں نمایاں تبدیلی رونما ہو گئی تھی، ماضی اب میرے ذہن میں کچھ کے

رہتا تھا اور نجانے کیوں ان دنوں نوشابہ کی یاد دل و دماغ پر بری طرح مسلط تھی۔ ان

برسوں میں، میں نے اس کے ہر نقش کو کھرچ دینے کی کوشش کی تھی اور کامیاب بھی،

تھا مگر خدا غارت کرے اس شخص کو جس نے اس بھیجی ہوئی چنگاری کو پھر سے ہوا دے

تھی اس تاریک کوٹھری میں اب میں نوشابہ کے وجود کی خوشبو کو محسوس کرنے لگا تھا۔

کے سانسوں کی آواز سن سکتا تھا۔ وہ حسین لڑکی جو صبح کی پہلی کرن کی مانند دھلی دھلی

محسوس ہوتی تھی، بس ایک عجیب انداز تھا اس کا ایک ایسی حیرت انگیز تمکنت اس

چہرے پر چھائی رہتی تھی وہ جنگلی پھولوں کی طرح کوئل اور شاداب تھی، اس کی آنکھ

میں سورج چمکتے رہتے تھے اور اس کا وجود کسی ہرنی کی طرح ہر وقت بے تاب، اچھلتا

اور رقص کرتا رہتا تھا، جیسے اسے ایک لمحہ قرار نہ ہو۔ میں اس دن اپنے ساتھیوں کے

کچھ ایسے بے گناہ مجرموں کی تلاش میں تھا جنہوں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن مجرم

پائے تھے، مکانوں کے بند دروازے میرے لئے کوئی رکاوٹ نہیں تھے، ہم جس دروازے

کو چاہتے کھولتے ذرہ برابر دیر ہوتی تو دروازے توڑ دیئے جاتے اور پھر بڑی بے در

سے ہم مکان اور کیمینوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتے، جسے چاہتے گولی مار دیتے، جسے چاہتے

لاتے، جو سامان پسند آتا اسے اٹھا لاتے، ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا، ہم دہشت

نشان بن چکے تھے، لوگوں کی موت، زندگی، عزت آبرو مال، دولت، کوئی ہماری راہ روکے

جرات نہیں کر سکتا تھا اور اس شام ہم ایک عمارت میں گھسے تھے وہاں کوئی تقریب

جب ہم اپنے چہرے نقابوں میں چھپائے ہوئے اس عمارت میں داخل ہوئے تو عورتیں

ہمیں دیکھتے ہی دیکھتے چیخیں مار کر ادھر ادھر بھاگ کھڑی ہوئیں مرد اپنی جگہ کھڑے خوف

سے لرزتے رہے اور اس کے بعد کچھ سرپھروں نے ہمت کی اور ہم پر حملہ کرنے کی

کوشش کی، لیکن سارا کھیل بدل کر رکھ دیا گیا، ہم نے ان سب کو قتل کر دیا۔ صاحب خانہ

جو ہماری توجہ کا مرکز تھے اپنے ہی خون میں لت پت ہو گئے اور انہی میں نوشابہ بھی تھی۔

جو عجیب سی وحشت زدہ نگاہوں سے اس ماحول کو دیکھ رہی تھی اور نجانے کیوں اس

وحشت زدہ ہرنی کی آنکھوں نے میرے دل و دماغ میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی اور

یہاں سے میرا نوشابہ سے تعلق شروع ہوا اور اس کے بعد میں نے ایک شریف زادے کی

حیثیت سے اپنے آپ کو نوشابہ سے روشناس کرایا وہ غمزہ تھی ان دہشت گردوں کو کوستی

رہتی تھی جنہوں نے اس کا گھر تباہ و برباد کر دیا تھا لیکن میں نے ایک ہمدرد انسان کی حیثیت

سے اس سے یہ وعدہ کر ڈالا تھا کہ اگر تقدیر نے مجھے موقع دیا تو میں نوشابہ کے والدین کے

قاتلوں کو، گرفتار کروں گا اور انہیں سزا دوں گا، ہم ایک دوسرے سے بہت زیادہ متاثر

ہو گئے تھے۔

میرے فرصت کے لمحات نوشابہ کے ساتھ گزرنے لگے تھے۔ جب تک ہم لوگ

ایک دوسرے سے مل نہ لیتے تھے ہمیں چین نہیں آتا تھا۔ مجھے مکمل طور سے جاننا چاہتی

تھی۔ بہر حال اس نے پوچھا تھا کہ میرا ذریعہ معاش کیا ہے اور میں نے اسے الٹی سیدھی

باتیں بتا کر مطمئن کر دیا کرتا تھا۔ پھر میں نے اس کی تمام ضروریات پوری کیں۔ اور ہر

طرح سے اسے سکون کی ایک زندگی دی اور وہ خاصی خوش و خرم رہنے لگی۔ میں نے بہت

سے خواب بنے تھے سوچا تھا کہ ایک مخصوص وقت گزارنے کے بعد میں اپنے دہشت گرد

گروہ سے ریٹائرمنٹ لے لوں گا اور ان سے کہوں گا کہ مجھ سے زندگی کا کوئی اتنا بڑا کارنامہ

سر انجام دینے کی خدمت لیں جو میری ساری زندگی کا حاصل ہو اور اس کے بعد مجھے آزاد

چھوڑ دیں میں اپنی زندگی کو یکسر تبدیل کرنے کے بعد ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

میرے سرپرستوں نے مجھ سے وعدہ بھی کر لیا تھا اور یہ کوئی دھوکہ دہی کی بات نہیں تھی

بلکہ سچائیاں تھیں۔ لیکن پھر سب کچھ بدل گیا دنیا ہی بدل گئی۔ گرفتاری کے بعد جو تشدد ہم

لوگوں پر کیا گیا اس نے زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دیا میں نے نوشاہہ کو بھی اپنی ذہنی سطح سے کھینچ کر پھینک دیا اب میں اسے زندگی بھر اپنے انتظار میں رکھ کر برباد نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس بد بخت فیروز جاہ نے ایک بار پھر مجھے سمانے سپنوں کی اس وادی میں پہنچا دیا تھا نوشاہہ کا تو اب مجھے کوئی پتہ بھی یاد نہیں تھا، نجانے وہ کہاں ہوگی، بہر حال میں اس وقت بہت برے وقت میں گزر بسر کر رہا تھا سچی بات یہ ہے کہ میں اب اپنے دل میں انسانیت کا گداز محسوس کر رہا تھا اور کبھی کبھی خود اپنے آپ پر نفرت بھی کرنے لگتا تھا۔ میں انسان ہوں ہی کہاں کونسا ایسا کام کیا ہے میں نے انسانوں والا۔

پھر نجانے کتنے دن گزر گئے اور اس کے بعد ایک بار پھر مجھے وہاں بلایا گیا، الماریاں تو مکمل ہو چکی تھیں میں نے سوچا کہ شاید اب یہ وہ آخری لمحات ہوں جب فیروز جاہ مجھے آزادی کی خوشخبری سنائے اور کوئی کام میرے سپرد کرے۔

جب میں اس ہال میں پہنچا تو وہاں میں نے ایک اور اجنبی شخص کو دیکھا یہ تقریباً اٹھائیس یا انتیس سال کا دبلا پتلا نوجوان تھا، نفیس تراش کے سوٹ میں ملبوس ایک کرسی پر بڑی تمکنت سے بیٹھا تھا میں اس کے سامنے پہنچا تو اس نے مدہم لہجے میں کہا۔

”ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی، مجھے تم سے صرف دو باتیں معلوم کرنی ہیں۔“

”سنو میں جس قسم کا آدمی ہوں تم جانتے ہو اس وقت اگر کوئی کام کی بات نہ ہوئی تو مجبوراً مجھے واپس اپنی دنیا میں جانا پڑے گا اور اس کی ابتداء میں تم سے کروں گا، تم یہاں سے اپنی زندگی کو سلامت نہیں لے جا سکو گے۔ میری بات سمجھ میں آرہی ہے تو سمجھ لو ورنہ اس کے بعد جو کچھ ہو گا اس کے ذمے دار تم خود ہو گے۔“

میرے چہرے پر ایک بار پھر خون کی جھلکیاں نمودار ہو گئیں تھیں اور نوجوان عجیب انداز سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرے یہ الفاظ اسے مشتعل کر دیں گے، ہر چند کہ میں ایک خوفناک ماضی رکھتا تھا لیکن اس وقت تو ان لوگوں کے چنگل میں تھا اور جلال خان کی یہ بات کبھی کبھی واقعی مجھے چھینے لگتی تھی کہ کہیں وہ میری تحلیل نفسی تو نہیں کر رہے۔ میرے سینے میں دھکتے ہوئے جہنم کو سرد کرنے کے لئے انہوں نے نوشاہہ کا نام تو نہیں استعمال کیا۔

بلاشبہ نوشاہہ کو یاد کر کے میرے دل میں گداز پیدا ہو گیا تھا لیکن دونوں صورتیں تھیں، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نوشاہہ کا تصور مجھے دیوانگی میں مبتلا کر دیتا اور چونکہ فیروز جاہ ابھی تک میرے ساتھ چوہے ملی کا کھیل کھیلتا رہا تھا اس لئے اس کے بھیجے ہوئے کسی بھی آدمی کو میں زندگی سے محروم کر سکتا تھا اور اس وقت یہ خوبصورت نوجوان بھی خطرے میں تھا لیکن میں نے اس کے چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ دیکھی، وہ مدہم لہجے میں بولا۔

”یعنی طور پر تم اس احساس کا شکار ہو گئے کہ اتنے لمبے عرصہ تک فیروز جاہ نے تم سے وہ وعدہ کیوں نہیں پورا کیا جس کے تحت وہ تم سے ملا تھا، شاید تم اس بات پر یقین کر لو کہ کچھ ایسے اتفاقی حالات درمیان میں آ گئے جن کی وجہ سے فیروز جاہ اپنے اس اقدام کو فوری طور پر عملی جامہ نہیں پہنکا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نے اپنے بہت سے لوگوں کو اس بات پر متعین کر رکھا ہے کہ وہ اس منصوبے کی تکمیل کریں جس کے تحت تمہیں یہاں سے نکالا جانا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے، بہت ہی مختصر وقت میں اس منصوبے کی تکمیل ہونے والی ہے، میرا نام فاضل کمال ہے اور یوں سمجھ لو کہ عہدے میں، میں اور فیروز جاہ برابر ہیں۔ میں تمہاری اس بے چینی کو سمجھتا ہوں اگر ہمیں اس بات کا علم ہو تاکہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیں غیر متوقع طور پر کچھ زیادہ وقت صرف کرنا ہو گا تو شاید ہم تمہیں اتنی جلدی اپنی جانب متوجہ نہ کرتے بلکہ وقت کا انتظار کرتے۔ خیر مجھے یقین ہے کہ تم تھوڑا سا صبر سے کام لو گے، فیروز جاہ اور میں بہت جلد تمہیں یہاں سے نکلانے میں کامیاب ہو جائیں گے، ویسے تمہیں اپنے بارے میں کیا محسوس ہوتا ہے، کیا تمہاری اپنی اس فطرت میں کوئی کمی آگئی ہے جس کے تحت تم انسانی زندگی کو مذاق سمجھتے تھے۔“

”کیا تم اس بارے میں جاننا چاہتے ہو؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”نہیں، میں تو تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں، اپنی ذات پر کوئی تجربہ بھلا کون

پسند کرے گا۔“ اس نے دونوں ہاتھ سیدھے کرتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔

”ویسے تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے اب تک کتنے افراد کو زندگی سے محروم کیا ہو گا؟“

لگا ہے، مثلاً، تمہارے پاس ایک جعلی پاسپورٹ ہوگا اور جس ملک میں تمہیں بھیجا  
ئے گا وہاں تمہارا اپنا ایک گھر ہوگا اور تم ایک شاندار شخصیت کے مالک ہو گے اور سب  
بڑی بات یہ کہ نوشاہہ اس گھر میں تمہارا استقبال کرے گی۔“  
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ایک بار پھر میرے سینے میں ایک عجیب سی کک پیدا  
ہوئی تھی۔

”ہاں، درحقیقت مانگیر اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوگا اور ایک نیا انسان جنم لے گا  
اپنی محبوبہ کے ساتھ زندگی کے خوشگوار ایام گزارے گا لیکن دوست دنیا کا کوئی بھی کام  
مقصد اور بغیر لالچ کے نہیں ہوتا، تم جیل کے اندر ہو اس لئے کچھ نہیں کر سکتے، ہم باہر  
معاملات سنبھالے ہوئے ہیں اس لئے ہم نے تمہیں تمہاری کاوشوں کے معقول  
دفعے کا بندوبست کیا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ جیل سے نکلنے کے بعد میں کسی اور ملک چلا جاؤں گا اور وہاں  
ری ملاقات نوشاہہ سے ہوگی۔“

”ہاں، بالکل، یہ حقیقت ہے۔“

”لیکن کیا تم لوگ نوشاہہ کے بارے میں جانتے ہو؟“

”نہ صرف جانتے ہیں بلکہ اس کے لئے ہم نے معقول بندوبست بھی کر رکھا ہے، کیا  
مجھے؟“

”کیا بندوبست کر رکھا ہے؟“

”تمہیں ایک خط نوشاہہ کے نام دینا ہوگا، اس میں تم لکھو گے کہ تم آرہے ہو اور  
مارے دوست نوشاہہ کو جس جگہ تک لانا چاہتے ہیں وہ وہاں پہنچ جائے۔ یہ وہی گھر ہوگا  
ماں تمہیں پہنچایا جائے گا، کیا سمجھے؟“

”اور اگر اس میں تمہاری کوئی چال ہوئی تو؟“

”ہمنو مائی ڈیر، ہم کیونکہ خود بھی تم سے ایک اہم کام لینا چاہتے ہیں اس لئے ہمارے  
رمیان مکرو فریب کا کوئی ایک عمل بھی نہیں ہوگا، اگر ہم مکرو فریب والی بات کریں گے تو  
لاہر ہے نہ تم خوشی سے ہمارے لئے کام کرو گے اور نہ ہی ہم تمہیں اپنے خلوص کا یقین

”تم یقین کرو اگر مجھے صحیح طور پر گنتی بھی آتی ہوتی تو شاید میں انہیں یاد نہ کر پاتا،  
بس یوں سمجھ لو مجھے آج تک جو کام دیا گیا میں اس میں کبھی ناکام نہیں رہا۔“  
”اور اتنے عرصے کی قید کے بعد تمہاری ذہنی اور جسمانی کیفیت کیا ہے، کیا تمہیں  
یقین ہے کہ تمہارا نشانہ اب بھی پہلے ہی جیسا ہے اور اگر تم کسی کی ہلاکت میں حصہ لینا  
چاہو تو تمہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔“

”میں نے اپنے استاد سے کہا تھا کہ اب میں اپنے نشانے میں مستعد ہو گیا ہوں اور  
اگر میری ایک بھی گولی رائیگاں گئی تو اس کے بعد والی گولی میں خود اپنی کینٹی پر چلاؤں گا اور  
مجھے یقین ہے کہ آج بھی میں اپنے اسی وعدے پر قائم ہوں۔“

”گویا تمہارا خیال ہے کہ تمہارا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا۔“ ”ہاں مجھے یقین ہے۔“

”ویسے کسی انسان کو قتل کرتے ہوئے تمہیں کبھی کوئی دکھ ہوا ہے؟“

”میں نے کسی انسان کو آج تک قتل ہی نہیں کیا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ فاضل کمال چونک کر بولا۔

”جو لوگ میرے ہاتھوں مارے جاتے تھے میں انہیں کبھی یا مجھروں سے زیادہ اہمیت  
نہیں دیتا تھا۔“

”خوب۔ اور اب بھی تمہاری کیفیت وہی ہے، ویسے میں تمہارے نشانے کے  
بارے میں ایک بار پھر جاننا چاہتا ہوں۔“

”ایسے نہیں، مجھے رائفیل دو اور جتنی گولیاں دو اتنی لاشیں گن لو، میں سو گز کے  
فاصلے سے باریک سے باریک شے کا نشانہ لگا سکتا ہوں لیکن تمہارے یہ تمام سوالات اس  
وقت مجھے بے مقصد اور بے نکتے معلوم ہو رہے ہیں، اتنا انتظار کرا چکے ہو تم لوگ مجھے کہ  
اب میں تم سے بدلہ ہوتا جا رہا ہوں۔“

”نہیں میرے دوست، آج سے ٹھیک چھ دن کے اندر اندر تم جیل سے باہر ہو گے،  
ہم نے تمہارے لئے بہت سے انتظامات کئے ہیں اور یقینی طور پر تمہیں ان انتظامات سے  
خوشی ہوگی، مثلاً یہ کہ چھ دن کے بعد تم جیل سے باہر ہو گے اور اس کے ایک یا دو دن کے  
بعد تمہیں اس ملک سے بھی باہر نکال دیا جائے گا، یہ تمام انتظامات کرنے میں ہی ہمیں کچھ

دلا سکیں گے؟“

”تو پھر میں کیا کروں؟“

”میں تمہیں کانڈ اور قلم فراہم کر سکتا ہوں، تم اس پر نوشتہ کے نام ایک خط لکھ گے اور جیسا کہ میں نے کہا کہ تم اس خط میں یہ لکھو گے کہ وہ ہم پر بھروسہ کر کے اس تک پہنچ جائے جہاں ہم اسے لانا چاہتے ہیں اور تم وہیں اس سے ملاقات کرو گے“

”کانڈ اور قلم فاضل کمال نے میرے سامنے رکھ دیا اور میں نے اس پر نوشتہ نام ایک خط لکھا۔ پھر اس شخص نے مجھ سے کچھ مزید کارروائیاں کرائیں اور میں یہ سوچ اس کی ہر ہدایت پر عمل کرتا رہا کہ اگر ان تمام کاوشوں کے عوض نوشتہ مجھے مل جائے جیل سے رہائی مل جائے تو کیا ہی عمدہ بات ہو ورنہ یہاں تو جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہو ہی رہا۔ اور زندگیاں لینے والا اگر کبھی خود زندگی دینے کے لئے مجبور ہو جائے تو اسے زیادہ تر نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس سے پہلے وہ جو کچھ بھی کر چکا ہے ظاہر ہے اس کا بدلہ تو ملنا ہے، میں نے البتہ اس سے یہ سوال ضرور کیا۔“

”میرے دوسرے اب جبکہ تم نے اپنی پسند کے مطابق مجھ سے یہ تمام کام لے۔ ہیں تو مجھے ایک بات اور بتاؤ مجھے کون سے ملک جانا ہوگا؟“

”یہ شاید وقت سے پہلے کی بات ہوگی، تمہاری تصویریں، تمہارے دستخط اور ایسی چیزیں تم سے لی جائیں گی جو تمہیں بیرون ملک بھیجنے کے لئے ضروری ہوگی، ویسے اپنے ذہن میں بہت سے دوسرے ضرور رکھتے ہو گے لیکن تمہیں آخر کار یہ اطمینان دلا دیا گے کہ جو وعدہ تم سے کیا گیا ہے وہ سچا ہے اور سب کچھ اسی کے مطابق ہوگا۔“

”فاضل کمال چلا گیا اور میں واپس اپنی کوشٹری میں آگیا، جلال خان ان دنوں میری طرف سے کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار رہتا تھا۔ اس دن اس نے پھر مجھ سے سوال کر دیا۔“

”یہ لوگ تم سے جو کام لے رہے ہیں اس کے عوض تمہیں کیا دیں گے؟“ میں نے خاموشی اختیار کئے رکھی اور پھر میں نے تھوڑی دیر کے بعد جلال خان سے ہی سوال کر

ڈالا۔

”اور جو منصوبہ تم نے بنایا تھا اس میں تمہیں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی؟“

”آہ افسوس، وہ لوگ ہی نہ رہے جو میرے اس منصوبے کے ساتھی تھے لیکن بہر حال میں بھی خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہوں، میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح اپنے ساتھ کچھ اور نئے لوگوں کو شامل کروں اور اس منصوبے کے سلسلے میں قدم آگے بڑھاؤں۔“ میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی، بہت سے ایسے معاملات ہوا کرتے ہیں جن میں جذباتی ہونے کا مقصد اپنے لئے مصیبتیں مول لینا ہوتا ہے، پہلے فیروز جاہ اس کے بعد یہ فاضل کمال میرے لئے ایسی کمائیاں لائے تھے جن کی تکمیل کے احساس نے درحقیقت میرے دل میں گداز پیدا کر دیا تھا اور یہ صرف نوشتہ کا تصور تھا جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا تھا ورنہ شاید میں ان کی کسی بات پر آمادہ نہ ہوتا جہاں تک جلال خان کا معاملہ تھا وہ بالکل ہی ایک الگ کہانی تھی، بہر حال وہ ایک دلچسپ دوست اور اچھا ساتھی تھا بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

”پھر وہ ہو گیا جس کا مجھے گمان نہیں تھا، اس دن فاضل کمال اور فیروز جاہ ایک ساتھ ہی آئے تھے مجھے جیل کے ذریعے ہی طلب کیا گیا تھا، ان لوگوں کے ساتھ اچھی خاصی چیزیں تھیں اور ان کے ملنے کا انداز خفیہ ہی تھا۔ فیروز جاہ نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”یہ حقیقت ہے تاہم کہ تمہیں کافی انتظار کرنا پڑا لیکن میرے دوست کوئی بھی کام اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا ہم تصور کر لیا کرتے ہیں اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں جیل سے فرار کرانے کی وہ تمام آسانیاں ہمیں سرکاری طور پر حاصل ہیں تو براہ کرم اس تصور کو ذہن میں نہ رکھنا، یہاں سے نکل کر اس جگہ تک پہنچتے ہوئے جس کی نشاندہی ہم تمہیں کرنے والے ہیں تمہیں اپنی تمام صلاحیتوں سے بھی کام لینا ہوگا۔ یہ تمہارا پاسپورٹ ہے، اسے دیکھ کر تمہیں اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ تم کس حیثیت اور کس نام سے کون سے ملک جا رہے ہو، مختصر تفصیل ان کانڈز میں درج ہے۔ تم آلات سرجری برآمد کرنے والی ایک فرم کے رکن ہو اور سالہا سال سے اس ملک میں مقیم ہو، جس کا یہ پاسپورٹ تمہارے پاس ہے، پاسپورٹ پر تاریخ بھی دیکھ لو، یہ کئی بار رینیو کر لیا جا چکا ہے اس کا مطلب ہے کہ کم از کم بارہ سال سے تم اسی جگہ مقیم ہو، تمہارا نام شاہ رخ ہے اور تم بہر حال ایک باعزت شہری ہو، مجھے یقین ہے کہ کوئی تم سے اس بارے میں سوالات نہیں

کرے گا لیکن احتیاطاً جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اسے ذہن میں رکھنا، یہ کچھ اور کائنات ہیں اس مکان کی تفصیل جو تمہارے نام ہے اور یہ تمہاری بینک بک تمہارے حساب میں تقریباً ڈھائی لاکھ ڈالر جمع ہیں اور تم بلا شرکت غیرے اس رقم کے مالک ہو، ہاں شاہ رخ نام کے دستخطوں کی یہ کتاب تمہارے پاس موجود ہے، تمہیں اس کی ذرا مشق کرنا ہوگی۔“

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جیل سے میں کیسے نکلوں گا باقی سارے کام تو اپنی جگہ؟“  
 ”ہاں، میں تمہیں یہی تفصیل بتانا چاہتا ہوں جو سب سے بڑی اہمیت کی حامل ہے، تم نے وہ احاطہ دیکھا ہے جہاں قیدیوں کو پٹی کبوا کی جاتی ہے؟“  
 ”ہاں۔“

”اور اگر تمہاری نگاہوں میں ذرا بھی وسعت ہے تم نے اس فولادی دروازے کو بھی دیکھا ہوگا جو اس احاطے کے آخری حصے میں پھولوں کے کچ کے پاس ہے؟“  
 ”مجھے پتہ ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

”اس کے سامنے ایک گارڈ کھڑا رہتا ہے، کل صبح آٹھ بجے کام پر جانے کے لئے لائن اپ ہونے سے پہلے تم اس دروازے پر پہنچ جاؤں، گارڈ کو صرف ایک لفظ کہو اور وہ لفظ ہوگا۔“ ”فیروز جاہ“ یہ لفظ ادا کرنے کے بعد تم پندرہ قدم پیچھے آ جاؤ اور جب تم دوبارہ وہاں تک پہنچو گے تو دروازہ کھل چکا ہوگا، تم دروازے کے دوسری جانب نکل جاؤ گے، دروازے سے تھوڑے فاصلے پر تمہیں ایک کیئرنگ وین میں داخل ہونا تمہاری ذمہ داری ہے، تم اس میں پہنچ جاؤ گے اور اس کے بعد کیئرنگ وین فوراً چل پڑے گی، میری ایک ایک بات کو ذہن پر زور دے کر یاد رکھنا۔ کسی ایک جگہ بھی اگر تم منصوبے کے مطابق عمل کرنے میں ناکام رہے تو یہ سمجھ لینا کہ وہاں تمہاری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا، ہم لوگ کسی بھی طور پر اس وقت تمہارا تحفظ نہیں کر سکیں گے۔“

”مگر کیئرنگ وین تو جیل کے احاطے میں ہی ہوگی اور وہاں سے اشارت ہو کر گیٹ کی جانب جائے گا، کیا واپسی میں کیئرنگ وین کی تلاشی نہیں ہوتی۔“  
 ”ہوتی ہے، لیکن اس کا بھی تھوڑا بہت بندوبست کیا جا چکا ہے لیکن بس اسی حد

تک کہ تمہیں بھی ہوشیاری سے کام لینا ہوگا اور تمہاری ہوشیاری ہی تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔“

”میں بس ایک آخری بات اور کرنا چاہتا ہوں، تم لوگ میرے ساتھی جلال خان کو جانتے ہو، وہ بھی میرے ساتھ ہی جائے گا۔“ میرے ان الفاظ پر وہ دونوں ایک لمحے کے لئے تو بھونچکے رہ گئے لیکن پھر فاضل کمال تلخ لہجے میں بولا۔

”انتہائی احمقانہ بات کہی ہے تم نے، تم اپنے بارے میں سوچو یا بے مقصد اور فضول باتوں میں الجھ گئے ہو یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں کیا اتنا آسان ہے کہ تم اسے مذاق کا درجہ دو، بھلا کسی اور کی اس تفصیل میں کیا گنجائش ہے اور کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ تم نے جلال خان کو اپنے اس راز میں شامل کر لیا ہے۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ جلال خان۔“  
 ”ہاں ہاں ہم اس کے بارے میں بھی سوچیں گے، اگر تم اس کے خواہشمند ہو لیکن اگر تم ابھی اس سلسلے میں ضد کرتے ہو تو پھر شاید ہم ایسا نہ کر سکیں۔“

”نہیں میرا اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے، میں نے بے شک جلال خان کو ابھی اس راز میں شریک نہیں کیا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر جلال خان میرے ساتھ ہی باہر نہ نکلا تو شاید میں بھی باہر نکلنے کا ارادہ ترک کر دوں اور اس سارے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہ لے سکوں۔“

”دونوں نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی پھر فاضل کمال نے ہتھار ڈالنے والے انداز میں کہا۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس کے بارے میں بقیہ انتظامات یہاں سے باہر نکلنے کے بعد ہی ہو سکیں گے۔“

”ٹھیک ہے، یہ سب تمہاری ذمہ داری ہے کیونکہ اس کے بعد جو تمام کام کرنے ہیں وہ تمہیں ہی کرنا ہونگے، میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ تم بلاوجہ نہیں کر رہے، اگر میرا خاتمہ ہی مقصود ہوتا تو ظاہر ہے اتنے عرصہ سے میں تمہاری تحویل میں ہوں، یہ سب کچھ تمہارے لئے مشکل نہ ہوتا۔“

پروا نہیں ہے۔“

”تم ایک طاقتور شخص ہو اور یقینی طور پر وہ اپنے اسی عمل کے تحت تمہارا خاتمہ کرانا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں واقعی کوئی ایسا ہی کام لینا ہو تم سے تو کیا تمہارے علاوہ ان کے پاس ایسے لوگوں کی کمی ہوگی جو یہ کام سرانجام دے سکیں، نہیں میرے دوست مسئلہ کچھ اور ہی ہے اور میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آنے والا وقت تمہارے لئے زندگی کا پیغام لائے گا یا موت کا۔“

”میں ہر قیمت پر باہر نکلنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے جس بات کے لئے تم فیصلہ کر چکے ہو میں بھلا تمہیں روکنے کا کیا ذریعہ رکھ سکتا ہوں لیکن منصوبہ میرا بھی برا نہیں تھا اور اس وقت اگر جیل سے نکلنے تو زیادہ محفوظ ہوتے میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ لوگ تم سے اپنا مطلب نکالیں گے پھر تمہیں شوٹ کر دیں گے یا واپس لا کر جیل میں ڈال دیں گے تم خود سوچو جیلر اگر اس طرح ان لوگوں کا ساتھ دے دیا ہے تو وہ معمولی ارگ تو نہیں ہونگے، میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جسے بڑے سسرے خواب دکھا کر باہر نکالا گیا، اس سے ایک آدمی کو قتل کرایا گیا اور اس کے بعد بقیہ عمر سڑنے کے لئے واپس جیل میں ڈال دیا گیا، تم مجھے بتاؤ کیا وہ تمہارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے؟“

”بقول تمہارے یہ کام وہ باہر کے کسی آدمی سے بھی لے سکتے تھے اور پھر اسے بھی باہر کے باہر ہی شوٹ کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس کام کے لئے میرا ہی انتخاب کیوں کیا اور وہ بھی اتنے عرصے سے۔“

”بالکل ٹھیک کہتے ہو لیکن جیل سے نکالے ہوئے کسی قیدی کے بارے میں صرف ان کے اپنے علاوہ کسی اور کو بھلا کیا شبہ ہو سکتا ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے کام کے لئے کسی ایسے آدمی کا انتخاب کریں جو بالکل لاوارث ہو لیکن تم جیسی شاندار شخصیت کا مالک۔“

”کچھ بھی ہو میں جس خیال کے تحت ان کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوا ہوں وہ خیال اب میرے وجود پر مکمل طور پر حاوی ہو گیا ہے اور میں اس سے گریز نہیں کر سکتا ہاں اگر

”اپنی کوٹھری میں واپس آنے کے بعد میں نے جلال خان کو اس سلسلے میں تفصیلات بتائیں تو وہ کچھ لمحے کے لئے تو ششدر رہ گیا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔“

”نہیں، میرا تمہارے ساتھ جانا ممکن نہیں ہے اور مجھے تعجب ہے کہ تم اس قدر زیرک ہونے کے باوجود ان کے فریب میں مبتلا ہو گئے، کیا تم ان لوگوں کو جانتے نہیں ہو، یہ کتنے شاطر ہیں، آخر انہیں تم سے اتنی ہمدردی کیسے ہو گئی یا پھر جو کام وہ تم سے لینا چاہتے ہیں کیا انہوں نے اس کی تفصیل تمہیں بتائی ہے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر یہ سمجھ لو کہ جو کچھ وہ تم سے کہہ رہے ہیں وہ سب کچھ فریب ہے، باہر نکل کر وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے شاید تم اس کا تصور بھی نہ کر سکو۔“

”دیکھو جلال خان، میں نے آج تک دنیا کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اگر دنیا میرے ساتھ بھی وہی سب کچھ کرتی ہے تو اس میں تعجب کی بات تو نہیں ہے۔“

”مگر میرے دوست میں نے دنیا کے ساتھ اتنا برا نہیں کیا ہے کہ میں دنیا کے ہر قسم کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھ سکوں، بیشک میں یہاں سے فرار کے مختلف منصوبے بنا رہا ہوں لیکن ایسا کوئی منصوبہ میں نے آج تک نہیں بنایا جس میں پہلے ہی مرحلے میں زندگی خطرے میں ہو۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں سے میرے ساتھ نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔“

”بالکل نہیں۔ اصل میں تم نہیں جانتے بے شمار تنظیمیں ایسی ہیں جو اپنے کارندوں کو تربیت دینے کے لئے اس قسم کے انتظامات کرتی ہیں اور ان کے امتحان لیتے ہوئے انہیں ایسے خطرناک لوگوں کو قتل کرنے کا لائسنس دیتی ہیں جو اپنے دور میں خوفناک ترین رہے ہوں، ہو سکتا ہے یہ لوگ بھی ایسی ہی کسی تنظیم کے نمائندے ہوں اور تمہارا نام لے کر انہوں نے تمہیں مانگا ہو تاکہ تم سے مقابلہ کیا جائے اور تمہارا خاتمہ کر کے اپنا امتحان دیا جائے۔“

”جلال خان نے بڑی عجیب بات کہی تھی، میں کچھ لمحے سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔“

”جو ہو گا دیکھا جائے گا، اب سارے منصوبے مکمل ہو گئے ہیں، چنانچہ مجھے ان کی

تم میرے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو تمہاری مرضی ہے حالانکہ میرے خیال میں یہ ایک اچھا موقع ہے تم بھی میرے ساتھ باہر نکلو اور میں بالکل اس کے لئے مجبور نہیں کروں گا کہ تم آگے تک میرا ساتھ دو، جہاں تک تم چاہو گے تمہیں اتار دیا جائے گا۔“

”نہیں میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔“ جلال خان نے حتیٰ لہجے میں کہا۔  
 ”تمہاری مرضی۔“ میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا، اس میں نہ برا ماننے کی کوئی بات تھی نہ جلال خان سے کوئی اختلاف ہوا۔

”لیکن دو سہری صبح جلال خان بے حد برہم تھا اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔  
 ”تمہاری وجہ سے میں ساری رات نہیں سو سکا اور یہی غور کرتا رہا کہ اگر تمہیں حرام موت مرنے کے لئے چھوڑ دوں تو یہ دوستی نہ ہوگی۔“  
 ”اس کا مطلب ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چل رہے ہو۔“

”ہاں میں ایسا ہی کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔  
 ”بہر حال ناشتے کے بعد ہمیں اپنے کام کا آغاز کرنا تھا، چنانچہ ہم بھی ورزش کے احاطے میں آگئے اور مقررہ وقت پر دروازے کی جانب کھسنے لگے، طریقہ کار وہی رکھا گیا تھا یعنی ہم ایک ایک کر کے اس دروازے سے باہر نکلے تھے اور کیئرنگ وین کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئے تھے، ہمیں کیئرنگ وین میں رکھے ہوئے سامان کے نیچے اپنے لئے جگہ بنانی تھی جس کے لئے ہمیں بے آواز عمل کرنا پڑا۔ پھر کچھ دیر کے بعد کیئرنگ وین اشارت ہو کر چل پڑی تھی اور ہم اس بات کے منتظر رہے کہ گیٹ پر پوچھ گچھ ہو اور شاید کیئرنگ وین کی تلاشی لی جائے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا، اتنا اندازہ تو مجھے بھی تھا کہ جب جیلر ان لوگوں کا اطاعت گزار ہے تو پھر بقیہ افراد کا انتظام بھی جیلر نے ہی کیا ہو گا، میں بہت زیادہ گہری سوچوں میں کبھی نہیں ڈوبتا تھا کیونکہ میرا طریقہ کار بالکل مختلف ہوتا تھا، کام کرو اس میں زندگی ملے یا موت، دو ہی چیزیں ہوتی ہیں تیسری کسی چیز کا وجود ہی نہیں۔

کیئرنگ وین کا یہ سفر تقریباً بیس منٹ جاری رہا تھا اور اس کے بعد وہ ایک جگہ رک گئی تھی۔ پھر کسی نے نیچے اتر کر عقبی دروازہ کھولا اور ایک آواز ابھری۔

”نیچے اتر آؤ۔“ چنانچہ ہم لوگ پھرتی سے دین سے نیچے اتر آئے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک قیمتی کار کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی دو نوجوان جو اجنبی شکل و صورت کے مالک تھے اور عمدہ لباسوں میں ملبوس، جلال خان نے گہری نگاہوں سے انہیں دیکھا اور مدہم لہجے میں بولا۔

”میری چھٹی حس اعلان کر رہی ہے کہ یہ خطرناک لوگ۔۔۔“ لیکن ابھی جلال خان نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہی ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور نظر آیا اور اس نے ریوالور سے ان دونوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”چلو“ اس کے ساتھ ہی اس نے کار کا عقبی دروازہ کھول دیا تھا، میں اندر داخل ہوا تو اس نے فوراً ریوالور سیدھا کیا اور جلال خان پر یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیئے جلال خان کا منہ ایک لمحے کے لئے حیرت سے کھلا اور پھر وہ زمین پر گر گیا لیکن اپنے دوست کا یہ حال دیکھ کر مجھ پر دیوانگی سوار ہو گئی، میں نے غراتے ہوئے دروازہ کھولا اور باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن دوسرے لمحے میرے سر کی پشت پر مسلسل کئی ضربیں پڑیں اور میری آنکھوں کے سامنے ستارے تاج گئے اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

لیکن پھر جب ہوش آیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری نگاہوں کے سامنے شباب ماقب گردش کر رہے ہیں، میرا بدن بالکل ہلکا محسوس ہو رہا تھا اور جسم میں تیز گرمی کی لہریں دوڑ رہی تھیں، آہستہ آہستہ آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے سب سے پہلے اسی شخص کو دیکھا جس نے ریوالور سے جلال خان کو شوٹ کیا تھا اس کے علاوہ ایک عورت تھی جس کے بال گہرے سنہری، عمر تیس بیس سے زیادہ کی نہیں ہوگی، بہت سفید رنگ اور بہت زیادہ تیز میک اپ کیا ہوا تھا، وہ ایک خوبصورت چشمہ لگائے ہوئے تھی اور اس کی جانب دیکھ رہی تھی، تیسرا آدمی مجھے فاضل کمال نظر آیا تھا، میں نے ہونٹ بھیج کر باری باری ان تینوں کو دیکھا اور پھر فاضل کمال نے کہا۔

”یقینی طور پر تم اب بہتر حالت میں ہو، ویسے کیا میں تمہیں آزادی کی مبارکباد پیش کروں۔“

میں صورتحال کو ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، سر میں ہونے والی دکھن اس بات کا



آدمیوں سے پڑے گا، یہ سب معمولی لوگ نہیں ہیں، جو زبان تم استعمال کر رہے ہو وہ تمہارے حق میں بہتر نہیں رہے گی۔“

”لیکن اس کتے نے۔“

”نہیں اس نے نہیں اپنے دوست جلال خان کو تم نے مارا ہے۔“ فاضل کمال نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”میں نے“ میں غرا کر بولا۔

”ہاں، تم یوں سمجھ لو کہ وہ جیل سے نکلنے سے پہلے ہی مرچکا تھا، یہ صرف تمہاری خام خیالی تھی کہ ہم نے تمہاری ضد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں، ہم نے تمہیں منع کیا تھا کہ جلال خان کو اپنے ساتھ شامل نہ کرو لیکن تم نہ مانے اور اپنی وہاں سے روانگی کو اسی کے ساتھ مشروط کر دیا، تم کیا سمجھتے ہو، جو کچھ ہم لوگ مل کر کر رہے ہیں کیا وہ صرف ایک مذاق ہے، ہرگز نہیں مجبوری کی حالت میں ہم نے جلال خان کو ساتھ لے جانے کی حامی بھر دی تھی، کیونکہ اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا، ہم یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ تم نے جلال خان کو ختم کر دیا ہے اور ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم کتنے خطرناک مرحلے پر کام کر رہے ہیں، ہم نے تمہارے ساتھ ایک سودا کیا ہے اور تمہیں ہر قیمت پر اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ تمہاری زندگی کے اگلے چند ہفتے تمہارے نہیں ہمارے ہیں اور ہم تمہیں اس کی بھرپور قیمت ادا کر رہے ہیں۔ اگر تم نے ہماری ہدایت کے مطابق کام کیا تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ اس کام میں ہر لمحے ہم تمہارے معاون ہیں لیکن یہ بات بھی کان کھول کر سن لو کہ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی اور ہماری ہدایات سے منحرف ہوئے تو سخت ترین اقدامات کئے جائیں گے اور جیسا کہ تمہارا نظریہ ہے کہ جب کسی کام کا آغاز کیا جاتا ہے تو دو حریفوں میں سے ایک کو زندگی سے محروم کرنا پڑتا ہے۔ اس گفتگو کی روشنی میں اگر کوئی فیصلہ کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ کیا سمجھے پھر شاید اس کے لئے وقت نہ ملے۔ اگر کسی مشکل میں پھنس جاؤ گے تو صرف دو افراد ہیں جو تمہاری مدد کر سکیں گے، ایک میں اور دوسرا فیروز جاہ لیکن ہم دونوں ہر وقت تمہارے ماتھے نہیں ہوں گے اور ہماری روانگی کے بعد تمہارا واسطہ جن لوگوں سے پڑے گا وہ

اظہار تھی کہ جو ضرر میں سر پر لگائی گئی تھیں، معمولی نوعیت کی نہیں تھیں اور یہ بھی مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میں جس حالت میں ہوں اس میں کوئی جھگڑا مول نہیں لیا جاسکتا۔ تبھی عورت اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے مجھے کافی بنا کر تم سب کو پیش کرنی چاہیے۔“ پھر اس نے غالباً پہلے سے منگوائے ہوئے کافی کے برتنوں میں سے کافی پیالیوں میں انڈیلی تھی اور اس میں سے ایک پیالی مجھے بھی پیش کی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے ذہن میں سارے خیالات جمع ہوتے جا رہے تھے اور مجھے گزرے ہوئے لمحات یاد آرہے تھے۔ فاضل کمال نے کہا۔

”تم ایک فائیو اشار ہوٹل کی اٹھارویں منزل پر موجود ہو، یہاں تمہیں تھوڑا سا وقت گزارنا ہو گا ان سے ملو یہ نامہ شہابی ہیں، نامہ شہابی تمہارے ساتھ رہیں گی اور یہ شخص جو خوبصورت اور اسٹارٹ سا نوجوان ہے اس کا نام ستار گوگی ہے، فی الحال تمہارا رابطہ نامہ شہابی سے رہے گا۔ گوگی ابھی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکے گا لیکن جب کام آگے بڑھے گا تو ممکن ہے کہ تمہارا واسطہ انہی دونوں سے رہے گا۔“

”میری نگاہیں اس شخص کی جانب اٹھ گئیں جس کا نام ستار گوگی لیا گیا تھا اور اچانک مجھے سب کچھ یاد آگیا، اس نے نہایت چالاکي سے جلال خان کو ہلاک کر دیا تھا، وہ ایک خوبصورت لباس میں ملبوس تھا اور اس وقت بھی اتنا ہی اسٹارٹ نظر آ رہا تھا لیکن میرے ہاتھوں کی انگلیوں میں کھلبلی ہونے لگی۔ اس جیسے نوجوان کو تو میں صرف ایک ہاتھ سے گردن پکڑ کر موت کی نیند سلا سکتا تھا۔ اس نے دھوکے سے جلال خان کو قتل کر دیا، میری آنکھوں میں خون اترنے لگا اور میں نے غراتے ہوئے کہا۔

”اس نے، جلال خان کو شوٹ کیا ہے اور وہ میرا دوست تھا، تم میرے اور اس کے درمیان رابطے کی بات کرتے ہو، لیکن اس بات کو تحریر کر لو کہ اس شخص کو زندگی دینا میرے لئے ممکن نہیں ہے، میں اسے کتے کی موت مار دوں گا۔“

”سنو، ڈیر ٹائیگر، جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے اسے غور سے سنو، جو کچھ تم اب تک کرتے رہے ہو، بے شک تمہاری فطرت اس سے مختلف نہیں ہو سکتی لیکن ہمیں چند باتیں صاف کر لینی چاہیں، ہمارے منصوبے کے ختم ہونے تک تمہارا واسطہ ہمارے کئی

وہ تمہارے ساتھ کوئی لحاظ نہیں کریں گے۔ ان کے پاس تمہاری ہر اینٹ کا جواب پتھر ہوگا۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔“

فاضل کمال پتھر لے لہجے میں یہ گفتگو کر رہا تھا، پھر اس نے نانمہ کی طرف رخ کر کے کہا۔ ”نانمہ ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرو۔“ خوبصورت عورت اٹھ کر ٹیلی فون کی جانب بڑھ گئی تھی، فاضل کمال ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

”اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ہم تمہارے دل پر تمہارے دوست کی موت کا داغ چھوڑ دیں، بلکہ تمہیں اس کے عوض جو خوشی دی جاسکتی ہے اس کا انتظام بھی ہونے کر لیا ہے۔ اچھا اب تم ایک نمبر ذہن نشین کرو اگر کسی سلسلے میں تمہیں ہماری ضرورت پیش آئے تو اس نمبر پر ٹیلی فون کر کے جو بھی ٹیلی فون ریسیو کرے اس سے تم صرف ایک جملہ کہو گے وہ یہ کہ تم نزلے بخار میں مبتلا ہو گئے ہو۔ کسی ڈاکٹر کو تمہارے پاس بھیج د جائے، ہمارا آدمی تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔“ فاضل کمال یہ الفاظ کہہ کر خاموش ہو گیا ادھر نانمہ ٹیلی فون پر بار بار کوئی نمبر ڈائل کر رہی تھی لیکن اب میرے ہوش و حواس پورے طرح جاگ اٹھے تھے، میں ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھتا جا رہا تھا، ویسے تو زندگی میں کبھی خوف کا میرے نزدیک سے گزر نہیں ہوا تھا، مجھے اپنے گروہ کی جانب سے بڑے بڑے وحشت ناک کام سوئے جاتے تھے، ان کاموں کی مختصر تفصیل تو سامنے آچکی ہے لیکر اس سے بھی زیادہ خوفناک کام میرے سپرد کئے گئے تھے جنہیں بظاہر اگر ایک انسانی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو صحیح معنوں میں دل سینے سے نکال کر ہاتھ پر رکھ دینے والی بات ہے لیکر ان حقیقتوں سے بھی میں اب منحرف نہیں ہو سکتا کہ سنگدل سے سنگدل انسان کے سینے میں بھی کبھی کوئی ایسا نرم گوشہ نمودار ہو جاتا ہے جو اس سے اس کی تمام شخصیت چھین لے ہے، میں نے درندگی کے جتنے کام کئے تھے ان پر مجھے شرمندگی نہیں تھی لیکن صرف ایک حماقت کی تھی میں نے اور وہ تھی نوشابہ سے محبت اور زندگی میں ایک ہی غلطی ایسی ہوئی ہے جس سے انسان دوسروں کے چنگل میں پھنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے، وہ نوشابہ ہی تھی او اب جب میں بہت عرصے سے ان حالات سے دور رہ چکا تھا اور میرے دل میں نوشابہ تصور جگایا گیا تھا تو نجانے میری شخصیت میں یہ ایک جھول کیسے پیدا ہو گیا تھا ورنہ جلال خدا

جو جس انداز سے مارا گیا تھا اس کے بعد اس کے قاتل کو زندہ چھوڑ دینا شاید میری لغت میں ممکن نہ تھا لیکن اب میں بالکل مختلف انسان بن گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت بھی میرے جسم میں خون بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا اور میرے ذہن میں ایک طوفان سا مچا ہوا تھا، میری نگاہوں میں جلال خان کا خون آلود جسم تھا اور میں اپنے ذہن سے اس کی تصویر نہیں نکال پا رہا تھا، آہ اس کا قاتل کچھ لمحوں کے بعد میرے چنگل سے نکلنے والا تھا، کیا میں اپنی روایات میں ایک ایسی گندی روایت قائم کر لوں کہ ایک ایسے شخص کا انتقام لینے سے معذور رہا جو صرف میرے کہنے سے اپنی زندگی کھو بیٹھا، ہونا تو نہیں چاہیے ایسا، میری سوچ کا پتہ نہیں فاضل کمال نے کیا اندازہ لگایا لیکن فوراً ہی مجھ سے کہا تھا۔

”اور زندگی میں نجانے کتنے الٹ پھیر آتے ہیں، کبھی کبھی ہمیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ہمارے لئے غیر متوقع ہوتے ہیں لیکن ایک مخلصانہ مشورہ تمہارے لئے ہے تم اپنی شخصیت کو قائم رکھو گے اپنے آپ کو برقرار رکھو گے، اب تک جو کچھ کرتے رہے ہو یہ سمجھ لو اس میں تھوڑی سی تبدیلیاں لازمی طور پر لانی پڑیں گی کیونکہ اس میں تمہارے مستقبل کی ایک حسین زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔“ اچانک نانمہ ہماری طرف متوجہ ہو گئی۔

”کال مل گئی ہے۔“ فاضل کمال اٹھ کر فون کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا تھا۔ پھر وہ بولا۔ ہاں موجود ہے، بس ٹھیک ہے بات کراؤ۔“ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”آؤ۔ کوئی تم سے فون پر بات کرنا چاہتا ہے۔“

”مجھ سے؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں، تمہیں اس سے بات کر کے خوشی ہوگی۔“ فاضل کمال نے کہا اور میں نے حیران ہو کر ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر کرخت لہجے میں بولا۔۔۔۔۔ ”ہیلو“

”دوسری جانب سے ایک لرزتی آواز سنائی دی۔۔۔۔۔ میں انسانی جذبات کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات نہیں جانتا، دل نام کی کوئی چیز سینے میں ہوتی ضرور ہے، اس کا احساس ہوتا ہے لیکن اس میں کیا کیا کیفیتیں ہوتی ہیں، ان کا تجربہ مجھے زیادہ نہیں تھا لیکن اس وقت لرزتی ہوئی جو آواز کانوں کے راستے دماغ تک اور دماغ سے دل تک پہنچی اس نے مجھے ششدر کر دیا۔ لرزتی ہوئی آواز دوبارہ سنائی دی۔

”ہیلو ٹائیگر“ اور مجھے اس آواز پر کوئی شبہ نہیں رہا۔ نہ یہ کوئی وہم تھا نہ سماعت کا دھوکا۔ یہ آواز نوشابہ ہی کی تھی، حالانکہ میں نے اسے بہت عرصے کے بعد سنا تھا لیکن ساری کائنات میں شاید یہی آواز ایسی تھی جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا، تیسری بار وہ آواز پھر ابھری۔۔۔۔ اور اس وقت اس میں ایک خوف، ایک جھنجھلاہٹ اور ایک بے اعتمادی سی شامل تھی۔

”ہیلو ٹائیگر۔۔۔۔ اگر تم ہو تو بولتے کیوں نہیں۔“

”ہاں نوشابہ، میں ہی ہوں لیکن مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا کہ میں تمہاری آواز سن رہا ہوں۔“ جواب میں نوشابہ بے اختیار رونے لگی، کوئی دھوکا کوئی فریب نہیں تھا، ایک ہی آواز تو ایسی تھی جس پر میں کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

”نوشابہ سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نہیں ڈیئر روتے نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔“

”ٹائیگر تم۔۔۔۔۔ تم کہاں ہو؟ ٹائیگر تم مجھ سے ملو گے نہیں۔“

”ملوں گا۔۔۔۔۔ بہت جلد ملوں گا تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیے۔“

”ٹائیگر میں تو۔۔۔۔۔ میں تو نیم مردہ ہو چکی ہوں۔ بجائے کیوں میرے دل کو یہ احساس ہو تاکہ اب میں دوبارہ تم سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔“

”جس طرح تم نے میری آواز سنی ہے، اسی طرح اس بات پر بھی یقین رکھو کہ بہت جلد ہم دوبارہ بھی ملاقات کریں گے۔“

”کب اور کیسے؟“ اس نے سوال کیا اور فاضل کمال نے اپنا داہنا ہاتھ سیدھا کر دیا، پھر معذرت آمیز انداز میں ریسیور کی جانب ہاتھ بڑھاتا ہوا مجھے اشارہ کرنے لگا کہ اب میں گفتگو ختم کر دوں، میں نے کہا۔

”میں فون بند کر رہا ہوں لیکن تم اپنے آپ کو مطمئن رکھو کسی قسم کی فکر۔۔۔۔۔“

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ٹیلیفون کی لائن بے جان ہو گئی اور میں دو تین بار ہیلو ہیلو کر کے خاموش ہو گیا۔ دل تو چاہا تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے ہر شخص کو زندگی سے محروم کر دوں۔ ابھی تو زبان کی تشنگی بھی نہیں بجھ سکی تھی دل کی تشنگی کیا بجھتی، لیکن اچانک ہی لائن میں

دوبارہ جان پڑ گئی،۔۔۔۔۔ اور میں نے بے اختیار کہا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ہیلو۔۔۔۔۔ نوشابہ۔۔۔۔۔“ لیکن جواب میں ایک مروانہ آواز آئی سنائی دی تھی۔

”سوری ڈیئر ٹائیگر۔۔۔۔۔ میں فیروز جاہ بول رہا ہوں تم نے اپنی محبوبہ کی آواز سن لی، سمجھ لو اب وہ ہمارے پاس ہے اور بہت جلد تم سے ملنا چاہتی ہے اور اس کی یہ خواہش پوری ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں ہے، وہ بالکل خیریت سے ہے اور میں نے اسے بتا دیا ہے کہ بس یوں سمجھ لو کہ تم بہت جلد اس کے پاس پہنچنے والے ہو اور اس بات کا بھی اطمینان رکھنا ٹائیگر کہ وہ بالکل سکون سے اور خیریت سے رہے گی۔ اس کے دل دماغ کو کوئی صدمہ یا تکلیف نہیں پہنچنے دی جائے گی، یہ میرا وعدہ ہے لیکن اس وعدے کا ایفا اس شکل میں ہو گا جب تم ہم سے بھرپور تعاون کرو گے۔“

”لائن ایک بار پھر بے جان ہو گئی اور میں کریڈل بجانے لگا، لیکن فاضل کمال نے

کہا۔“

”نہیں اب یہ گفتگو آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔“ میں نے وحشت ناک نگاہوں

سے فاضل کمال کو دیکھا تو وہ پھر بولا۔

”اور ڈیئر ٹائیگر، تمہیں بے شک اپنے پرانے موڈ میں ہی رہنا چاہیے لیکن کم از کم

اب یہ تمہیں ضرور تسلیم کر لینا چاہیے کہ اب ہم تمہارے دوست ہیں دشمن نہیں۔“

”میں اسے گھورتا رہا، پھر میں نے کہا۔۔۔۔۔“وہ کون سے ملک میں ہے، کیا وہ کسی

دوسرے ملک سے مجھ سے بات کر رہی تھی۔“

”ہاں“

”کون سے ملک سے، کہاں سے۔۔۔۔۔“

”افسوس یہ بتانا میرے لئے مشکل ہے، تم سمجھنا آرہی ہو ایک بہت بڑے دہشت

گرد گروہ کے لئے کام کرتے رہے ہو، کیا گروہ کے لوگ تمہیں تمام تفصیلات بتانے کے بعد

تم سے کام لیا کرتے تھے۔ ایسا نہیں ہے تو پھر تم کیوں اس بات کے خواہش مند ہو کہ

تمہیں وقت سے پہلے سب کچھ بتا دیا جائے۔ صبر کرو، ظاہر ہے ہم نے یہ جو سب کچھ کیا

ہے تمہاری محبت میں یا نیکیوں کے جذبے سے متاثر ہو کر نہیں کیا کہ دو پھڑے ہوئے دلوں کو ملا دیا جائے، میرے دوست دنیا میں لینے اور دینے کا رواج ہی قائم ہے، ہم تم سے کام لیں گے اور اس کے بدلے تمہاری محبوبہ کو تمہارے سپرد کر دیا جائے گا۔ ایک معقول رقم تو تمہارے حساب میں منتقل ہو ہی چکی ہے اس سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم تم سے کس قدر مخلص ہیں اور تمہارا مستقبل کس طرح محفوظ ہے، کیا سمجھے۔۔۔ تعاون کرو، صرف تعاون، بالکل اس طرح جس طرح تم اپنے گروہ سے تعاون کیا کرتے تھے۔ پھر فاضل کمال نے ستار گوگی اور تائمہ شہابی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ نیچے چلو، میں کچھ دیر کے بعد تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔“

”جب وہ دونوں باہر نکل گئے تو فاضل کمال نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

”دیکھو ہم لوگ بھی سڑک کے لوگ نہیں ہیں، ایک بہت بڑا کام کر رہے ہیں ہم، اور اس کام کے لئے ہم نے ایک باقاعدہ جال بچھایا ہے، تمہارا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے کیونکہ تم کارگردگی میں بے مثال رہے ہو، ورنہ تمہاری جگہ ہم کسی دوسرے کو بھی منتخب کر سکتے تھے، تمہارا انتخاب کرنے کے بعد ہم نے یہ سوچا کہ وہ کون سے عوامل ہو سکتے ہیں جن کی بناء پر تم ہمارے لئے ہماری خواہش کے مطابق کام کرنے پر راضی ہو سکتے ہو اور بہت کوشش کر کے ہم نے نوشاہی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہیں تلاش کیا اور پھر تم سے رابطہ قائم کیا گیا۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ساتھ تمہیں بھرپور تعاون کرنا ہو گا۔ تم نے ماضی میں جو کچھ بھی کیا ہے وہ بہت کچھ ہے، لیکن اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ اگر تم نے ہمارے ساتھ کوئی دھوکا بازی کی تو تمہیں ایسے مصائب سے گزرنا ہو گا جو تمہارے تصور میں بھی نہیں ہونگے بس اتنا بتا دینا کافی ہے۔ تمہارے سامنے دونوں صورتیں پیش کر دی گئی ہیں، دوستی بھی اور دشمنی بھی۔ بہتر ہے کہ دوستی کا انداز اختیار کرو۔۔۔ اور تم ہمیں ہمیشہ ایک دوست پاؤ گے۔ بس اب تم یہاں آرام سے قیام کرو، تقریباً تفصیلات میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔“

”وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے ہلکا چکر آیا تھا، غالباً سر کی چوٹ اور پھر دماغ دکھا دینے والے یہ احساسات اور الفاظ۔۔۔ اس کے علاوہ نوشاہی کی

وازا۔۔۔۔۔ یہ کم بخت دل بھی کیا چیز ہوتا ہے انسان کو نجانے کیا سے کیا بنا کر رکھ دیتا ہے۔ برے پاس اس وقت ایک معزز اور شریف شہری ہونے کے تمام ثبوت موجود تھے، میرا سپورٹ اور دوسرے کاغذات، ایک اچھی رقم، یہ تمام چیزیں میرے پاس موجود تھیں، اور یہ اشار ہوٹل کے شاندار کمرے میں موجود تھا۔ آہستہ آہستہ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور وٹل کی ایک کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا، کھڑکی کے دوسری جانب دیکھا زندگی کی روانی تیز زین محسوس ہوئی، مناظر میں ایک نیا پن تھا کیونکہ کافی عرصے کے بعد جیل سے باہر کی دنیا کے مناظر دیکھے تھے۔ دماغ ٹھنڈا کر کے میں نے موجودہ وقت کے بارے میں سوچا۔ اپنے گروہ سے علیحدگی ہو چکی تھی اور گروہ کے حشر کا مجھے اندازہ ہو چکا تھا ایسی صورت میں تنہا تو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا جبکہ ایک ایسا مجرم تھا جس کے دشمنوں کی تعداد شاید اس کے سر کے بالوں سے بھی زیادہ تھی۔ اس وقت بہترین طریقہ یہی تھا کہ میں ان لوگوں کے احکامات پر عمل کروں اور اس سے مجھے فی الحال آسانیاں حاصل ہو سکتی تھیں۔ پھر ہرج بھی کیا تھا۔ یہ تو دیکھ لوں کہ وہ چاہتے کیا ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا سامنے الماری تھی، بس یونہی دقت گزارا، کے لئے الماری کا بھی جائزہ لیا تو اس میں لاتعداد سوٹ لٹکے ہوئے نظر آئے۔ اس قدر شاندار سوٹ اور سارے کے سارے میرے سائز کے کہ میں انہیں دیکھ کر کچھ لمحوں کے لئے حیران رہ گیا تھا۔ آخری فیصلہ یہی کیا تھا میں نے کہ فی الحال زندگی کا کچھ دقت ان کے حوالے کر دینا ہر لحاظ سے منافع بخش ہے۔ چنانچہ میں نے واش روم کا رخ کیا اور پھر ایک شاندار لباس تبدیل کر کے کمرے کے باہر نکل آیا اور ہوٹل کا جائزہ لیتا ہوا ڈائننگ ہال میں آگیا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے کھانا طلب کیا اور اپنی پسند کا ہلکا پھلکا کھانا کھا کر بل پر دستخط کئے اور باہر نکل آیا۔ میں یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ جو کچھ ان لوگوں نے کمادہ حرف بہ حرف درست ہے یا پھر اس میں کوئی گنجائش ہے۔ کافی آوارہ گردی کرنے کے بعد تھکن محسوس ہوئی، سڑکیں بازار گلیاں بڑی عجیب عجیب سی لگ رہی تھیں کیونکہ بہت دن کے بعد آزادی سے ان جگہوں کو دیکھ رہا تھا۔ دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ کسی طرح دنیا کے ان ہنگاموں میں گم ہو جاؤں، کسی ایسے جال میں نہ پھنسو جس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ

میری سب سے قیمتی شے ان لوگوں کے قبضے میں تھی، اور میں اس کے تصور سے گر نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی میں اگر کوئی دلکشی اور دلچسپی باقی تھی تو صرف نوشاہی سے تھی اور گروہ کے خاتمے کے بعد میں تو یہ سوچتا تھا کہ اب میری زندگی کا کوئی اہم مقصد باقی نہیں رہ گیا ہے۔ زندگی بس اس لئے گزاری جاسکتی ہے کہ اسے گزارنا ہے بیکار اور بے مقصد اچانک ہی میرے ذہن میں ایک انوکھا تصور ابھرا تھا۔ ان لوگوں سے بے شک میرا رابطہ ہے اور میں ان کے لئے کام کرنے پر مجبور ہوں لیکن کہیں نہ کہیں باہر کی دنیا سے بھی جو رابطہ تو ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں ایک ٹیلی فون نمبر اور ایک نام میرے ذہن میں تھا۔ یہ ڈاکٹر فیضان تھا۔ ڈاکٹر فیضان بھی وہ واحد آدمی تھا جس کے ساتھ میں نے ایک بے کی تھی۔ اس کے قتل کا ایک مکمل منصوبہ طے پا گیا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ اس کے پورے گھرانے کو قتل کر دیا جائے۔ میں اس کام کے لئے مخصوص کیا گیا تھا لیکن اتفاق کی بات مجھے یہ بات پتہ چل گئی کہ ہمارا گروہ ڈاکٹر فیضان کو کیوں قتل کرنا چاہتا ہے۔ بات بالکل چھوٹی سی تھی اور کسی غلط فہمی پر مشتمل لیکن بہر حال مجھے گروہ کے ایما پر یہ کام سرانجام دینا تھا چنانچہ جب میں ڈاکٹر فیضان کے پاس پہنچا تو میں نے اس پورے خاندان کو ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ ڈاکٹر فیضان مجھے دیکھ اس طرح سہم گیا جیسے کوئی بلی دیکھ کر ساکت ہو جاتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن۔ تو اس نے مجھے ایک پیشکش کی۔ اس نے کہا کہ جس گروہ کی جانب سے میں اسے اور اس کے خاندان کو ختم کرنے کے لئے یہاں پہنچا ہوں، اس گروہ کو صرف ایک پیشکش کر دے جائے منظور ہو تو ٹھیک ہے اور اگر منظور نہ ہو تو پھر اس کی تقدیر کا جو بھی فیصلہ ہو او اتفاق سے فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا تھا۔ اس وقت فیضان میرا بڑا ممنون کرم ہوا تھا او اس نے مجھے تابعداری کی بہت سی پیشکشیں کی تھیں۔ اب ان حالات میں مجھے ایک عارضی سہارا مل جائے تو میں صرف ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھینے کے بجائے کوئی ایہ پوائنٹ بھی رکھوں جس سے ضرورت کے وقت فائدہ اٹھا سکوں۔

میں احتیاط سے اس پتے پر چل پڑا۔ ممکن ہے یہ ان لوگوں کی مرضی سے خلافت عمل ہو لیکن میں نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ڈاکٹر فیضان کا کلینک مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ یہ بھی دلچسپ اتفاق تھا کہ میں اسی شہر میں موجود تھا جہاں فیضان سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ راستہ طے کرتے ہوئے میں پوری طرح محتاط تھا مجھے ان لوگوں سے خطرہ تھا لیکن کوئی تین کلومیٹر چلنے کے باوجود مجھے کسی تعاقب کا احساس نہیں ہوا۔ تب میں نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر ڈرائیور کو مطلوبہ پتہ بتا دیا۔

ڈاکٹر فیضان کا کلینک پہلے سے مزید بہتر ہو گیا تھا۔ باہر اس کے ملنے کے اوقات درج تھے جن کے مطابق وہ اس وقت کلینک میں موجود تھا۔ اس تک پہنچے میں مجھے تھوڑی سی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن میں ایک مریض کی حیثیت سے اس کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کی یادداشت شاندار تھی اور یوں بھی میری اور اس کی شناسائی جن حالات میں ہوئی تھی اصولی طور پر وہ اسے موت کے وقت تک یاد رہنا چاہیے تھے۔ اس کے چہرے پر مردنی اور آنکھوں میں موت کا خوف رقصاں ہو گیا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”نہیں۔ اس وقت تمہیں میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے اس لئے تم ہر طرح کا خوف دل سے نکال دو۔ ویسے تم نے مجھے پہچان تو لیا ہے نا؟“

”ہاں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”تم ایک اچھے انسان ہو۔ مجھے اس کا اندازہ ہے لیکن شاید تم اخبارات میں دلچسپی نہیں لیتے۔“

”کیوں.....؟“ وہ خود کو سنبھال کر بولا۔

”میری تنظیم تو بہت پہلے ختم ہو گئی ہے۔ تمہیں اخبارات سے اس کا علم نہیں ہوا کیا؟“

”ہوا تھا، کیونکہ میں خود اس تنظیم کا شکار رہ چکا ہوں۔“

”تمہیں یہ بھی علم ہوا ہو گا کہ تنظیم کے زیادہ تر افراد موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔“

”زیادہ تر..... تمام نہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم نے اس بارے میں خوب معلومات حاصل کی تھیں۔“

”وجہ تم جانتے ہو۔۔۔۔۔!“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔  
 ”تمہاری حالت اب کافی بہتر ہو گئی ہے۔ وہ جو ایک واقعہ پیش آیا تھا اس کے بعد تم نے کہا تھا کہ اگر کبھی ضرورت پیش آئی تو تم میری مدد سے گریز نہیں کرو گے۔“  
 ”میں تمہارا اتنا ہی احسان مند ہوں کہ اپنے اس قول کو کبھی نہیں بھولوں گا بتاؤ۔۔۔۔۔“  
 ”مجھ سے کوئی کام ہے۔“

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ تنظیم کے خاتمے کے باوجود میں کیسے زندہ ہوں۔“  
 ”تم زندہ ہو۔۔۔۔۔ یہ کافی ہے۔“  
 ”میں جیل توڑ کر فرار ہوا ہوں۔“

”اوہ۔“ اس کے چہرے پر پھر پیلاہٹ دوڑ گئی۔  
 ”اور مجھے پناہ کی تلاش ہے۔ کیا تم میرے لئے کوئی بندوبست کر سکتے ہو۔“ اس نے ایک لمحے سوچا پھر بولا۔ ”سو فیصد۔ تم بالکل فکر مت کرو فوری طور پر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے عارضی طور پر اس پر عمل کرتے ہیں بعد میں کوئی مستقل بندوبست کر لیا جائے گا۔“

”کیا ترکیب ہے؟“ میں نے سوال کیا۔  
 ”میں تمہارے پورے چہرے پر بینڈیج کئے دیتا ہوں۔ تمہارا چہرہ پیوں میں چھپ جائے گا تو تمہارے نقوش بھی کسی کو نہیں نظر آئیں گے۔ میں تمہیں ایک وی آئی پی روم دے دوں گا۔ کچھ وقت تم یہاں گزارو گے اور اس کے بعد میں کوئی اور مناسب بندوبست کروں گا۔“

”تم ایک اچھے انسان ہو۔“ میں نے کہا۔  
 ”بہت عرصے کے بعد میرا واسطہ ایک اچھے انسان سے پڑا تھا۔ وہ کمرہ بہت کشادہ اور آرام دہ تھا۔ جو لوگ میرے ارد گرد پھیل گئے تھے بے حد چالاک اور خطرناک تھے۔ اس مرحلے تک آنے کے بعد میں ان کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ حالانکہ میں نوشابہ کی آواز سن چکا تھا لیکن کر چکا تھا کہ یہ اسی کی آواز تھی اور یہ اندازہ بھی لگا چکا تھا کہ نوشابہ ان کے قبضے میں ہے لیکن اس کے بعد بھی کچھ تھا۔ مثلاً یہ کہ اپنا کام نکالنے کے بعد ہمیں وہ مجھ

اپنا مستقل غلام تو نہیں بنالیں گے۔ بے شک وہ نوشابہ کو میرے سپرد کر دیں گے لیکن اس کے بعد کیا ہم ایک آزاد زندگی گزار سکیں گے۔ اگر انہوں نے مجھے ایک آزاد زندگی نہ دی تو کیا میں انہیں ڈاج دے سکوں گا۔۔۔۔۔! ڈاکٹر فیضان کے ذریعے میں نے یہ تجربہ کیا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں اور کہاں تک میرا تعاقب کر سکتے ہیں اگر انہوں نے مجھے ٹریس کر لیا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ برق رفتاری سے اپنا کام کر رہے ہیں اور یقینی طور پر ان سے آسانی سے چھکارہ حاصل کرنا میرے بس میں نہیں ہو گا اگر وہ مجھ تک پہنچ گئے تو میں ان سے یہی کہوں گا کہ میں شدید ذہنی بحران کا شکار ہوں اور اپنے طور پر سوچنا چاہتا ہوں اس کے لئے میں نے یہ ذریعہ منتخب کیا تھا اور اگر وہ مجھ تک نہ پہنچ پائے تو کچھ وقت آرام کرنے کے بعد خود ان سے رابطہ قائم کروں گا اور بتاؤں گا کہ وہ آسانی سے مجھ پر قابو نہیں پاسکتے۔ اب جبکہ میں جیل سے آزاد ہو چکا ہوں تو میں اپنی شخصیت سے کام بھی لے سکتا ہوں لیکن میرے اندر سے جو آواز اٹھ رہی تھی وہ مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ جن لوگوں نے اب تک یہ کاروائی کی ہے وہ ذہنی طور پر مجھ سے بہت زیادہ طاقتور ہیں اور میں آسانی سے انہیں کوئی ڈاج نہیں دے سکوں گا۔“

ڈاکٹر فیضان نے میری خواہش کے مطابق مجھے تحفظ تو فراہم کر دیا تھا اور درحقیقت پیوں سے ڈھکے ہوئے اس چہرے کی شناخت ناممکن تھی، یقینی طور پر ڈاکٹر فیضان نے اپنے اسٹاف سے بھی میرے سلسلے میں کوئی نہ کوئی بات کی ہوگی، لیکن ڈاکٹر فیضان کی شدت کا اندازہ میں اس سے لگا سکا کہ رات کے تقریباً دو بجے وہ خاموشی سے میرے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے مجھے جگا دیا۔

”ایک لمحے کے لئے میں حیران رہ گیا۔ پھر میں نے اسے پہچان کر کہا۔ ”خیریت، کیا کوئی خطرہ سر پر آگیا ہے۔۔۔۔۔!“  
 ”نہیں۔۔۔۔۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔“

”تم نے مجھے نیند سے جگایا ہے ڈاکٹر فیضان بہتر یہ ہے کہ جلدی سے مجھے اپنی آمد کے بارے میں بتا دو، تمہارے پاگل پن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“  
 ”خدا کے لئے تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سارا معاملہ کیا ہے۔“ ڈاکٹر فیضان نے کہا اور میں

”ڈاکٹر فیضان بذات خود صبح کو آپ کو انجکشن لگائے تھے جناب یہ تھوڑی سی غذا

ہے آپ کے لئے، میں آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

نرس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن یہ تھوڑی سی غذا میرے لئے پریشان کن تھی، یہ تو مجھے بھوکا مار دیں گے ڈاکٹر فیضان نے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا۔ بہر حال اس وقت ناشتے کے طور پر سب کچھ برداشت کر لیا، لیکن اگر دوپہر کو بھی کھانے میں گڑبڑ ہوئی تو پھر ڈاکٹر فیضان سے اس سلسلے میں بھی بات کرنا پڑے گی، ویسے اس بے چارے کی مشکلات کا بھی مجھے اندازہ تھا۔ اس نے اپنی دانست میں مجھے ایک محفوظ مقام مہیا کر دیا تھا، لیکن کچھ مراحل ایسے رہ گئے تھے جن کا حل شاید خود اس کے اپنے پاس بھی موجود نہ ہو۔

”دوپہر گزری، شام ہو گئی، میں غیر مطمئن نہیں رہا تھا۔ رات کو بھی مجھے اچھی خوراک دی گئی اور نرس نے خود اس خوراک کو میرے حلق تک پہنچانے کا بندوبست کیا۔“

اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے دس بجے تھے، جب ایک نرس میرے کمرے میں داخل ہوئی، میں آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا، ذہن متعدد خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اب تک تو وہ لوگ مجھے تلاش نہیں کربائے اس کا مطلب ہے کہ میں انہیں ایک کامیاب ڈانج دے چکا ہوں۔ نرس میرے قریب آئی اور مدھم لہجے میں بولی۔

”کیا تم سو رہے ہو!“

”میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا یہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو ایک دم مجھے احساس ہوا کہ یہ شناسا آواز ہے، ویسے بہت سی نرسوں کی آوازیں اب تو شناسا ہو گئی تھیں، لیکن یہ آواز ان سے بالکل مختلف تھی، میں نے بے اختیار آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نرس کے سفید لباس میں ملبوس نامہ شہابی میرے سامنے کھڑی مسکراہٹ کھیل رہی تھی، پھر اس نے کہا۔“

”میں جانتی ہوں اس بے سکونی کے عالم میں بھلا اتنی جلدی نیند کہاں آ جاتی ہے۔“

”کون ہو تم؟“ میں نے بھرائی آواز میں پوچھا۔

”تم یہ جانتے ہو کہ میں نامہ شہابی ہوں اور میں یہ جانتی ہوں کہ تم ٹائیگر ہو۔“

نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے اس لئے رات کے اس وقت بھی میں تمہارے سوالات کا جواب دینا پسند کروں گا اصل میں، میں جیل سے فرار نہیں ہوا ہوں بلکہ مجھے جیل سے فرار کرایا گیا ہے۔“

”ڈاکٹر فیضان کا چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا اس نے مدھم لہجے میں کہا۔“

”تک، کس نے فرار کرایا ہے؟“

”کچھ پراسرار لوگ ہیں لیکن ہر لحاظ سے صاحب اختیار کیونکہ جیل میں جس طرح میں نے انہیں اپنی مرضی کے مطابق ہر شخص سے عمل کراتے ہوئے دیکھا تھا اس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لازمی طور پر کچھ اس طرح کے اداروں سے تعلق رکھتے ہیں جو بہت بااختیار ہیں اور ویسے بھی ڈاکٹر فیضان تم جانتے ہو کہ مجھے سیاست کے بارے میں نہ تو معلومات حاصل ہیں اور نہ ہی میں کوئی گہری بات جانتا ہوں۔“

ڈاکٹر فیضان نے اپنا رخسار کھجائے ہوئے کہا۔ ”اصل میں مجھے صرف یہ تشویش ہے کہ اگر وہ کوئی جرائم پیشہ لوگ ہیں تو کسی بھی مرحلے پر میں پولیس کی مدد حاصل کر سکتا ہوں تمہاری بات تو خیر بعد میں آئے گی اسے دیکھنا پڑے گا اور اگر سرکاری حیثیت کے لوگ ہیں تو پھر تمہیں ہواؤں سے بھی محفوظ رکھنا ہوگا۔“

”میرا خیال ہے تم مجھے ہواؤں سے محفوظ کر چکے ہو!“

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن میں خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہا ہوں ویسے تمہیں موجودہ سیاسی حالات کا شاید علم نہیں ہے میرے ذہن میں لاتعداد تشویش ناک خیالات ہیں۔ خیر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے یہاں چلا آیا اور تمہیں جگا دیا۔ اب آرام کرو۔“

”اس کے بعد اپنے آپ کو مطمئن کر لینا ڈاکٹر فیضان ورنہ اگر تم مجھے اس طرح پریشان کرتے رہے، تو میرا یہاں آنا بے مقصد ہو جائے گا۔“

”ڈاکٹر فیضان نے کوئی جواب نہیں دیا اور واپس چلا گیا۔“

”دوبارہ سونے میں مجھے جس قدر وقت پیش آئی تھی میں ہی جانتا ہوں۔ دن کو دیر

بچے نرس نے مجھے جگایا تھا اور کہا تھا۔“

”البتہ دوسرے دن شام کو تقریباً ساڑھے پانچ بجے ستارگوگی میرے پاس آیا اور میرے سامنے تمام کاغذات وغیرہ رکھتا ہوا بولا۔

”چھ افراد کو تمہاری اس حرکت کے بعد تمہارے اوپر متعین کر دیا ہے، تم ان میں سے کسی کو نہیں پہچان سکو گے، لیکن یہ سمجھ لو کہ ہر لمحہ تم ان کے نشانے پر ہو اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، ہم تو ہر قیمت پر تم سے اپنا کام لینا چاہتے ہیں، ہاں اس معصوم لڑکی کو جس کے دل میں تم سے گفتگو کرا کر امیدوں کے بہت سے چراغ روشن کر دیئے گئے ہیں، نہایت افسوس کا سامنا کرنا پڑے گا نجانے کیوں تم اس سے گریز کر رہے ہو۔“

ان ساری باتوں کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر دوسرے دن مجھے طیارے نے جہاں اتارا تھا وہاں پہنچ کر ہی مجھے معلوم ہوا کہ میں کہاں پہنچا دیا گیا ہوں۔ یہ ڈبل تھا، آئرلینڈ کا دارالحکومت، اور ہوائی اڈے پر فیروز جاہ نے میرا استقبال کیا تھا، وہ بالکل تروتازہ اور خوش نظر آ رہا تھا اور اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ وہ ہر حال میں مجھ سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے، وہ بڑی گرجوٹی سے مجھ سے ملا اور اس نے کہا۔

”ہیلو مائی ڈیر، کیسے مزاج ہیں تمہارے، مجھے امید ہے کہ تم آرام سے رہے ہو گے!“

..

”بہت آرام سے۔“ میں نے جواب دیا اور وہ مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے ہوائی اڈے سے باہر نکل آیا۔ پھر ہم ایک لمبی لیموزین کی عقبی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے جس کے ڈرائیور نے گاڑی اشارت کردی اور اس کے بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔

”تمہیں ایک اچھا اور طویل سفر طے کرنا پڑے گا۔“ راستے میں فیروز جاہ نے مجھ سے کہا اور میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”لامارک پھولوں کا شہر ہے اور ایک خوبصورت جگہ اور لامارک ہی کے ایک مکان میں نوشاہہ تمہاری منتظر ہے تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ جس جگہ ہم نے اسے قیام پذیر کروایا ہے وہ ساحل سمندر پر ہے اور بحر اوقیانوس کا ایک خوبصورت حصہ کہلاتی ہے،

دونوں باتیں بالکل درست ہیں اور تیسری درست بات یہ ہے کہ ڈاکٹر فیضان اس وقت اپنے کمرے میں، میرا مطلب ہے اپنی رہائش گاہ کے کمرے میں مردہ پڑا ہوا ہے اس کی گردن زخروں سے لے پچھلی سطح تک کاٹ دی گئی ہے اور ابھی تک شاید اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے، تمہارے لیے انتہائی معقول بندوبست ہے، یہ دیکھو یہ پستول ہے۔“ اس نے سفید کپڑا ہٹایا اور سیاہ رنگ کا آٹومٹک پستول نکال کر میرے سامنے کر دیا جس پر چھوٹا سا ٹنسر لگا ہوا تھا۔

”میں اس سے تمہارے اوپر آٹھ گولیاں چلا سکتی ہوں تجربے کے طور پر ایک گولی چلا کر دکھاتی ہوں اس سے کوئی آواز نہیں نکلے گی اور تمہارے بدن میں اس ایک گولی چلانے کے بعد سات سوراخ ہو جائیں گے۔“ اس نے کہا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”کیا خیال ہے، تجربہ دیکھنا پسند کرو گے؟“ ”کیا کرنا ہے.....؟“

”وہ پچھلی کھڑکی کھول دی ہے میں نے، اس میں سلاخیں نہیں ہیں، دوسری جانب کیاری ہے اور جب تم کھڑکی کے دوسری جانب کودو گے، تو تمہیں ایسی محبت کرنے والے مل جائیں گے جو تمہارا ہر طرح خیال رکھیں گے۔“

پھر مجھے کھڑکی سے کودنا پڑا، محبت کرنے والے واقعی موجود تھے، جنہوں نے میری گردن کی پشت سے پستول کی نالیں لگا دی تھیں اور اس کے بعد سیاہ رنگ کی ایک گاڑی مجھے لے کر چل پڑی تھی، اب تک تو خیر جو کچھ تھا وہ میرا ہی کھیل تھا۔ یعنی یہ کہ اس سے پہلے میں خود بھی درجنوں بار ایسے کھیل کھیل چکا تھا لیکن ڈاکٹر فیضان کے کئے ہوئے زخروں کے بارے میں سن کر مجھے واقعی دکھ ہوا تھا، بے چارہ ڈاکٹر فیضان، لیکن ان لوگوں نے اس بار مجھے ہوٹل کی اٹھارہویں منزل پر نہیں پہنچایا تھا بلکہ ایک نئی جگہ میرے لئے منتخب کی گئی تھی اور اس کے بعد میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں جن پر میں نے احتجاج کیا، جو شخص اس وقت میرے سامنے موجود تھا اس نے کہا۔

”خیر میں تو ایک معمولی حیثیت کا آدمی ہوں لیکن سنا یہ گیا ہے کہ تمہارے فرار کا

اندیشہ ہے۔“





زندگی بہر حال مجھے ڈاکٹر فیضان سے زیادہ عزیز تھی۔ اس مکان میں نوشابہ کے ساتھ یہ وقت گزارتے ہوئے کچھ دن تک کے لئے تو میں یہ بھول گیا کہ میرا تعلق کسی ایسے ہولناک گروہ سے رہ چکا ہے، جس نے نجانے کیسے کیسے جرائم کئے ہیں اور میں ان جرائم میں سر فہرست رہا ہوں یہاں تک کہ کچھ خطرناک لوگوں نے جب میرا انتخاب کیا تو یقینی طور پر میرے ماضی کی بنیاد پر ہی کیا، اب اس کے بعد زندگی کو ایک نیا رنگ ملا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی اتنی بری نہ ہو، جس کا تصور کر لیا گیا ہے اور وہ جو میرے ہاتھوں زندگی سے محروم ہوئے واقعی نقصان میں رہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اس وقت تو بالکل ہی ایک طرح سے یہ سمجھا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ جانوروں کی طرح زندگی گزاری تھی میں نے۔۔۔۔۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ لامارک ایک خوبصورت شہر تھا اور ہم یہاں زندگی کی تمام لطافتوں سے آشنا ہو رہے تھے۔ نوشابہ نے مجھ سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے اس سے کہا تھا۔

”نوشابہ تم تک واپس آنے کا تصور ہی ایک بار پھر مجھے زندگی کی جانب واپس لے آیا ہے، لیکن میں تھوڑا سا وقت چاہتا ہوں اور تم ایک اچھی لڑکی کی طرح اور ہمیشہ کی مانند اس بات پر ضد نہیں کرو گی کہ میں تمہیں ساری تفصیلات بتا دوں، بس یوں سمجھ لو کہ ایک چھوٹا کام ہے جو میرے کرم فرما میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں اور اس کی تکمیل کے بعد شاید مجھے اور تمہیں یکجا رہنے کی آزادی حاصل ہو جائے۔“

”بس میں تو یہ چاہتی ہوں کہ تمہارے ماضی کا تم سے جو تعلق رہا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔“

”ہاں یہ تعلق تو میں اس وقت ختم کر دیتا چاہتا تھا جب مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ میں دوبارہ تم سے مل سکتا ہوں، لیکن تعلق کی ٹانگ تھوڑی سی پھنسی ہوئی ہے بس اسے نکل جانے دو۔“

”اس کے بعد.....؟“

”اس کے بعد ہم شادی کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے، اور پھر ہم اس شہر میں نہیں رہیں گے جہاں ہماری شناسائی ہے۔“

”میں خاموشی سے اس مکان کے دروازے کی جانب مڑ گیا اور پھریوں محسوس ہوا جیسے یا تو کار روکنے کی آواز سے یا پھر میری خوشبو سے نوشابہ کو میری آمد کا علم ہو گیا اس نے مکان کا حسین دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ اس طرح دوڑی کہ گرتے گرتے بچی۔ میں نے اسے اپنے چوڑے سینے میں سمولیا تھا۔ نوشابہ پر جو کیفیت طاری تھی اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بدن پر کپکپاہٹ تھی اور چہرے پر بے یقینی کے تاثرات۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے آواز نکلی۔

”مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ تم ہو، ایک بار پھر تم مجھے مل چکے ہو، اب تم میرے ساتھ ہو، اس طویل عرصے میں بس میں اس قسم کے خواب دیکھتی تھی میں تمہیں خط لکھتی تھی اور انہیں محفوظ کر دیا کرتی تھی لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں نجانے کیوں میرے دل میں امید کی ایک شمع روشن تھی میں جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور واپس آؤ گے، آہ میرے خدا میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں روؤں یا ہنوں۔۔۔۔۔!“

”رونا تو اس نے اسی وقت شروع کر دیا تھا جب میں اس کے قریب پہنچا تھا۔ نوشابہ اتنی ہی حسین و دلکش تھی لیکن اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے ہوئے حلقے یہ احساس دلا رہے تھے کہ وہ میرے دکھ کا شکار رہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ مرد کی نگاہوں میں بعض اوقات کوئی معمولی سی چیز بڑی پرکشش ہو جاتی ہے، میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ دلکش اور حسین نظر آ رہی ہے، بہر حال نوشابہ میرے ساتھ ہی اندر آئی تھی اور اس کے بعد ہم بہت سی باتیں کرتے رہے تھے۔ اس کے سوالات پر میں نے اس سے کہا تھا کہ جن لوگوں نے مجھے آزادی دلائی ہے وہ بااثر لوگ ہیں اور وہ اپنی ضمانت پر مجھے اس ملک سے نکال کر یہاں لے آئے ہیں، میں جانتا تھا کہ نوشابہ کو حالات کا جتنا کم علم ہو گا وہ اتنی ہی خوش رہ سکے گی، ڈاکٹر فیضان کے بارے میں مجھے علم تھا اور پھر اچانک ہی مجھے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ یہ مکان انہوں نے مجھے منتخب کر کے دیا ہے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس مکان میں انہوں نے کس جگہ، کہاں ایسے ذرائع رکھے ہوں جہاں سے میری ہر آواز ان کے کانوں تک پہنچ جاتی ہو، چنانچہ نوشابہ سے عشق محبت کی گفتگو کرنا ہی زیادہ بہتر تھا اور ان کی اس ہدایت پر عمل کرنا ہی زیادہ بہتر تھا اور ان کی اس ہدایت پر عمل کرنا تھا کیونکہ نوشابہ کی

لگ رہا تھا جیسے کسی نے گھر کی صفائی کر ڈالی ہے، لیکن اس احساس کے ہونے کے بعد جب ہم نے اپنے مختصر سے سلمان کی تلاشی لی تو کوئی چیز غائب نہیں ملی لیکن یہ صرف نوشابہ کا خیال تھا، میں نے البتہ جب گہری نگاہوں سے جائزہ لیا تو مجھے پتہ چل گیا کہ ہمارے پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ غائب ہیں اس کے باوجود میں نے نوشابہ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے چہرے کی شگفتگی میں کوئی شکن پیدا ہو جائے ایسی شکن جس میں تشویش ہو۔

”بہر حال میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اس دوران ان لوگوں نے مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ پھر ایک دن میں جب نوشابہ کے ساتھ سیرو سیاحت کر کے گھر واپس پہنچا تو براؤن رنگ کی ایک بھدی سی کار مجھے اپنے ہی بنگلے کے دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ ایک لمحے کے لئے ذہن پر ایک اثر سا ہوا تھا۔۔۔۔۔ لیکن جب اندر داخل ہوئے تو فیروز جاہ فاضل کمال اور ایک تیسری شخصیت وہاں موجود تھی۔ مکان چونکہ انہی کا فراہم کیا ہوا تھا اس لئے اس بات پر تعجب نہیں ہوا کہ وہ اس مکان میں کیسے داخل ہو گئے۔ میرے ذہن میں پہلے بھی یہ خیال آیا تھا کہ ممکن ہے ہمارے پاسپورٹ وغیرہ کی ضرورت کسی شکل میں خود فیروز جاہ کو ہوئی ہو اور اس نے اس انداز میں اسے حاصل کر لیا ہو، بہر حال مجھے یہ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ کافی دیر سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں کیونکہ کمرے کی فضا میں تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی، اجنبی شخص خاصا پست قامت لیکن چوڑے اور پھیلے ہوئے بدن کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے رحمی عیاں تھی اور ایک نگاہ دیکھنے سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خاصا سخت مزاج آدمی ہے۔ فاضل کمال نے کسی قدر ترش لہجے میں کہا۔

”گھر سے باہر رہنا بہر حال انسان کے لئے بہت ضروری ہے، لیکن تم اس طرح عیش و آرام سے باہر کی سیاحت کر رہے ہو جیسے یہاں کے معزز شہری ہو۔ اگر کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو ہمارے لئے عذاب بنا دو گے، کیا تمہیں یہ احساس نہیں ہے کہ تم۔۔۔۔۔!“

”خیر چھوڑو کوئی بات نہیں ہے۔“ فیروز جاہ نے جلدی سے کہا اور پھر پست قامت کی طرف رخ کر کے بولا۔

”ان سے ملو مسٹر شاہنواز“

”مطلب۔۔۔۔۔!“

”ہم کسی ایسے اجنبی دیس میں چلے جائیں گے جہاں ہمیں جاننے والا کوئی نہیں ہوگا ہم وہیں کوئی جگہ لے کر وہاں قیام کریں گے اور اپنے آپ کو بالکل بدل لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکراتے ہوئے دیکھا پھر آہستہ سے کہا۔

”اور کوئی ایسی خواہش جو تمہارے دل میں ہو۔“

”میری ہر خواہش تمہاری قربت سے پوری ہو گئی ہے“ ساحل سمندر پر ہم ہمیشہ لطف اٹھاتے رہتے تھے، زندگی اچانک ہی اتنی خوبصورت ہو گئی تھی کہ بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دماغ کسی حسین خواب میں کھو گیا ہے۔“

”نوشابہ میرے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے قہقہے لگاتی میرے ساتھ لہروں کے ساتھ ساتھ دوڑتی، ساحل کی بھگی ریت پر بھاگتی رہتی۔ کبھی ہم پانی میں گھس کر ایک دوسرے پر پانی اچھالتے اور کبھی ریت پر لیٹ کر شفاف نیلے آسمان کو نکتے رہتے۔ نوشابہ میرے خوابوں کی شہزادی تھی اور دن بدن میری قربت میں اس کا روپ نکھرتا جا رہا تھا۔ یہ قربت یہ آزادی اور یہ انداز یہ فراغت پہلے مجھے کہاں نصیب ہوئی تھی، اگر ذہن کی دراڑوں میں سے کسی لمحے نوشابہ سے جدائی کا خیال آتا تو اب مجھ پر وحشت سی طاری ہو جاتی تھی، میرے اندر کوئی چیخنے لگتا تھا۔

”نہیں اب میں شاید نوشابہ کی جدائی کی کسی صورت برداشت نہیں کر سکوں گا چاہے اس کے لئے مجھے کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔“

”ان لوگوں نے ہمیں یہ کچھ دن خوشگوار گزارنے کا موقع دیا تھا، ویسے یہ حقیقت ہے کہ نوشابہ کی اس قدر قربت سے دل میں ایک گداز سا پیدا ہونے لگا تھا، اب کسی کا احسان، احسان بھی محسوس ہوتا تھا۔ پہلے جیسی جانوروں کی سی زندگی نہیں رہی تھی، کسی بات کے بارے میں سوچنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا لیکن اب صورت حال بالکل مختلف تھی، البتہ اس دن جب ہم واپس آئے تو اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے گھر کے کچھ سلمان میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہے، اس تبدیلی کا احساس ہمیں ایک لمحے کے اندر اندر ہو گیا تھا، یوں

تھا، میں اپنی جگہ سے اٹھا اور فاضل کمال کی جانب ہاتھ بڑھا کر میں نے اس کے زرخرے کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن فوراً ہی شاہنواز اور فیروز جاہ میرے اور فاضل کمال کے درمیان آگئے۔ شاہنواز نے مجھے کمر سے پکڑ لیا اور فیروز جاہ نے غصیلے لہجے میں فاضل کمال سے کہا۔

”تم اندر جاؤ اور دوسرے کمرے میں جا کر انتظار کرو۔“

”لیکن میں۔۔۔۔۔“ فاضل کمال نے احتجاجی انداز میں کہا اور شاہنواز نے اس کا بازو پکڑ لیا، پھر وہ اسے لئے ہوئے کمرے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ کچھ لمحات کے لئے خاموشی طاری رہی، فاضل کمال کا باہر چلے جانا ہی اس کے اور میرے دونوں کے حق میں بہتر رہا، کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد فیروز جاہ نے کہا۔

”یہ آدمی بے وقوف ہے، ویسے میں تمہیں بتاؤں اپنے کاموں میں انتہائی ماہر اور شاطر ہے، لیکن اصل میں کبھی کبھی آؤٹ ہو جاتا ہے اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاتا، خیر چھوڑو کوئی ایسی بات نہیں ہے، اس نے جو بکواس کی اسے ذہن سے نکال دو، میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ ہم لوگ کچھ وقت کے لئے یہاں سے باہر جا رہے ہیں، یہ سمجھ لو ایک دوسرے ملک اور تمہیں میرے ساتھ جانا ہے۔“

”کون سے ملک۔۔۔۔۔!“

”یہ بعد میں بتاؤں گا تمہیں بس یہ سمجھ لو کہ ایک پرائیویٹ طیارہ ہمیں یہاں سے لے کر جائے گا۔“

”واپسی میں کتنے دن لگیں گے۔“ میں نے سوال کیا۔

”ہفتہ دس دن یا شاید اس سے بھی کچھ کم، یہ حالات پر منحصر ہے۔“

”تم یقین کرو کہ پوری بات ہمیں بھی نہیں بتائی جاتی بس ہمیں کہیں اور سے ہدایات ملتی ہیں اور جو کچھ ہدایات ہمیں ملتی جاتی ہیں، ہم ان پر عمل کرتے رہتے ہیں، وقت آنے پر تمہیں بھی یقینی طور پر پوری بات بتادی جائے گی، لیکن یہ بات تمہیں بتانے والا کم از کم ہم میں سے کوئی نہیں ہوگا۔۔۔۔۔!“

”میرا پاسپورٹ اور میرے کاغذات کہاں ہیں، کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ

”ہیلو!“ چوڑے پستہ قامت آدمی نے میری جانب مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا، اس کا لہجہ مضبوط تھا اور ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک انتہائی طاقتور آدمی ہے۔

”اب ہمیں کام کی بات کرنی چاہیے، مس نوشاہہ اگر ہم یہ کہیں کہ ایک اچھی میزبان کی حیثیت سے آپ ہمارے لئے کافی کا بندوبست کریں تو یقینی طور پر آپ اپنے مہمانوں کی اس فرمائش کا برا نہیں مانیں گی۔“

”بالکل نہیں۔۔۔۔۔ میں ابھی کافی تیار کر کے لاتی ہوں۔“ نوشاہہ نے کہا اور باہر نکل گئی۔

”تب ان لوگوں نے مجھے دیکھا اور فاضل کمال نے تھکے انداز میں کہا۔“

”یہاں تم ضرورت سے زیادہ ہلکے ہو ٹائیگر کیا تمہاری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی کہ تمہیں ہمارے حکم کی تعمیل کرنی ہے، کسی بھی لمحے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے ہمیں اور تم ہو کہ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہاں ایک معزز انسان کی طرح سیاحت کے لئے آئے ہو۔“

”تم دوسری بار یہ بکواس کر رہے ہو فاضل کمال اور اسے پہلے بھی تمہارا رویہ میرے لئے ناخوشگوار رہ چکا ہے بہتر ہے کہ اپنے آپ کو ہوش میں لے آؤ، میں کسی بھی حیثیت کے انسان سے فضول باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔“

”اوہو کیا بے تکی باتوں کا آغاز ہو گیا، تم کچھ لمحوں کے لئے خاموشی اختیار کرو فاضل کمال۔“ شاہنواز نے کہا۔

”یہ شخص آخر مجھ سے کہنا کیا چاہتا ہے؟“

”نہیں چھوڑو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“

”اسے سمجھا دیا جائے کہ یہ میرے سامنے ہوش و حواس میں رہ کر گفتگو کرے چاہے یہ کسی بھی حیثیت کا مالک کیوں نہ ہو۔“

”میں کہتا ہوں آپ لوگ اس کی ناز برداریاں کیوں کر رہے ہیں، اگر مجھے اجازت دیں تو میں اسے سیدھا کروں۔“ فاضل کمال بولا اور اتنا میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنا

انہیں یہاں سے غائب کر دیا گیا ہے۔“

”شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو یہ بات میرے علم میں نہیں لائی گی لیکن یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ کوئی اجنبی نہیں ہو سکتے جنہوں نے یہ کام کیا ہے، بس تم یوں کر لو کہ ہم لوگ کافی پیٹے ہیں اور تم اپنا سفری بیگ تیار کر لو۔“

”کیا مطلب، کیا اسی وقت۔“ میں نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔

”ہاں ابھی اور اسی وقت۔“

”اور کیا نوشاہ میرے ساتھ جائے گی؟“

”نہیں“ اس وقت ایسا ممکن نہیں ہے، اور تم سمجھتے ہو کہ یہ اس کے حق میں بھی مناسب نہیں ہو گا۔“

”نہیں میرے دوست اگر تم چند دن کے خوبصورت خواب دکھا کر اب نوشاہ سے دور کر دینا چاہتے ہو تو تم یہ سمجھ لو کہ یہ میری زندگی کی قیمت پر بھی ممکن نہیں ہے۔“

”میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا کہ ہمیں کہیں اور سے ہدایات ملتی ہیں، ہم مجبور ہیں۔“

”سنو یہاں اپنی مجبوریوں سے سمجھوتہ نہ کرو، کیونکہ میں نوشاہ کے بغیر یہ سفر نہیں کروں گا۔“

”دیکھو اس سے پہلے میں تمہارے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرتا رہا ہوں لیکن یہ ذرا مختلف ہے۔“

”کچھ بھی سمجھو۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور وہ کچھ لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے، تم رکو، میں ذرا ان دونوں سے مشورہ کر لوں۔ ہم لوگ اپنی کافی وہیں پی لیں گے۔“ کچھ دیر کے بعد نوشاہ کافی کی ایک پیالی لئے ہوئے میرے پاس آگئی اور اس نے متفکر لہجے میں کہا۔

”وہ لوگ شاید تمہارے ساتھ کہیں جانے کی بات کر رہے ہیں میں نے ان کی گفتگو میں کچھ الفاظ سنے ہیں، اور وہ لوگ الگ کمرے میں کیوں چلے گئے ہیں؟“

”وہ مجھے کچھ عرصے کے لئے باہر لے جانا چاہتے ہیں تمہارے بغیر۔۔۔۔۔!“

”آہ نہیں، یہ تو۔۔۔۔۔ یہ تو، یہ تو ممکن نہیں ہو گا، اب جبکہ میں۔۔۔۔۔“ لیکن ابھی نوشاہ کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ تینوں ہی واپس آگئے اور فیروز جاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”پھر طیارے میں وہ تینوں اگلی والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے، جیٹ طیارہ تھا اور میں اور نوشاہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے اس سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور میری نگاہیں بادلوں کو دیکھ رہی تھیں، میرے ذہن میں اس وقت ایک مشکل خیال رقصاں تھا۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ ایک بار انہوں نے میری ضد سے مجبور ہو کر میرے ساتھ جلال خان کو بھی فرار کا موقع دیا تھا اور اس کے بعد جلال خان کو ختم کر دیا گیا تھا اور مجھ سے معذرت کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ میری ضد سے وہ مجبور ہو گئے تھے، کیا اس وقت نوشاہ کے لئے بھی کوئی ایسی ہی بات سوچی گئی ہے۔ میرے بدن میں انگارے سے بھر گئے اور میں نے دل میں سوچا کہ اگر ان لوگوں نے نوشاہ کے ناخن کو بھی نقصان پہنچایا تو میں زندگی ان کے لئے اتنی مشکل کروں گا کہ شاید انہوں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا ہو گا اور یہ بات میں ان لوگوں کو بتا بھی دینا چاہتا تھا، لیکن جیٹ کا سفر بہت زیادہ طویل نہیں نکلا، وہ ایک ایئر پورٹ پر جب نیچے اترا تو ہر طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ ٹرمینل سے باہر آ کر فیروز جاہ نے کہا۔

”تم لوگوں کے لئے ایک فائو اسٹار ہوٹل میں کمرہ مخصوص ہے لیکن براہ کرم وہاں پہنچنے کے بعد کمرے میں ہی قیام کرنا، یہ ایک مجبوری ہے، میں تم سے موقع ملتے ہی رابطہ قائم کروں گا۔“ پھر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”اس میں کچھ رقم وغیرہ ہے اخراجات کے رکھ لو۔“

”یہ ہوٹل جو ہمارے لئے مخصوص کیا گیا تھا بلاشبہ انتہائی خوبصورت تھا سمندر کے کنارے ناریل کے درختوں سے گھرا ہوا، لابی کے بالکل سامنے سو منگ پول تھا اور یہاں زندگی رواں دواں تھی حسین لڑکیاں اور کشادہ سینے والے مرد، ہر غم سے آزاد زندگی کا

لطف لے رہے تھے۔ ہمارا یہ کمرہ بارہویں منزل پر تھا اور سمندر کا ساحل انتہائی گہرائیوں میں پھیلا ہوا تھا نیلا سمندر دور تک عجیب نظر آ رہا تھا اور یہاں پہنچنے کے بعد جب وہ لوگ چلے گئے تو نوشابہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟“

”کیا مطلب.....؟“

”بس یوں سمجھ لو کہ میری ایک اور خواہش پوری ہو گئی ہے۔ یہاں میری ایک بہت گہری دوست رہتی ہے، کافی عرصے سے میرا اس سے رابطہ ختم ہو چکا ہے، مجھے اس کا فون نمبر یاد ہے کیا میں اس سے بات کر لوں.....؟“

”مالی ڈیئر نوشابہ تم نے شاید اس دوران میرے اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سنی۔ تم اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں ایک مخصوص ملزم ہوں اور ہم یہاں جعلی ناموں اور جعلی پاسپورٹوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”لیکن میری سہیلی کبھی یہ بات ظاہر نہیں کرے گی کہ۔۔۔۔۔“

”ضد نہ کرو، فیروز جاہ ابھی ہر بات کو چھپانا چاہتا ہے ذرا صبر کرلو، تم بعد میں اس سے بات کر لینا، یہ کام اتنا ضروری نہیں ہے۔“

”ضروری ہے۔۔۔۔۔ میں اس سے۔۔۔۔۔“

”سنو، میرا خیال ہے تم ایک بے مقصد ضد کر رہی ہو، جاؤ جب میں نے تمہیں منع کر دیا ہے تو ضد نہ کرو۔“

”بہر حال وہ چند لمحات میری صورت دیکھتی رہی اور اس کے بعد اٹھ کر واش روم میں چلی گئی لیکن جب وہ واش روم سے واپس آئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے چہرے کو اچھی طرح دھویا ہے اور اس کی آنکھوں پر ہلکا سا ورہ ہے، غالباً ہاتھ روم میں جا کر وہ روئی ہے، البتہ میں نے اس وقت اپنی فطری ہمت سے کام لیا تھا، کسی لڑکی کا رونا شاید عام لوگوں تو متاثر کر سکتا ہے، لیکن میں اتنا کچا اور کمزور نہیں تھا، البتہ محبوبہ کو منانے کا فن مجھے آتا تھا۔“

”دوسرے دن صبح آٹھ بجے فون کی گھنٹی بجی اور میں جاگ گیا۔ نوشابہ بدستور گہری

نیند سو رہی تھی، ہم رات کو بہت دیر سے سوئے تھے، میں نے نوشابہ سے جو سخت لہجہ اختیار کیا تھا اس کا ازالہ کرتا رہا تھا۔ البتہ پھر میں آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور فون کی جانب بڑھ گیا، لیکن دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز کچھ اجنبی سی محسوس ہوئی تھی اور اسے میں کچھ لمحے پہچان نہیں سکا تھا۔ اس نے کہا۔

”ہوٹل کے سامنے کے دروازے سے باہر نکلو، سڑک پار کرو، دور سے تمہیں ایک پارک نظر آتا ہے اس پارک کے دائیں جانب کنارے کنارے کوئی تقریباً دو سو گز آگے بڑھو، اب سے ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد وہاں تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے اور سنو ہر بات کی ضد نہیں کرتے، تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے، جو کچھ کہا گیا ہے وہی کافی ہے، خیال رکھنا۔۔۔۔۔ اور اس کے فوراً بعد فون بند ہو گیا تھا، لیکن میرے ذہن میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔“

”کیا یہ حکم ہے، یہ عورت کی آواز۔۔۔۔۔ اس نے مجھے میرے نام تک سے مخاطب نہیں کیا کیا کرنا چاہیے مجھے، اس حکم کی تعمیل کروں یا۔۔۔۔۔ لیکن پھر دماغ تھوڑا سا ٹھنڈا ہوا وہ لوگ میری مدد کر رہے ہیں اور بہر حال انہوں نے اب تک جو کچھ بھی کیا ہے، بظاہر اس میں مجھے اپنی بہتری ہی نظر آئی ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حسین نوشابہ میرے بالکل قریب ہے اور ہم زندگی کے شب و روز سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، چنانچہ دانش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور ان کی ہدایت پر عمل کیا جائے ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا اور اس ایک گھنٹے میں۔۔۔۔۔ میں با آسانی تیار ہو سکتا تھا۔ نوشابہ کا سوتے رہنا مناسب تھا کیونکہ عورت سوالات کرنے سے کبھی باز نہیں آتی۔ میں نے واش روم میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تیار ہوتے میں تو زیادہ وقت نہیں لگا لیکن بس نوشابہ کی طرف سے الجھن تھی وہ بدستور سو رہی تھی اگر اسے جگا کر سمجھانے کی کوشش کروں تو دیر بھی ہو سکتی ہے اور بہر حال ابھی میں ان لوگوں کے چنگل میں تھا۔ ان سے منحرف ہونے کا مطلب اب اچھی طرح میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ نوشابہ کو پیار سے سمجھنا لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چنانچہ میں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

”باہر کے موسم میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے دور ہی سے فیروز

”یقیناً تم نے ابھی ناشتہ نہیں کیا ہوگا“

”ہاں“ میں تمہارے فون کی آواز پر جاگا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”خیر..... مجھ سے ہدایات لے کر تم واپس جاؤ گے اس کے بعد نوشاہی سے کوئی مناسب بہانہ کر کے باہر نکلو گے اس جگہ سے ایک کلومیٹر پیدل سفر کر کے تم بلوار تھ نام کے ایک اسٹور پر پہنچو گے جہاں تمہیں سفید اور نیلے رنگ کی ایک کار کھڑی نظر آئے گی۔ اس کی سیٹ پر تمہیں ایک شناسا شکل بیٹھی ملے گی۔ تم سمجھ رہے ہو۔ بس تمہیں اس کے ساتھ سفر کرنا ہے۔“

”سفر.....؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں۔“

”کوئی طویل سفر.....“

”شاید نہیں۔ کام زیادہ طویل نہیں ہوگا۔“

”اور وہ شناسا شکل.....؟“ میں نے سوال کیا۔

”خدا حافظ!“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میرے وجود میں ایک لمحے کے لئے گرم لہریں دوڑی تھیں۔ میں نے ایسی بے اعتنائی کبھی برداشت نہیں کی تھی لیکن مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ کچھ عرصے کے لئے خود کو بھول جاؤں۔ اب اس حد تک آنے کے بعد ضروری ہے ہوٹل واپس پہنچا نوشاہی بدستور سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگایا لیکن یہ اظہار نہیں کیا کہ میں باہر کا سفر کر کے آیا ہوں البتہ مقررہ وقت پر میں اسے سمجھا بجا کر ہوٹل سے نکل آیا تھا۔ پھر میں نے یہ پیدل سفر کیا۔ اس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ اس سفر میں وہ یہ اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ کوئی مجھ پر نگاہ تو نہیں رکھے ہوئے ہے۔ شاید وہ مطمئن ہی ہوں گے کیونکہ مجھے مطلوبہ کار نظر آگئی اور جس شکل نے میرا استقبال کیا وہ بھی شناسا ہی تھی، یعنی شاہنواز۔

”میں نے اس کے ساتھ کار کا سفر شروع کر دیا۔ شاہنواز بالکل خاموش تھا لیکن کچھ لمحوں کے بعد اس نے اچانک بولنا شروع کر دیا۔ ”ہمیں واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

جو طریقہ کار ہم نے سوچا ہے اس کے دو حصے رکھے گئے ہیں۔ اگر ہمارا پہلا مرحلہ کامیاب نہیں ہوا تو ہم دوسرے مرحلے پر کام کریں گے۔“

”یہ آواز گویا کسی مشین سے نکلی تھی۔ نکلی اور خاموش ہو گئی۔ کار کا سفر ایک وسیع میدان پر ختم ہوا جس کے بیچوں بیچ ایک ہیلی کاپٹر کھڑا ہوا تھا۔ شاہنواز نے میدان کے سرے پر کار روکی اور پھر مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے ہیلی کاپٹر کی طرف چل پڑا۔ پلٹ اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ ہمارے بیٹھے ہی ہیلی کاپٹر کے خود کار دروازے بند ہو گئے۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اوپر اٹھ رہا تھا اور مجھے نہ جانے کیوں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب تک جس مقصد کے لئے اتنی ہنگامہ آرائی ہوئی ہے وہ اپنے آخری مراحل میں ہے۔“

زندگی میں لاتعداد اپنے کام کئے تھے اور کبھی بھی ان کی کوئی حیثیت نہیں سمجھی تھی۔ بیشتر یہ بات معلوم ہوتی تھی کہ فلاں شخص کو قتل کرنا ہے یا فلاں علاقے کو بم سے اڑانا ہے، کسی جیلے کو منتشر کرنا ہے یا کچھ بھی کیا جانا ہے لیکن کبھی بریفنگ کے بعد اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں کہ یہ کام کیسے کیا جاسکتا ہے لیکن ہر انسان اپنے اندر ایک کمزوری رکھتا ہے، نوشاہی کی اس قدر قربت حاصل ہونے کے بعد یہ سوچیں میری زندگی میں شامل ہو گئی تھیں اور اس وقت ہیلی کاپٹر میں سفر کرتے ہوئے میں ان سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہیلی کاپٹر سمندر پر پرواز کر رہا تھا اور مجھے گہرائیوں میں نیلا شفاف سمندر اور بلند یوں پر بادلوں سے محفوظ آسمان نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد نیچے پانی کی ہموار اور پرسکون سطح پر رنگ برنگی کشتیاں تیرتی نظر آئیں اور مجھے یہ احساس ہوا کہ تھوڑا سا خالی سمندر طے کرنے کے بعد ہیلی کاپٹر اب شاید کسی جزیرے پر پرواز کر رہا ہے، اس دوران شاہنواز مکمل طور سے خاموش رہا تھا لیکن اس شخص کے اندر اچانک بول پڑنے کی عادت تھی۔ پرسکون ماحول میں اگر انسان کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہو اور شاہنواز جیسے آدمی کے ساتھ بیٹھا ہو تو اسے اپنے طور پر شاید خاموش رہنے کا کوئی حق نہیں حاصل ہوتا، وہ کہنے لگا۔

”بس کچھ لمحوں کے بعد ہم ایک ایسی جگہ اتر جائیں گے جسے تم کافی خطرناک جگہ کہہ سکتے ہو اور اس سمت کشتیاں نہیں آئیں۔ ہمیں کچھ دیر وہیں رک کر کام کرنا ہے۔“

میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا، کوئی سوال کرنا بھی نہیں چاہتا تھا، اپنے آپ کو

دی۔

”خدا کی قسم شاندار، اتنا شاندار کہ تصور نہیں کیا جاسکتا، پائلٹ واپس چلو۔“

میں نے وہ رائفل شاہنواز کو واپس تھادی اور اس نے اسے احتیاط سے محفوظ کر لیا پھر ہیلی کاپٹر کا رخ تبدیل ہو گیا اور اس کے بعد ہم خاموشی سے آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ زمین نظر آنے لگی۔ سمندر دور رہ گیا تھا، زمین پر سبزہ پھیلا ہوا تھا اور اس سبزے کے درمیان دور دور تک سفید دیواروں والے وسیع مکانات جن کی چھتیں سرخ ٹائلوں کی تھیں اور یہ سارے کے سارے مکانات ناریل کے درختوں میں گھرے ہوئے تھے، مکانوں کے وسیع و عریض احاطوں میں سو مئنگ پول بنے ہوئے تھے اور یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے بھی یہ مکانات بنائے ہیں وہ انتہائی صاحب حیثیت ہیں۔

ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ ان کے اوپر سے گزر رہا تھا اور نیچے بے ترتیب پہاڑیوں پر اونچے اونچے درخت جھول رہے تھے، چند لحوں کے بعد ایک بار پھر ہیلی کاپٹر بلند ہونے لگا اور اس کے لئے بھی شاہنواز نے کسی غیر مانوس زبان میں پائلٹ کو حکم دیا تھا، پائلٹ نے اس کے مطابق عمل کیا اور پھر دروازے کھل گئے، شاہنواز کی آواز ابھری۔

”اپنی سیٹ بکس کرلو۔“

میں نے اس کے مطابق اندازہ کیا اور پھر اپنی سیٹ بکس کر لی، شاہنواز نے کہا۔

”ہم یہاں دو سو فٹ کی بلندی پر ٹھہریں گے ہیلی کاپٹر بیس سیکنڈ تک فضا میں رکے گا اور اتنے وقت میں ہی تمہیں اپنا کام کر لینا ہو گا۔“

میں نے نیچے نگاہیں دوڑائیں نیچے پہاڑی قلعے پر اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا ایک احاطہ تھا، اس جگہ کو قلعہ ہی کہا جاسکتا تھا۔ غالباً پرانی طرز کی کوئی عمارت تھی لیکن کون سی جگہ تھی، کہاں تھی اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا، اطراف میں سر سبز گھاس سے گھرے ہوئے میدان پھیلے ہوئے تھے اور میدانوں کے درمیان سے ایک پتھر ملی سڑک گزر رہی تھی، درمیان میں ایک سو مئنگ پول تھا اور قریب ہی غالباً پولو گراؤنڈ بھی یا پھر آپ اسے گولف گراؤنڈ کہہ سکتے ہیں، میں اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

اندھا، گونگا اور بہرا بنائے رکھا اس وقت ایک بہتر مستقبل کی ضمانت تھا۔ شاہنواز پھر کہنے لگا۔

”اور یہ ہتھیار تمہارے لیے غیر مانوس نہیں ہے۔“ نجانے کہاں سے اس نے ایک رائفل نکالی تھی جسے ہم دنیا کی بہترین رائفل کہہ سکتے ہیں۔ وزن اور لمبائی کے اعتبار سے وہ رائفل کے برابر ہی تھی لیکن اس کا بیل انتہائی شاندار تھا، شاہنواز نے کہا۔

”یہ قطعی بے آواز ہے، ذرا اسے دیکھو۔“

”میں نے رائفل اس کے ہاتھ سے لے لی اور اسے شانے سے نکال کر نال باہر نکالی اور بیل کی سطح سے ملا دی، گویا میں نشانہ درست کر رہا تھا، پھر نجانے کونسی زبان میں شاہنواز نے پائلٹ سے گفتگو کی، میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آیا، ہیلی کاپٹر اچانک نیچے کی طرف جھٹکنے لگا، اور پھر اچانک کچھ دیر کے بعد وہ ایک خاص بلندی پر ٹھہر گیا۔” ہم یہیں ٹھہریں گے، یہ ہے وہ جگہ۔“

ہیلی کاپٹر پانی کی سطح سے کوئی سو فٹ اوپر تھا، پائلٹ نے غالباً شاہنواز کے اشارے پر کوئی مٹن دبایا اور میرے پاس والی سیٹ کا دروازہ کھل گیا۔ شاہنواز کی آواز ابھری۔

”تمہاری سیٹ گھومنے والی ہے، اسے جس طرح مناسب سمجھو گھماؤ پھر ہم لاک کر دیں گے۔“

میں نے جبکہ کر سیٹ کا بولٹ ہٹایا اور اسے کھینچ کر دروازے کے قریب کر لیا، یہاں سے پانی کا منظر صاف نظر آ رہا تھا، شاہنواز نے کہا۔

”یہ تمہارے ٹارگٹ ہیں۔“ اس نے ایک بڑے سے کارٹن کو کھول لیا تھا جس میں مختلف رنگوں کے ڈبے بھرے ہوئے تھے، اس نے ایک ایک کر کے یہ ڈبے پانی میں پھینک دیئے جو پانی کی سطح پر تیرنے لگے تھے چنانچہ شاہنواز نے کہا۔

”اب تم شروع ہو جاؤ یہ دس ڈبے ہیں اگر تم نے ان سب کو بیس شاش میں نشانہ بنالیا تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارے نمبر سو کے سو ہیں۔“ میرے لئے یہ الفاظ گویا گالی کے مترادف تھے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ گالیاں میں مسلسل سنتا رہوں گا، میں نے صرف دس شاش میں ان ڈبوں کو اڑا دیا اور شاہنواز کی خوشی سے تھراتی ہوئی آواز سنائی



کچھ لمحوں کے بعد شاہنواز نے پھر پائلٹ کو مخاطب کیا اور ذرا سی دیر کے بعد پہلی کاپڑ معلق ہو گیا۔

یہ ہو گی 'تمہاری پوزیشن' تمہارا شکار مکان سے سو منٹک پول کے درمیان اسی سڑک پر کہیں ہو گا' ہمیں اس کے مغمولات کا بخوبی علم ہے اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہارے پاس صرف بیس سیکنڈ ہوں گے جس انداز میں تم رانفل استعمال کر سکتے ہو اس اعتبار سے یہ وقت بہت کافی ہے۔"

میں خاموش تماشائی کی طرح اپنی سیٹ پر بیٹھا نیچے دیکھتا رہا تھا' میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا' تب شاہنواز نے کہا۔

"چلو واپس چلو۔" یہ الفاظ اس نے پائلٹ ہی کو مخاطب کر کے کہے تھے لیکن میں نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس نے یہ الفاظ اپنی زبان میں کیوں نہیں ادا کئے تھے' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سلسلہ کیا ہے۔

لیکن اس کے بعد جب ہم واپس پلٹ کر ایک جگہ اترے تو وہاں میری ملاقات نانمہ شہابی سے ہوئی' یہ ایک خوبصورت سا مکان تھا اور اس مکان میں شاید اس وقت نانمہ شہابی کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا' یہ عورت بھی کچھ اس طرح کی فطرت کی مالک تھی کہ حسین ترین ہونے کے باوجود میرے لئے اس کی شخصیت ناپسندیدہ ہی تھی لیکن بہر حال اس نے بڑے خوشگوار انداز میں میرا استقبال کیا تھا۔

میرے ذہن میں اگر تھوڑی بہت حس لطافت تھی تو صرف نوشابہ کی حد تک' نوشابہ کے علاوہ نہ مجھے دنیا کی کسی عورت سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی کسی اور شخصیت سے' نانمہ شہابی بیشک ایک خوبصورت عورت تھی اور اس وقت اس نے کچھ اس عجیب سے انداز میں میرا استقبال کیا تھا کہ میں ایک لمحے کے لئے سوچتا رہ گیا تھا لیکن پھر میرے ہونٹوں پر ایک نفرت بھری مسکراہٹ پھیل گئی' زندگی جس انداز میں گزری تھی اس میں حسن و عشق کا تصور اگرچہ تھوڑا بہت تھا تو صرف نوشابہ کی حد تک اور اس وقت تو خاص طور سے میرے ذہن پر ایک جھلاہٹ سی سوار تھی' کتنے عرصے سے ان لوگوں نے یہ چکر چلایا ہوا تھا' کیسے کیسے کھیل کھیلے تھے' جیل میں زندگی گزار رہا تھا' نوشابہ کو یہ سوچ کر ہمیشہ

ہمیشہ کے لئے فراموش کر دیا تھا کہ میری منزل وہ نہیں ہے لیکن ان بدبختوں نے ایک بار پھر سے مجھے ایک عجیب و غریب مشکل میں لا ڈالا تھا ہر بار اس انداز میں باہر نکلتے تھے جیسے اب وہ کام آخری مرحلے میں ہو جس کے لئے انہوں نے اتنا طویل چکر چلایا ہوا ہے اور اس کے بعد پھر وہی ٹائیں ٹائیں فٹش' کوئی عمل ہی نہیں تھا' بہر حال نانمہ شہابی نے مجھ سے پوچھا۔

"اگر کسی شے کی حاجت ہو تو مجھے بتاؤ' میں تمہارے لئے تیار کر دوں' یہ ایک مکمل گھر ہے اور یہاں ہر شے موجود ہے۔"

"مجھے جس شے کی ضرورت ہے وہ تم مجھے مہیا نہیں کر سکو گی۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہو' کیا تم اپنی دوست نوشابہ کو طلب کرو گے؟" نانمہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! تمہارے زرخرے سے بننے والے خون کی دھار گلاس میں بھر کر پینا چاہتا ہوں' پیش کر سکو گی مجھے۔" نانمہ کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی' کچھ لمحے خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی۔

"ایسا ایک خنجر باورچی خانے میں موجود ہے بخدا اگر تم ایسا کرنا چاہو گے تو شاید میں تمہیں حیرت میں ڈال دوں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں خوشی سے تمہیں یہ پیشکش کروں کہ تم ایسا کر ڈالو۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا اور اس کے بعد وہاں سے نکل کر ایک اور کمرے میں پہنچ گیا' جہاں بستر پڑا ہوا تھا میں جوتوں سمیت بستر پر دراز ہو گیا اور اس کے بعد میرے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات ایک فلم کی مانند دوڑنے لگے' وہ شخص جو اپنے آپ شاہنواز کہلاتا تھا مجھے اس انداز میں لے گیا تھا' جیسے آج ہی مجھے اپنا کام کر لینا ہے' وہ لوگ میری نشانہ بازی کی مشق دیکھنا چاہتے تھے' میری مہارت کا اندازہ لگانا چاہتے تھے اور پھر وہ جگہ جس کے بارے میں شاہنواز نے مجھے بتایا تھا' آخر یہ سب کیا ہے' یہ لوگ ایسا کیوں چاہتے ہیں' وہ کون شخصیت ہو گی جسے اس انداز میں مجھے ہلاک کرنا ہو گا۔ کون لوگ ہوں گے وہ جو اس جگہ مل سکیں گے'

اصل میں بات وہی تھی کہ تجس میرے ذہن میں بے پناہ تھا لیکن ان کبھوس کا دائرہ کار اس قدر وسیع تھا کہ میں نے جہاں بھی اپنے طور پر کچھ کرنے کی کوشش کی وہاں ناکام رہا مجھے جلال خان اور ڈاکٹر فیضان کی موت یاد تھی، وہ تو شکر ہے کہ انہوں نے نوشاہی کے سلسلے میں وہ عمل نہیں کیا ورنہ میرے ذہن میں تو یہ خدشہ بھی موجود تھا، نوشاہی کے تصور کے ساتھ ایک بار پھر ذہن پر جھلاہٹ سوار ہو گئی لیکن پھر میں نے اپنے آپ پر خود ہی غور کیا، یہ دیوانگی جو بچپن سے میرے ذہن پر سوار ہو گئی ہے یعنی یہ کہ کچھ کر ڈالنا، بے شک تنظیم نے مجھے اس کی تربیت دی تھی لیکن صحیح بات یہ تھی کہ تنظیم کے خاتمے کے بعد نجانے کیوں صرف میری زندگی بچ گئی تھی یا نجانے میرے ساتھ کون ایسا ہو گا اگر میں زندگی میں کبھی مصلحت سے کام لیتا تو شاید میری شخصیت کا کوئی دوسرا ہی روپ ہوتا، ایسا کر کے دیکھنا چاہئے، تھوڑا بہت تو اپنے آپ کو تبدیل کرنا ضروری ہے اور اس وقت اس عمارت میں نامہ شہابی کے علاوہ بھلا اور کون تھا جس پر میں اپنی ذات کا یہ پہلا تجربہ کرتا، میں نہیں جانتا کہ عورت کس طرح رام ہو جاتی ہے لیکن جب میں نے نامہ شہابی کے پاس خود جا کر اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھی، عمارت کے بارے میں مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، وہ لوگ بھی شاید اس بات سے مطمئن تھے کہ اب میں نامہ شہابی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا کیونکہ نوشاہی مکمل طور پر ان کے قبضے میں ہے، نامہ شہابی نے ایک بار پھر استقبالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

”یقینی طور پر تم تنہائی سے اکتا گئے ہو گے، تنہائی سے بری چیز اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتی۔“

”اتفاق سے میں بہت سی ایسی چیزوں کا عادی ہوں جن سے لوگ بری طرح اکتا جاتے ہیں لیکن میں نہیں اکتا تا کیونکہ میری شخصیت میں انسانیت کم اور حیوانیت زیادہ ہے، میں اپنے آپ کو آدھا حیوان سمجھتا ہوں۔“ اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر بولی۔

”کسی شے کی ضرورت ہے؟“

”ہاں، اب میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہو، براہ کرم بیٹھو۔“ اس نے کہا اور میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا، نامہ کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ مجھے نمایاں محسوس ہو رہے تھے پھر وہ عجیب سے لمبے میں بولی۔

”ٹائیگر کے علاوہ تمہارا کوئی اور نام ہے۔“

میں نے ایک بار پھر غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن اس وقت مجھے اس سے کوئی کام لینا تھا چنانچہ میں نے خود کو سنبھال لیا اور کہا۔

”اگر ٹائیگر کے علاوہ میرا کوئی اور نام ہے تو تم یوں سمجھ لو کہ میں نے اسے ہمیشہ کے لئے ذہن سے کھرچ پھینکا ہے اور یقین کر لو کہ اب وہ نام مجھے یاد نہیں ہے۔“

”خیر ناموں سے کیا ہوتا ہے، ٹائیگر! تمہاری زندگی کے بارے میں جتنی معلومات مجھے حاصل ہو چکی ہیں ان کے تحت بہت سے سوالات کئی بار میرے ذہن کے پردوں پر ابھرے لیکن میں جانتی تھی کہ ان سوالات کا جواب مجھے زندگی میں کبھی نہیں مل سکتا، اب اس وقت تم آئے ہو، بیٹھے ہو تو مجھے تم سے کچھ کہنے کی جرات ہوئی ہے کہ تم نے تنظیم میں شامل رہ کر جو کچھ کیا اس کی تفصیلات میرے پاس موجود ہیں مگر مجھے ایک بات پر حیرت ہوتی ہے کہ تم نوشاہی کے لئے اپنے دل میں اتنا گداز کیسے رکھتے ہو، کہا یہ جاتا ہے کہ سنگدل کی آنکھ سے آنسو نہیں بہتے لیکن سنگدل کا لفظ جو ہے صرف انسانی زبان کی تراش ہے، دل کبھی پتھر کا نہیں ہوتا اور اس کا ثبوت تم سے ملتا ہے، تمہارے دل میں نوشاہی کے لئے گداز موجود ہے، اس کا مقصد ہے کہ تمہارے سینے میں دل کے وجود کا پتہ لگتا ہے۔“

”دیکھو نامہ بہت برا لگتا ہے مجھے، الفاظ میں طوالت اختیار کرنے کا اور بہت اچھا لگتا ہے یہ کہ ایک لفظ میں مطلب کی بات کہہ دی جائے۔“

”تم ان لوگوں کو کیا سمجھے ہو جو تمہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔“

”انہیں سمجھنے کے لئے ہی میں تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”اور اگر میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں تو مجھ پر یقین کر لو گے۔“

”اگر تم چاہو۔“

”تو ٹھیک ہے، میں تمہیں اس وقت یہ بتائے دیتی ہوں کہ میں بے حد خطرے میں

ہوں، میں نہیں جانتی کہ ڈرائنگ روم کی کون سی شے ایسی ہے جو اصل میں ریوالور کی نال ہو اور کوئی اسے ریموٹ سے آپریٹ کر رہا ہو جیسے ہی میرے منہ سے کوئی غلط لفظ نکلے فوراً ہی میری پیشانی کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یہاں اس ڈرائنگ روم میں کون کون سی جگہ ایسے آلات نصب ہیں جن پر ہماری گفتگو میں جگہ سنی اور ریکارڈ کی جا رہی ہو لیکن ایک بات فوراً سن لو وہ لوگ تم سے مخلص نہیں ہیں اگر میرا سینہ اور دماغ گولیوں سے چھلنی ہو جائے تو تم یہ ضرور سوچ لینا کہ تم بھی ان سے محفوظ نہیں ہو۔“

میں نے شاید زندگی میں پہلی بار ایک ٹھنڈی لہر اپنے وجود میں دوڑتی ہوئی محسوس کی تھی۔ بہت سے احساسات کبجنت اب جا کر جاگ رہے تھے جن سے میں مکمل طور پر ناواقفیت رکھتا تھا، وہ بھی عجیب سے انداز میں میری صورت دیکھ رہی تھی اور اس کا انداز ایسا تھا جیسے جو کچھ کہہ رہی ہے اس کے رد عمل کی منتظر ہو لیکن کہیں سے کوئی گولی نہیں چلی اور کسی آواز نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تو اس نے پھر کہا۔

”ہاں تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے یہ تمہارے خلاف نہیں بلکہ ایک بہت بڑی شخصیت کے خلاف ایک خطرناک سازش ہے، اس شخصیت کو جسے یہ لوگ قتل کرنا چاہتے ہیں اس کو ملک میں بہت بڑی حیثیت حاصل ہے اور وہ شخصیت ایک دہشت گرد گروپ کے خلاف ایسے شواہد جمع کر رہی ہے جو ملک میں بد امنی پھیلانا چاہتا ہے اور اس بد امنی کو پھیلانے کے لئے بڑے اعلیٰ پیمانے پر کام کیا جا رہا ہے، وہ لوگ ایک بیرونی ملک کے اشارے پر بے پناہ دولت صرف کر کے اپنا دائرہ کار بے حد وسیع بنا چکے ہیں اور اب میرے بارے میں تم یہ سن لو ٹائیگر کہ میں اصل میں سیکورٹی کی رکن ہوں، میرا تعلق اسٹیٹ سیکورٹی سے ہے اور میری ڈیوٹی ایسے لوگوں پر لگائی تھی جن کے بارے میں حکومت کو یہ شبہ تھا کہ وہ انٹرنی اسٹیٹ ہیں اور ملک و ملت کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔

میں اپنی ڈیوٹی کو نہایت کامیابی سے سرانجام دیتی ہوئی ان میں شامل ہو گئی وہ دہشت گرد گروپ جس کے تم رکن تھے ختم ہو گیا تھا لیکن ان لوگوں کے پاس ابھی تمہارے جیسے تربیت یافتہ لوگ موجود نہیں ہیں ان کے پاس تمہارے بارے میں کسی طرح رپورٹ پہنچ

گئی اور انہوں نے اپنے طور پر اپنے اختیارات وسیع کرنا شروع کر دیئے، دولت کے بل پر انہوں نے یوں سمجھ لو کہ ہر جگہ اپنے آدمی داخل کر دیئے یا جو لوگ پہلے سے وہاں موجود تھے انہیں خرید لیا اور اس کے بعد انہوں نے تم پر ہاتھ ڈالا، تمہیں جس شخصیت کو قتل کرنے کی مشق کرائی جا رہی ہے اس کے قتل سے اس ملک میں ایک شدید اور خوفناک بحران پیدا ہو گا، وہ شخصیت بے شک براہ راست سیاسی شخصیت نہیں ہے لیکن، لیکن۔۔۔۔۔

”نامہ شہابی جملہ اوصورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔

میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا، مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ نامہ شہابی اس وقت کسی ایسے جذبے کے تحت بول رہی ہے جس میں بے بسی اور بے کسی ہے اور ایک غم آلود کیفیت بھی ہے البتہ اس کیفیت کو میں مکمل طور پر سمجھ نہیں پایا تھا، وہ کچھ لمحات کے لئے رکی پھر بولی۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اب تک ان لوگوں نے تمہاری تمام باتیں مان لی ہیں اور ہر طرح سے تمہارا تحفظ کر رہے ہیں تو براہ کرم یہ خیال ذہن سے نکال دو، وہ جس قدر خطرناک ہیں اور انہوں نے اپنے نیچے جتنی دور دور تک گاڑ رکھے ہیں، مجھے اور تمہیں دونوں کو اس بارے میں معلوم ہے، چنانچہ وہ کسی ایسے شخص کو زندہ نہیں چھوڑیں گے جو ان کے خلاف ہونے والی کسی سازش میں شریک ہو جائے کیونکہ بہر حال انہیں اپنی بقاء کا بھی خیال ہو گا، اس کے لئے میں تمہیں بتاؤں ڈیر ٹائیگر کہ وہ لوگ صرف تم سے چوہے اور بلی کا کھیل کھیل رہے ہیں اصل میں وہ جس ٹارگیٹ کو استعمال کرنا چاہتے ہیں اس میں ابھی کچھ ایسی قباحتیں ہیں جس کی بناء پر وہ یہ وقت صرف کر رہے ہیں، تم سے کام لینے کے بعد سب سے پہلے وہ تمہارا ہی خاتمہ کریں گے یا پھر اگر تم سے کوئی کام نہیں بن سکا تو وہ نوشاہہ کے ذریعے تمہیں مجبور کرنے کی کوشش کریں گے، یہ کارڈ ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔“ میں خاموشی سے نامہ شہابی کی صورت دیکھتا رہا پھر میں نے کہا۔

”نامہ۔۔۔۔۔ تم نے اس وقت جو گفتگو کی ہے تمہیں خود بھی اندازہ ہو گا کہ مجھے اس پر حیرت ہونی چاہئے، بیشک تم نے خود کو سیکورٹی کا فرد بتایا ہے لیکن تمہارا کیا خیال ہے، کیا

میں اس بات پر یقین کر لوں؟“

”میرے پاس کوئی اہم ثبوت نہیں ہے، یہ ایک چھوٹا سا ثبوت میں تمہیں دے رہی ہوں اگر اس پر یقین آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ جیسے تم پسند کرو۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر تھوڑے فاصلے پر رکھے ہوئے ایک ہینڈ بیگ سے اس نے ایک چوکور سی شے نکالی، اتنا چھوٹا ٹیپ ریکارڈر میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس نے ٹیپ ریکارڈر میرے سامنے رکھا، کیسٹ شاید ریوائنڈ کیا ہوا تھا اس کیسٹ پر آوازیں ابھرنے لگیں، ننھے سے ٹیپ ریکارڈر کی یہ آوازیں خاصی نمایاں تھیں، میں نے پہلی آواز کو پہچانا وہ فیروز جاہ تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

”فاضل کمال کیا تمہیں نائمہ شہابی کے بارے میں علم ہو گیا؟“

”آہ! میں تمہیں یہی بتانے والا تھا وہ سیکورٹی کی فرد ہے اور میں اس کا شجرہ معلوم کر چکا ہوں، وہ بے حد خطرناک ہے اور نہایت کامیابی سے ہمارے ہر پہلو سے آگاہ ہو چکی ہے۔“

”اے ختم کر دو۔“

”یقیناً..... ہمیں ایسا ہی کرنا ہے لیکن ابھی کچھ وقت ایسا نہیں کیا جاسکتا۔“

”کیوں؟“

”وہ اب سے چند لمحوں کے بعد واپس آ رہا ہے، نائمہ کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ اس کو سنبھالے اور مقررہ وقت تک اس پر کنٹرول رکھے، اس وقت ہمارے پاس نائمہ کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں ہے، ہاں اتنا کیا جاسکتا ہے کہ نائمہ کو پوائنٹ سے ہٹنے نہ دیا جائے اور پوری طرح یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ اب وہ ہمارے بارے میں مزید کوئی رپورٹ کسی کو نہ دے سکے۔“

”اس کا تمام سامان اپنے قبضے میں کر لو، اول تو اسے اس بات کا احساس نہیں ہونا چاہئے اور اگر ہو جائے تو پھر اسے سختی سے آگاہ کر دو کہ اس کی ایک غلط حرکت اس کے پورے خاندان کو ختم کر دے گی، اس کا پورا خاندان یرغمال بنا لیا جائے اور اس کام میں ایک لمحہ نہ ضائع کیا جائے۔“ کیسٹ ختم ہو گیا، میں خاموشی سے یہ الفاظ سن رہا تھا یہ ایک

مکرمی چال بھی ہو سکتی تھی اور حقیقت بھی، میں نے نائمہ سے اس بارے میں چند سوالات کئے اور وہ مجھے بتانے لگی کہ یہ ٹیپ ریکارڈر اس نے اصل میں کہاں چھپا کر رکھا تھا اور کس طرح یہ گفتگو ریکارڈ ہو گئی، اس کے بتائے ہوئے الفاظ تسلی بخش تھے چنانچہ میں نے کہا۔

”اور اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”نہیں..... میرا کھیل ختم ہو چکا ہے اور میرے خاندان کے لوگ ان کے پاس یرغمال ہیں، میں اگر اپنے بچاؤ کے لئے کوئی کوشش کرتی ہوں تو وہ انہیں قتل کر ڈالیں گے، میں جانتی ہوں کہ میری زندگی ختم ہونے کے بعد انہیں ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی چنانچہ بہتر ہے کہ وہ مجھے اپنے منصوبے کے مطابق قتل کر دیں، ہاں اگر تم کسی طور اپنا تحفظ کر سکتے ہو تو ضرور کر لو، وہ لوگ قابل اعتبار نہیں ہیں۔“ نائمہ کی بات پر مجھے یقین آ گیا تھا چنانچہ جب مجھے فائل میٹنگ کے لئے طلب کیا گیا اور انہوں نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دیتے ہوئے مجھ سے کہا کہ بس اب کچھ وقت گزر رہا ہے کہ مجھے یہ کام کر ڈالنا ہے تو میں نے ان سے صاف انکار کر دیا۔

”نہیں مجھے تم لوگوں سے یہ تعاون منظور نہیں ہے۔“ وہاں جتنے افراد موجود تھے ان سب کے منہ حیرت سے کھل گئے، فاضل کمال معمول کے مطابق سرخ ہو گیا اس نے شدت جوش میں کہا۔

”تمہارے تو فرشتے بھی کریں گے، پتہ ہے ہم سب رائفل کی ٹال کے نشانے پر ہیں اور اب ہم اس منصوبے سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے اور منصوبہ تمہارے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔“

”تم سب جہنم میں جاؤ، میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے وہ میرا آخری فیصلہ ہے اور یہ سمجھ لو کہ کوئی بھی کوشش اس میں ترمیم نہیں کر سکتی۔“ وہ لوگ ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے پھر فیروز جاہ نے گردن ہلا کر کہا۔

”کوئی بھی ایسا کام جو ایک مشترکہ حیثیت رکھتا ہو کسی کے انکار کر دینے سے مکمل نہیں ہوتا، ہم تمہیں سوچنے کا انتہائی معقول موقع دے رہے ہیں، کیا سمجھے.....! کیا تم ہمیں

میری آنکھ کھلی اور وہ بھی اس وقت جب سورج کی تیز روشنی راستے تلاش کرتی ہوئی اندر آگئی تھی اور اس نے کمرے پر قبضہ جمالیا تھا، میں جاگا تو گزرے ہوئے واقعات یاد آ گئے اور میں نے گردن گھما کر نوشابہ کو تلاش کیا جو بستر پر موجود نہ تھی یہ دیکھ چکا تھا کہ یہ گھر ہر طرح سے ایک مکمل گھر ہے، ہو سکتا ہے نوشابہ کچن میں ہو۔ میں نے پراٹمینان انداز میں غسل کیا، لباس بدلا، نوشابہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی، پھر نجانے کیوں اچانک ہی میزا دل دھک سے ہو گیا اور میں نے دوسرے انداز میں سوچا، میں نے نوشابہ کو پورٹی عمارت میں تلاش کر ڈالا لیکن وہ موجود نہیں تھی، میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی، آہستہ آہستہ ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ مجھے مجبور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور انہوں نے بڑا صحیح حربہ آزمایا تھا۔ میں دیوانگی کے انداز میں سر پٹختے لگا، کسی نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں قائم کیا تھا، میں گھر سے باہر بھی نکل جاتا تھا ادھر ادھر گھومتا پھرتا تھا، ہر وہ جگہ میں نے تلاش کر ڈالی تھی جہاں ان لوگوں میں سے کوئی یا پھر نوشابہ مجھے نظر آجائے۔

چار پانچ دن اسی طرح گزر گئے اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں، میں آدھی آدھی رات تک سڑکوں پر گھومتا پھرتا رہا تھا اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اب میری فطرت میں دیوانگی کے بجائے خوف اور مایوسی پیدا ہوتی جا رہی ہے، کئی بار میرا دل چاہا کہ میں کسی پولیس اسٹیشن چلا جاؤں، اپنے بارے میں تفصیل بتاؤں اور نوشابہ کی تلاش کے لئے پولیس سے مدد طلب کرو، دو تین بار میں پولیس اسٹیشن کے سامنے رکا اگر میں ان کی سازش پولیس کو بتا دوں تو یقینی طور پر میری مدد کی جائے گی۔

اس دن بھی میں پورے ارادے کے ساتھ پولیس اسٹیشن کی طرف چل پڑا تھا کہ اچانک ہی ایک کار میرے پاس آ کر رکی اور میری نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں، کار کی عقبی سیٹ پر نوشابہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے برابر ہی فاصلہ کمال اور سامنے صرف ایک ڈرائیور مبرا منہ کھلا ہی تھا کہ کار آگے بڑھ گئی اور میں بے اختیار اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ تھوڑی دور جا کر کار پھر رک گئی تھی۔ میں ہاتھ اٹھائے اس کے قریب پہنچا اور جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا ڈرائیور نے کار پھر آگے بڑھا دی، اس بار کار کی رفتار قدرے تیز تھی،

آئندہ کے لئے فیصلہ کرنے کا تھوڑا سا وقت دو گئے؟“

میں بھلا کسی کو کیا وقت دے سکتا تھا چنانچہ وہ سب اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے پھر فیروز جاہ ہی واپس آیا تھا اس نے کہا۔

”اصل میں ہم تمہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، ہمیں یہ بھی اندازہ ہے کہ تم نوشابہ کے بغیر کس قدر مضطرب ہو جاتے ہو، جاؤ مزید کچھ آرام کرلو، ابھی ہمارے پاس وقت ہے اور یہ پیش کش بھی کہ تم ہمارے لئے یہ کام ضرور کرو۔“ میرے ذہن میں تو خناس تھا، میں نے ان کی باتیں سنیں لیکن کوئی جواب نہیں دیا، آخر کار مجھے واپس اسی عمارت میں چھوڑ دیا گیا جہاں نامہ شبابی موجود تھی لیکن اس بار جس شخصیت نے میرا استقبال کیا تھا اسے دیکھ کر میں ایک لمحے کے لئے دنگ رہ گیا پھر میں نے دل میں سوچا کہ یہ لوگ واقعی شیطان کے چیلے ہیں اور جس گروہ میں، میں نے کام کیا تھا، اس کے خطرناک لوگوں سے کہیں زیادہ خطرناک، وہ نوشابہ تھی جو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی، باقی تفصیلات اس نے یہی بتائی تھیں کہ اسے یہاں بڑی عزت و احترام کے ساتھ پہنچایا گیا ہے اور اس سے پہلے بھی اس کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی گئی بلکہ نہایت ہی اچھے انداز میں اسے ان لوگوں نے اپنے ساتھ رکھا ہے، میں ان شیطانوں کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا پھر میں نے نوشابہ سے نامہ شبابی کے بارے میں پوچھا تو وہ چونک کر بولی۔

”کون نامہ شبابی! کیا یہاں کوئی اور عورت بھی رہتی تھی؟“ میں نے ایک لمحے کے لئے دل میں دکھ محسوس کیا لیکن بس ایک لمحہ اور اس کے بعد میں پرسکون ہو گیا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ نامہ شبابی کہاں گئی، نوشابہ کو میں نے کہہ سن کر بہلا دیا لیکن پھر میرے ذہن میں بہت سی سوچیں رقصاں ہو گئیں اور میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب مجھے اپنے تحفظ کے لئے کیا کرنا چاہئے، وہ شیطان تو چھلاوے تھے اور ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا نہایت مشکل تھا کب کیا کر بیٹھیں، کوئی نہیں جانتا تھا، بہر حال نوشابہ اتنے وقت کے بعد ملی تھی، ایک بار پھر میری ساری توجہ اس کی جانب ہو گئی، پرانے لوگوں کی کماوتیں غلط نہیں ہوتیں، عورت کی وجہ سے زندگی میں نجانے کتنے کھیل ہوئے ہیں۔

اس رات کھانے کے بعد جب ہم اپنے اپنے نیند پر جا کر سوئے تو شاید صبح ہی کو

میرے ذہن کی جو حالت تھی وہ میں الفاظ میں نہیں بتا سکتا۔ نجانے کتنا فاصلہ میں نے اس کار کے پیچھے دوڑتے ہوئے طے کیا یہی کیا جا رہا تھا، کار رکتی اور جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچتا وہ آگے بڑھ جاتی اور پھر کافی فاصلہ طے کر لیا گیا، شاید کسی ایک وقت میں کوئی انسان اتنی تیز رفتاری سے اتنی دور تک دوڑا ہو، میں تھک گیا تھا اور اب میرے قدم لڑکھڑاہے تھے۔

وہ کار اب میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ غالباً جو کھیل وہ کھیل رہے تھے ان کی دانست میں اب وہ ختم ہو گیا تھا میری اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ اب میں اپنے قدموں پر کھڑا بھی رہ سکوں، اور پھر اس وقت میں زمین پر ہی بیٹھ گیا تھا جب اچانک ایک کار پیچھے سے آئی۔ میرے قریب رکی اور پھر اس کے چاروں دروازے کھل گئے۔ ان میں سے چند افراد نیچے اترے اور انہوں نے مجھے اپنے قبضے میں کر لیا کسی نے میری گردن کی پشت پر ضرب لگائی تھی اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

پھر نجانے کب ہوش آیا، آنکھ کھلی تو چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، میں حیران سا تاریکی میں آنکھیں پٹپٹانے لگا اور میں نے حلق پھاڑ کر چیخے ہوئے کہا۔  
 ”کوئی ہے یہاں روشنی کرو، کیا میں اندھا ہو گیا ہوں، روشنی کرو، ورنہ میں یہاں موجود ہر چیز کو تباہ کر دوں گا۔“

میرے ان الفاظ کے ساتھ ہی اچانک روشنی ہو گئی اور میں نے اپنے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا، فیروز جاہ، فاضل کمال، پستہ قامت شاہنواز اور اس کے علاوہ دو تین افراد اور بھی موجود تھے۔ فاضل کمال نے کچھ کہنا چاہا تو شاہنواز نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور آہستہ سے بولا۔

”نانیگر! اب بھی اگر تمہیں اس بات کا یقین نہیں ہوا تو میں یہی کہوں گا کہ تم دیوانے ہو، اور پھر تم یقین کر لو کہ ہمارے پاس تمہیں ختم کر دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔“

”تم مجھے ختم کرنے کا ارادہ تو پہلے ہی رکھتے ہو“

”ہاں، ہمیں معلوم ہے، نانمہ شہابی نے تمہیں یہی بتایا ہے، لیکن بہر حال تم جو کچھ

بھی سوچو، ہم ایسا کریں گے نہیں بشرطیکہ ہمارا کام خوش اسلوبی سے ہو جائے اور تم اس انداز میں وہ سب کچھ کر ڈالو جو ہم تم سے چاہتے ہیں، ورنہ دوسری صورت میں تمہیں خود اندازہ ہو چکا ہو گا کہ تمہارے ہاتھ خالی ہیں، نانمہ شہابی ختم ہو چکی ہے کیونکہ یہ ضروری تھا، اس نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے تم یہ سمجھ لو کہ اب یہ مناسب نہیں ہے اور تمہیں وہ کام کرنا ہی ہو گا جو ہم چاہتے ہیں لیکن ایک بات تمہیں بتانا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ اب یہ تمہارے لئے آخری لمحات ہیں اور ہمارے لئے بھی کیونکہ وہ کام اب جلد از جلد ہو جانا چاہئے جس کے لئے ہم نے یہ لمبا چکر چلایا ہے اور اگر ہمیں اس میں شک و شبہ باقی رہتا ہے تو ضروری ہے کہ ہم کچھ اور بندوبست کریں، لیکن پہلے مرحلے کے طور پر ہم نوشابہ کی لاش کو تمہارے سامنے پیش کر دیں گے نوشابہ اس وقت جن لوگوں کے قبضے میں ہے انہیں ہدایات دے دی گئی ہیں یہ ضروری ہے کہ اب تم پوری بات ذہن نشین کر کے اپنا آخری فیصلہ ہمیں سنا دو۔“ میں نے خونی نگاہوں سے انہیں دیکھا پھر آہستہ سے کہا۔  
 ”میں تیار ہوں۔“

اس وقت اگر نفرتیں ریکارڈ کرنے والا کوئی آلہ ہوتا تو اس کی سوئی آخری حدوں کو پہنچ رہی ہوتی، ان سب کے لئے میرے دل میں اتنی ہی شدید نفرت تھی یہ لوگ بڑے صاحب اختیار تھے۔ ہر کام کر سکتے تھے، نانمہ شہابی نے مجھے ان کی تفصیل بتا دی تھی، وہ ایک عجیب کھیل کھیل رہے تھے اب تک انہوں نے دوبار مجھے زچ کیا تھا، جلال خان کو بیل سے نکالتے ہوئے انہوں نے اپنے وعدے کی جس طرح تکمیل کی تھی وہ مجھے معلوم تھا اسی طرح انہوں نے نوشابہ کے سلسلے میں بھی کیا تھا، لیکن اس بار صورتحال شاید ان کے حق میں نہ ہو۔

پھر اس کے بعد باقی معاملات چلتے رہے میں نے اپنا چولا ہی بدل لیا تھا۔ فیروز جاہ مجھے بریف کرتا تھا، ساری صورتحال بتاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب مجھے ان کے ساتھ کام کرنا تھا۔ اس رات مجھے کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا لیکن اس وقت میں گہری نیند سو رہا تھا اب انہوں نے مجھے جگایا اور مجھ سے کہا کہ میں تیار ہو جاؤں، کام کا آغاز ہونے والا ہے۔ میں نے ان کے ہر حکم کی تعمیل کی، باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ

”یہ ہیلی کاپٹر نہایت جدید ہے اور اس کے دروازوں کا نظام ویسا ہی ہے جیسا تم پہلے ہیلی کاپٹر میں تجربہ کر کے دیکھ چکے ہو“ اس لئے جیسے ہی تم اوپر پہنچو اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اسے صحیح پوزیشن میں رکھ کر لینا۔ ہم ٹھیک چھ بجے مارگٹ پر پہنچ جائیں گے وہاں اس کا وقت نہیں ملے گا۔“

ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے کے بعد شاہنواز نے بھی کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے۔ فاضل کمال پائلٹ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا ہیلی کاپٹر نے زمین چھوڑ دی اور شاہنواز نے مجھے وہ رائفل تھا دی۔

”رائفل مکمل طور پر چیک کی جا چکی ہے تمہیں صرف نشانہ لینا ہے جیسے ہی ہم لوگ وہاں پہنچیں گے دروازہ کھلے گا اور تم اپنا کام کر ڈالو گے“ پھر ہم فوراً ہی وہاں سے نکل جائیں گے جس شخص کو تمہیں نشانہ بنانا ہے وہ ایک مخصوص عمارت میں صبح کی ورزش کر رہا ہو گا ہو سکتا ہے اس کے معمولات میں اتفاقیہ تبدیلی پیدا ہو جائے جبکہ یہ اندازہ لگایا جاتا رہا ہے کہ وہ معمول کا پابند ہے اور کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے لیکن بہر حال ہمیں ہر بات کو مدناہ رکھنا ہے۔ اصل میں اتفاقیہ واقعات ہی ناکامیوں کا سبب بنتے ہیں تمہیں ہر قیمت پر اسے قتل کرنا ہے تمہارا نشانہ خطا نہیں ہونا چاہئے۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں جو ابلعل میں نے کیا تھا وہ بے حد سنگین تھا لیکن پھر بھی مجھے ایک عجیب سا احساس تھا پہلی بار، پہلی بار میں وہ کرنے والا تھا جو شاید میری زندگی کا سب سے خطرناک کام تھا میں آنکھیں بند کر کے آنے والے وقت کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

ہیلی کاپٹر کی رفتار بہت تیز تھی، درخت اب صرف تنکے نظر آ رہے تھے اور مشرق سے سورج ابھر رہا تھا کچھ لمحوں کے بعد صبح کی چمکیلی دھوپ میں نیچے وسیع احاطہ اور وہ اعلان نظر آنے لگا جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا، سورج کی کرنیں سو منگ پول کے پانی کو ہم کر چاندی کی جھیل بنا رہی تھیں، جیسے ہی یہ منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا ہیلی کاپٹر نے غوطہ لگایا میرے ہاتھ میں رائفل تھی میں نے ایک لمحے کے اندر اندر تھوڑا سا بدن کر کے یہ رائفل شاہنواز کی گردن پر رکھ دی اور شاہنواز کے دونوں ہاتھ پھیل گئے۔

پر ایک اجنبی چہرہ تھا۔ باقی فاضل کمال، فیروز جاہ اور شاہنواز تینوں موجود تھے۔ کار چل پڑی فیروز جاہ نے ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے اور اپنے قریب رکھے ہوئے ٹرانسمیٹر کا ڈائل گھمانے لگا۔ سڑکیں بالکل سناں تھیں۔ ابھی مکمل طور پر صبح کی روشنی نہیں ہوئی تھی کار کی رفتار بے حد تیز تھی اور سب مکمل طور پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے ان سب کی نگاہیں باہر کا جائزہ لے رہی تھیں جبکہ صرف فیروز جاہ بدھم لہجے میں اسی نامانوس زبان میں گفتگو کر رہا تھا جو نجانے کون سی زبان تھی میرا ذہن بے شک نیند سے جاگ چکا تھا لیکن پھر بھی مجھ پر ایک خمار سا طاری تھا اور اس وقت میں نے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا کار جن راستوں پر سفر کر رہی تھی وہ میرے لئے اجنبی تھے، سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت کھڑے ہوئے تھے اور قرب و جوار میں مکانات بکھرے ہوئے تھے خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد فیروز جاہ کی آواز نکلی۔

”بائی وے بند کر دی گئی ہے اور ہم نے ناکہ بندی کر لی ہے“ ایئرپورٹ کے علاقے میں بس ذرا صورتحال مشکل ثابت ہوگی کیونکہ وہاں ہم اپنے آدمیوں کو نہیں پھینا سکتے تھے۔“

کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا کار بائیں جانب مڑی اور پھر ایک میل کے بعد جنگل میں گھس گئی۔ گھنے درختوں کے درمیان گھری ہوئی بل کھاتی سڑک پر فاصلہ طے کیا جا رہا تھا اور اس کے بعد جنگل کے اسی علاقے میں ایک میدان سا نظر آیا جس کے پاس درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے صبح کا اجالا پھوٹ رہا تھا میں نے میدان میں ایک ہیلی کاپٹر کھڑا دیکھا انجن اشارت تھا اور پائلٹ اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ فیروز جاہ کے علاوہ باقی لوگ کار سے اتر آئے فیروز جاہ نے مسلسل ٹرانسمیٹر آن کر رکھا تھا اور کسی کو رپورٹ دیتا جا رہا تھا۔

پھر شاہنواز نے آگے جھک کر فیروز جاہ سے کچھ کہا اور اس کے بعد میری جانب رخ کر کے بولا۔

”آجیو“ میں نے خاموشی سے ہیلی کاپٹر کی جانب قدم آگے بڑھا دیئے تو شاہنواز کہنے لگا۔

”یہ کیا ---- یہ کیا کر رہا ہے، یہ کیا کر رہا ہے، کتے! کیا کر رہا ہے، کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے“

”پائلٹ سیدھے چلو، اور یہاں سے ہٹ کر کسی ایسی جگہ ہیلی کاپٹر اتار لو جہاں اسے اتار سکتے ہو، سمجھ رہے ہو، ورنہ۔“

”ہائیکر، ہائیکر! تو ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے تو جانتا ہے کہ نوشابہ ہمارے قبضے میں ہے۔“

”صرف ایک لمحے کے اندر اندر اگر تم نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی تو۔“ میں نے کہا اور اس کے بعد ہلکا سا ٹرگمر دبا دیا، لیکن فاصلہ کمال کو اس بات کا شبہ بھی نہیں تھا کہ شاہنواز کے بجائے میں اسے نشانہ بناؤں گا اس کی کھوپڑی اس طرح اڑی کہ بھیجا نکل کر ہیلی کاپٹر کے اسکرین پر بکھر گیا اور خون کی پھواریں اس طرح چاروں طرف پھیل گئیں کہ ہمیں اپنے چہرے صاف کرنے پڑے ہیلی کاپٹر لڑ گیا تھا میں نے پائلٹ سے کہا۔

”اگر تم ہیلی کاپٹر نہ سنبھال سکو تو بڑی خوشی کے ساتھ اسے کسی بھی پہاڑی، کم بھی درخت، کسی بھی جگہ زمین سے نکلرا دو، زندگی اور موت کا یہ کھیل بہت آسان ہے کوئی دقت نہیں ہوگی۔“

پائلٹ اپنے حواس کھوتا جا رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور وہ تیزی سے نیچے آنے لگا شاہنواز چیخ کر بولا۔

”سنبھالو اسے سنبھالو۔ میں کہتا ہوں اسے سنبھالو۔“ ہیلی کاپٹر ایک دم اتنا نیچے آ گیا کہ درختوں کی چوٹیاں تھوڑی سی بلندی پر رہ گئیں لیکن پھر پائلٹ نے ہیلی کاپٹر سنبھال لیا اور اس کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لینے لگیں۔ شاہنواز بھی اپنے اعصاب نہیڑ سنبھال پا رہا تھا اس کی زبان بند تھی، فاضل کمال کا بے سر کا بدن اس طرح ساکت تھا کہ جیت جیت ہوئی تھی وہ جتنی خاموشی سے مر گیا تھا وہ بات ناقابل یقین تھی ورنہ مرنے کے بعد بدن تھوڑی دیر تک تڑپتا ہی ہے۔ آخر کار ہیلی کاپٹر ایک گنجان آبادی میں غالباً کسی کرکٹ گراؤنڈ میں اتر گیا تھا ایسے گراؤنڈ میں جو عموماً علاقے کے رہنے والے کھیلنے کے لئے لیتے ہیں، ہیلی کاپٹر نیچے اتر آیا تو میں نے راقول سیدھی کی اور کہا۔

”چلو، نیچے اتر جاؤ، مسٹر شاہنواز! آپ کے پاس ٹرانسمیٹر سیٹ موجود ہے اگر چاہتے ہیں تو ایک لمحے کے اندر اندر فیروز جاہ کو ہدایت کریں کہ نوشابہ کو لے کر یہاں آ جائے۔ جگہ کی نشاندہی آپ خود کر دیں، کیونکہ میں ساری دنیا کو بھول چکا ہوں۔“

”ہل ---- لیکن، تم، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“

”گویا ابھی تم ہوش میں نہیں آئے۔“ میں نے کہا اور پائلٹ کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔

”اس کے بعد میں اسے ختم کر دوں گا اور پھر تمہاری باری ہے، بعد میں جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔“

پائلٹ نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جو یہ کہہ رہا ہے وہ کرو، میں مرنا نہیں چاہتا۔“

”لیکن ---- لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہو گا۔“

”شاہنواز! تم یہ کام کرو گے، کیا سمجھے؟“

میں نے کہا اور دوسرے لمحے میں نے پائلٹ کے سر کا نشانہ لے لیا۔

”نہیں دیکھو میرا اس میں ----“ پائلٹ نے یہ الفاظ ادا کئے لیکن اس کے بعد اس کے بدن پر گولیوں کے جو نشانے بنے ان میں کہیں کوئی ٹیڑھا پن نہیں تھا، وہ اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔ اور اس کے بعد شاہنواز کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کرے، میں نے اس سے کہا۔ ”اور جو کچھ کہو اس زبان میں کہو جو میری سمجھ میں آئے۔“

شاہنواز نے ٹرانسمیٹر میں کہا۔

”فیروز جاہ!“ میں نے باقاعدہ دوسری طرف کی آواز سنی۔

”ہاں۔ کیا تم مجھے مسرت کا پیغام دینا چاہتے ہو۔ وہ وقت تو ہو گیا ہے جب ہم کامیابی کی خبر سننے والے تھے۔“

”تم ایسا کرو، نوشابہ کو لے کر فوراً اس پتے پر پہنچ جاؤ، جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔“

”کیا بات ہے شاہنواز، تمہاری آواز میں۔“



دو سو گز کے فاصلے سے مجھے اس کی آواز صاف نہیں سنائی دے رہی تھی، البتہ کچھ مدھم مدھم سے الفاظ کانوں میں ابھرے تھے۔

”خود کو بچاؤ، خود کو بچاؤ، یہ شخص تنہا نہیں ہے۔“

ایک لمحے کے اندر تو میں صورتحال کو سمجھ نہیں سکا تھا لیکن دوسرے لمحے لیوزین سے کچھ گنیں برآمد ہوئیں فیروز جاہ کے عقب میں شاید کچھ لوگ اور چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے اور نوشابہ مجھے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ لیکن ابھرنے والی گنوں نے نوشابہ کو نشانہ بنایا اور اس کے پورے بدن میں سوراخ ہو گئے۔ وہ زمین پر گری اور تڑپنے لگی۔ میرا پہلا نشانہ شاہنواز کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ شاہنواز نے مرتے ہوئے بھی ایک موٹی سی گالی کی تھی جو غالباً فیروز جاہ کے لئے تھی، فیروز جاہ نے الٹی چھلانگ لگائی لیکن میں ایک پیشہ ور قاتل تھا، نوشابہ کو مرتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ اس کے بعد کائنات ختم ہو گئی ہے، چنانچہ میں نے لیوزین پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی، فیروز جاہ اتنی زور سے اچھلا تھا کہ اچھل کر سر کے بل لیوزین میں جا گرا تھا، اس کی دونوں ٹانگیں اوپر بلند تھیں کہ لیوزین کی ٹنگی پھٹی اور اس کے اندر سے دو انسانی جسم اچھل کر باہر آ گئے جو فیروز جاہ کے علاوہ تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی فیروز جاہ نے بھی کام کر دکھا دیا تھا یا پھر ان مرنے والوں نے، یا پھر وہ صرف اتفاق تھا کہ ان کی رائفلیں دوبارہ چلی تھیں اور میری دائیں ٹانگ ران تک چور چور ہو گئی تھی میں نے خونی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا، مارنے کے لئے اب کوئی نہیں تھا، آہ کاش! اس جگہ بہت سے لوگ ہوتے، اتنے کہ میں اپنی رائفل کے تمام رائونڈ خالی کر سکتا، لیکن اب قرب و جوار میں عجیب سی آوازیں گونجنے لگی تھیں میں نے اپنی کمرچی کمرچی ٹانگ کو دیکھا اور اس کے بعد بھاگنا شروع کر دیا، جان بچانے کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہیں تھا، بس یہ ایک فطری جبلت تھی جو مجھے بھاگنے پر مجبور کر رہی تھی اور میں دوڑ رہا تھا یہاں تک کہ میدان کے آخری سرے کا پہلا مکان مجھے نظر آیا اور شاید اسی مکان کے سامنے میں نے اپنے ہوش و حواس کھو دیئے تھے۔

ہاں جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک ایسی تاریک جگہ موجود تھا، جہاں صرف چھت میں ایک روشن دان نظر آ رہا تھا، میرے بدن کے نیچے چارپائی تھی۔ زخمی ٹانگ پیوں سے

”جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کرو، اور جتنی جلدی کر سکو بہتر ہے۔“  
”اور یہ بھی کہہ دو اس سے کہ کوئی بھی غلط حرکت کی تو خیر جو کچھ ہو گا وہ ہو گا ہی لیکن آخری آدمی یعنی تم بھی موت کا شکار ہو جاؤ گے۔“

”فیروز جاہ! براہ کرم اس وقت اور کوئی عمل نہ کرنا، صرف وہ کرو جو کہا جا رہا ہے۔“  
”بس ٹرانسمیٹر بند کر دو، مگر نہیں پہلے اسے اس جگہ کی تفصیل بتاؤ۔“ اور شاہنواز فیروز جاہ کو تفصیل بتانے لگا میں اطمینان سے ہیلی کاپٹر سے ٹک کر کھڑا ہو گیا تھا اور شاہنواز پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وقت ایسا تھا کہ میرے لئے نہایت پر سکون۔ ان لوگوں نے جسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا وہ اپنے معمولات میں مصروف ہو گا۔ لیکن فاضل کمال اور پائلٹ اس کی جگہ اپنی زندگیاں ہار چکے تھے، چھوڑنا کسی کو بھی نہیں تھا میرے اندر کا وحشی چیتا اب پورے ہوش و حواس میں تھا بالکل اسی عالم میں جب وہ گروہ کی جانب سے ملنے والے احکامات کی تکمیل کیا کرتا تھا۔

پھر آدھے گھنٹے کے بعد ایک بڑی لیوزین آتی نظر آئی جس کی چھت کھلی ہوئی تھی اور اس میں مجھے فیروز جاہ کے ساتھ نوشابہ بھی بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ باقی گاڑی خالی تھی۔ میں نے مسکراتی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا، فیروز جاہ کے کانوں پر بھی ہیڈ فون چڑھا ہوا تھا شاہنواز نے کہا۔

”اس وقت کچھ اور نہ پوچھنا، بلکہ جو ہدایات دے رہا ہوں ان پر عمل کرنا۔“

”بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”اس سے کہو کہ ہیلی کاپٹر سے دو سو گز کے فاصلے پر رک جائے اور نوشابہ کو ادھر

بھیج دے۔“ میں نے کہا

”بس اب تم جس جگہ ہو وہاں رک جاؤ فیروز جاہ، اور نوشابہ کو ادھر بھیج دو۔“

فیروز جاہ نے شاید دو رہین کے ذریعے یہ منظر دیکھ لیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ صورتحال کیا ہے، ان کا کھیل بگڑ گیا تھا۔ لیوزین رک گئی اور نوشابہ دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ فیروز جاہ نے خود بھی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور اتر کر نیچے کھڑا ہو گیا تھا۔ نوشابہ چند قدم آگے چلی اور اس کے بعد اس نے دوڑنا شروع کر دیا وہ ہاتھ ہلا کر کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن

میں یہ ساری باتیں سن رہا تھا اور ایک لمحے کے اندر ساری کیفیت میری سمجھ میں بھی آ گئی تھی۔ آہ جہاں میں بے ہوش ہوا تھا وہاں کے کمین مجھے اندر اٹھالائے تھے، کافی وقت گزر چکا تھا، ٹانگ کے زخم اور تکلیف سے مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں زندگی اور موت کی کشش میں مبتلا ہوں لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں تھی، میں نے تو دنیا کو اس سے بھی زیادہ اذیتوں میں مبتلا کیا تھا مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ میں نے ان لوگوں کا کھیل بگاڑ دیا تھا اور ان شیطانوں کو ختم کر دیا تھا جنہوں نے میری نوشاہی ملنے کے بعد مجھ سے چھین لی تھی، بس اور کیا لینا دینا تھا اس دنیا سے، اچانک میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہاں موجود افراد اچھل پڑے، عورت کے حلق سے ایک مدھم سی آواز نکل گئی۔ لیکن مرد نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کسی وزنی اوزار کی ضرب میرے سر پر لگائی، پہلی ضرب میری گردن پر لگی، اور میں نے عورت کی آواز سنی۔

”ہائے ہائے تمہیں خدا کا واسطہ، ارے کیسی بے دردی سے مار دیا۔“ لیکن دوسری ضرب جو یقیناً کسی ہتھوڑے کی تھی میرے سر پر پڑی اور ایک لمحہ بھی نہ لگا دماغ پر بھرپور چوٹ پڑی تھی پھر کس نے کیا کیا مجھے کچھ نہیں معلوم لیکن اب دنیا مجھ پر روشن ہے مجھے معلوم ہے کہ میں کافی عرصے سے ہسپتال کے ایک وارڈ میں موجود ہوں چونکہ میں ایک دہشت گرد گروہ کا رکن ہوں اور ایک خوفناک قاتل، جس نے کچھ اہم ترین لوگوں کو قتل کر دیا تھا۔ میں کوما میں ہوں اور میرے بدن سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا ہے، میری ٹانگ میں نئلیاں ڈالی گئی ہیں جن سے وہ مجھے غذا پہنچا رہے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا جسم مردہ ہو چکا ہے اور وہ مردہ جسم کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی انسان کو یہ تجربہ نہیں ہو گا کہ دماغ سے جسم کا رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد دماغ کی قوتیں یکجا ہو جاتی ہیں، شعور، لاشعور اور تحت الشعور اس قدر روشن ہو جاتا ہے کہ شاید اپنی زندگی کا پہلا دن بھی یاد آ جائے وجہ یہ ہے کہ دماغ پر بدن کا بوجھ نہیں ہوتا، میں اس وقت اسی کیفیت کا شکار ہوں، سب کچھ یاد ہے مجھے وہ بھی جو کبھی نہ یاد آتا بچپن کا دور، گزرے ہوئے لمحات، وہ سب کچھ جس کا تعلق میری زندگی سے ہے ہاں البتہ ایک بات میرے لئے ذرا کچھ تکلیف دہ ہے، پتہ نہیں آپ اسے کس طرح محسوس کریں میرے احساسات میں تو کوئی دکھ نہیں ہے، بس

کسی ہوئی تھی اور شاید مجھے شدید بخار تھا اور شدید بھوک بھی لگ رہی تھی اور یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ جو واقعہ گزرا ہے اسے گزرے ہوئے خاصی دیر ہو گئی ہے ایک دن، دو دن یا ممکن ہے اس سے زیادہ بدن ایک پھوڑے کا منظر پیش کر رہا تھا اور جس جگہ میں موجود تھا۔ وہ ہسپتال نہیں تھی، پھر میرے کانوں نے ایک آواز سنی۔

”سنو، کیوں اسے بے موت مار رہے ہو، اس کی جو حالت ہے تم نے دیکھ لی، سارے بدن کا خون بہہ گیا ہے، ٹانگ جس بری حالت میں ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ کاٹنی ہی پڑ جائے گی۔ ساری پٹیاں خون میں تر پتر ہو کر ٹانگ سے چمٹ گئی ہیں، کیوں بے موت مار رہے ہو اسے، نجانے کس ماں کا لعل ہو گا، کسی نے تو اسے جنم دیا ہو گا۔“

”یہ قوف ہو، بالکل یہ قوف ہو، ارے کیا رحم کھانا اس دنیا پر، کیا ملا ہے اس دنیا سے ہمیں، ساری زندگی کی محنت سے پھلوااری لگائی تھی، کس نے ساتھ دیا ہمارا، بڑے ہو گئے ایک ایک کر کے اپنا گھر بسالیا اور ہم جو دنیا سے تھک کر ان پر اپنی ساری قوت صرف کر کے بیٹھ گئے تھے کوئی پوچھنے والا تھا، ہمیں، بڑی سنگدل، بڑی بے رحم ہے یہ دنیا، تمہیں کیا اندازہ ہے، اس عمر میں جب چار پیسے کمانے کے لئے نکلتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ کسی درخت کی چھاؤں میں سو جاؤں۔ ہونہ۔۔۔ اگر اس وقت اس کے بدلے کچھ مل جاتا ہے تو سمجھ لو کہ باقی زندگی آرام سے بسر ہو جائے گی۔“

”کیا مل جائے گا اس کے بدلے تمہیں، بتاؤ کیا مل جائے گا؟“ عورت کی آواز ابھری۔

”لاٹری ہے لاٹری یہ ہماری، پورے پانچ لاکھ روپے انعام ہے اسے زندہ یا مردہ پیش کرنے پر، شر میں جگہ جگہ پوسٹر لگے ہوئے ہیں بڑا خطرناک مجرم ہے یہ، اور پھر تم کیا سمجھتی ہو تم نے اسے چھپا کر رکھا ہوا ہے، پولیس کو پتا چل گیا تو جانتی ہو کیا حشر کرے گی ہمارا، یہ بڑا خطرناک مجرم ہے بہت ہی خطرناک جیل سے بھاگا ہوا۔“

”ہائے نجانے کیوں میرا دل نہیں چاہتا کہ اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے اس کی ٹانگ کا زخم ٹھیک ہو جاتا تو پھر سوچ لیتے بعد میں۔“

”بس بکواس بند کرو، میں نے پولیس کو خبر کر دی ہے، پولیس آنے ہی والی ہو گی۔“

ایک دلچسپ اتفاق ہے، عالم ہوش میں تو شاید میں ان لوگوں کو نہ پہچانتا، لیکن اب جب میرے شعور کا ہر حصہ روشن ہے تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ جس شخص نے دوبارہ میری قیمت یعنی پانچ لاکھ روپے وصول کی ہے وہی شخص تھا جس نے مجھے اس دہشت گرد گروہ کے افراد کے ہاتھوں فروخت کیا تھا اس لئے کہ میری قربانی دے کر وہ اپنے بقیہ بچوں کی پرورش کرے ان بچوں کی پرورش جن کے لئے وہ کہہ رہا تھا کہ سب نے اپنا اپنا ٹھکانہ کر لیا اور اسے اس دنیا میں تنہا چھوڑ دیا، آپ سمجھ گئے ہوں گے وہ کون تھا، ماں باپ تھے میرے ماں باپ اور اب دنیا میرے بارے میں کسی بھی انداز میں سوچ رہی ہو، میں بس یہ سوچ رہا ہوں کہ کیسے خوشگوار لمحات ہیں یہ، دیکھیں دماغ سے بدن کا یہ رشتہ کتنی دیر قائم رہتا ہے چونکہ رشتے ایک بے معنی اور بے مقصد چیز ہوتے ہیں، شاید آپ مجھ سے متفق نہ ہوں۔

—☆○☆—

## سفید نشان

عظمت علی کی شکل و صورت دیکھ کر اسے کباز یہ کہنے میں کسی کو عار نہیں محسوس ہوتا تھا خود عظمت علی نے کبھی خود کو کباز یہ کہنے پر اعتراض نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں انسان جس پیشے سے منسلک ہو اس سے پر خلوص اور دیانتدار رہنا ضروری ہے۔ اگر پیشے کی عظمت خود اپنے دل ہی میں نہ ہو تو لوگ اس سے کیا متاثر ہوں گے۔

وہ کوئی خاندانی حیثیت نہیں رکھتا معمولی سے گھرانے کا انسان تھا۔ پہلے ایک کپڑے کی دکان میں نوکری کرتا تھا اس کے بعد کچھ روز ایک مل میں ملازمت کی لیکن دل میں ملازمت سے نفرت کرتا تھا اس کا خیال تھا کہ کاروبار کاروبار ہی ہوتا ہے خواہ کچھ بھی ہو۔ نوکری کی تنخواہ میں گزر نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ بخیل انسان تھا ایک ایک پیسہ دانٹوں سے پکڑتا تھا لیکن قلیل آمدنی میں کیا کرتا پھر بھی وہ تنگ دو میں لگا ہی رہتا تھا۔

نہ جانے کس طرح اس کے ذہن میں کباز خانے کی دوکان کا خیال آیا۔ اس کاروبار کے بارے میں وہ کافی غور و خوض کرتا رہا۔ شر کے بہت سے کبازیوں کے پاس جا کر وہ اس کاروبار کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا اور اسے محسوس ہوا جیسے یہ سب سے آسان پیشہ ہے۔ جس کی ابتداء کرے کے لئے کسی بڑے سرمائے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کچھ کبازیوں نے اسے اپنی ابتدائی زندگی کے حالات سنائے اور عظمت علی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود بھی اسی انداز میں کاروبار کا آغاز کرے گا۔

”چنانچہ اپنی قلیل آمدنی میں سے کچھ بچا کر اس نے سائیکلوں کے چار پرانے پہنے

صورت حال نازک دور میں داخل ہو گئی تھی۔ عظمت علی نے وہاں سے کھسک جانا مناسب سمجھا اور آواز لگائے بغیر ہی خاموشی سے وہاں سے کھسک گیا۔ پورا شہر بڑا تھا اس نلے کا تو کام ختم ہو گیا تھا۔

اس مختصر عرصہ میں اسے بہت تجربات ہوئے تھے اور ان تجربات نے اسے ارباب کو آگے بڑھانے میں مدد دی تھی۔

عظمت علی بھی اب سینکڑوں روپے کا مال خرید لیتا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ جو کچھ خریدتا اور فروخت کرتا ہے اس میں منافع کی شرح بہت کم ہے اگر وہ یہ چیزیں لے کر کسی ٹھکانے پر بیٹھے تو آمدنی دوگنی ہو سکتی ہے ٹھکانے کی خریداری کے لئے اس کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی اور پھر زیادہ رقم کسی جگہ کی خریداری میں صرف کرنا موزوں بھی نہیں تھا۔ یہ رقم مال کی خریداری میں صرف کی جائے تو زیادہ سود مند ہے۔

چنانچہ پرانے قبرستان کے سامنے گوالوں کی بستی کے کنارے اسے ایک دوکان سے داموں مل گئی۔ دوکان کے ساتھ طویل و عریض میدان پڑا تھا اور میدان کے آخری سرے پر پرانا قبرستان تھا۔

یہ قبرستان اس شہر کا سب سے قدیم قبرستان تھا اور لبالب بھر چکا تھا۔ گورکنوں کو پکی قبریں بنانے والوں سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ کچھ قبریں تو دوبارہ بارہ اور نہ جانے کتنی بار کام آجاتی تھیں اس لئے جگہ باقی نہیں بچی تھی اور لوگ ادھر کا رخ کم ہی کرتے تھے جس گورکن کی یہاں رہائش تھی وہ نہایت کسپری کی زندگی گزار رہا تھا۔

ایسی کسپری کی زندگی گزارنے والوں سے ہی عظمت علی جیسے شخص کا کاروبار چمکتا ہے۔ پہلے یہ لوگ بھوک اور فاقوں سے تنگ آکر اپنے گھروں کی چیزیں اونے پونے بیچتے ہیں اور اس کے بعد دوسروں کے گھروں کی۔ لیکن چند جاننے والوں کو عظمت علی نے ہدایت کر دی تھی کہ اگر وہ کوئی چھپر کا مال لائیں بھی تو وہ گوالوں کے محلے کا نہ ہو ورنہ دوکان ختم ہو جائے گی۔

یوں اب عظمت علی کباڑی کی عظمت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوکان کے آگے نمین کا ایک طویل و عریض سائبان ڈال لیا گیا تھا۔ جس کے نیچے دنیا جہاں کا سامان بھرا رہتا تھا۔

خریدے اور پھر آہستہ آہستہ دوسرا سامان خرید کر ایک ہاتھ سے دھکیلنے والی گاڑی بنائی۔ اور پھر پہلے دن جیب میں بیس روپے ڈال کر وہ گاڑی گھسیتا ہوا باہر نکلا۔ بیس روپے میں اس نے جو چیزیں خریدیں وہ ڈالڈا کھکی کے آٹھ ڈبے، سولہ اچار چٹنی کی بوتلیں، تین کرسیاں اور ایک اسٹیل کا پاندان تھا جو اس نے چھ روپے میں خریدا تھا جسے ایک نوجوان عورت نے دانت نکوستے ہوئے بیچا تھا۔

”اب کھالے بڑھیا گلو ریاں۔ بیٹے کی کمائی ہے دس روپے روز۔ اور بڑھیا کو دو روپے روز کے پان چاہئیں۔“

”غالباً یہ تمہاری ساس کا پاندان ہے۔“ عظمت علی نے پوچھا۔  
”ہاں۔“ نوجوان عورت رواداری میں بولی۔ اور پھر چونک کر کہنے لگی۔ ”پر تمہیں اس سے کیا۔ کیا دو گے اس کا۔“

”چھ روپے۔ اس سے زیادہ کا نہیں ہے۔“  
”نکالو۔ اور آتے جاتے رہا کرو۔ میں تمہیں کچھ اور چیزیں بھی دوں گی۔“ اور عظمت علی نے چھ روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

صرف پاندان بیس روپے کا بکا تھا۔ کرسیاں ڈبے بوتلیں سب ملا کر عظمت علی کو پہلے ہی روز تیس روپے کا منافع ہوا تھا کاروبار اس کے دل کو لگ گیا۔ سختی اور زمانہ شناس تھا۔ چند مخصوص گھروں کا انتخاب خاص طور سے کر لیا تھا جس میں پاندان والا گھر بھی شامل تھا۔ اس سے اسے پہلی بڑی آمدنی ہوئی تھی۔ نوجوان عورت نے پہلے پاندان پھر لکڑی کی پیڑھی نمین کا بکس اور نہ جانے کیا کیا بیچا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس گھر سے ایک بوڑھی خاتون تاجنے کا سلنی لوٹا اور چند پلیٹیں لے کر نکلیں انہیں اونے پونے بیچ دیا۔ غالباً ہومی کے چلی گئی تھی اب ساس کی باری تھی۔ یہ چیزیں یقیناً ہومی کی چیزیں ہوں گی۔

پھر تقریباً پندرہ روز کے بعد جب ایک دن عظمت علی ادھر سے گزرا تو دونوں ساس ہومی کی باری تھی۔ یعنی گھر سے چیخ دھاڑ کی آوازیں آرہی تھیں اور غالباً بچی کچھی چیزیں ایک دوسرے پر پھینک کر ماری جارہی تھیں۔

”فرمائیے۔؟“ عظمت علی نے لو کے تھپڑے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

یہ تمہاری دکان ہے۔؟

”جی ہاں۔ کیا چاہیے آپ کو؟“

”میرا نام مستب عالم ہے۔“

”جی۔“ عظمت علی کو نام سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے

”کچھ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیا چیز ہے۔ دکھائیے۔“ عظمت علی نے کہا۔ اور نوارو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکال لیا۔ تیز روشنی میں پیلاہٹ چمکی تھی اور پھر سونے کا ایک جڑاڑ ہار عظمت علی کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں آگیا۔ کافی وزنی ہار تھا لیکن اول تو میلا بہت تھا اس کے نقش و نگار میں مٹی جمع ہوئی تھی۔ دوئم انتہائی پرانی ساخت کا تھا۔

عظمت علی کا دل دھک سے ہو گیا۔ سونے کی چیزوں کی خرید و فروخت اس نے آج تک شروع نہیں کی تھی۔ یہ پہلی چیز تھی جو اس کے پاس لائی گئی تھی۔ تاہم اسے یہ ہار بہت قیمتی محسوس ہوا۔

”خالص سونے کا ہے۔“ عظمت علی نے اسے قیص سے گھس کر چمکاتے ہوئے

پوچھا۔

”ہاں۔ یقیناً۔“ نوارو نے گہری سانس لے کر کہا۔

کتنے تولے کا ہے۔؟

”یہ سب کچھ مجھے نہیں معلوم۔“

”اس کی رسید موجود ہے۔“

”رسید“ نوارو نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا جیسے وہ رسید کے متعلق نہیں جانتا

ہو۔

ہاں کب خرید ا تھا تم نے اسے کہاں سے خریدا تھا؟

”دیکھو دوست میں یہ ساری باتیں نہیں جانتا۔ میں اسے بس فروخت کرنا چاہتا

ہوں۔“

خریدنے اور بیچنے والے یہاں با آسانی آجاتے تھے اور بات سینکڑوں سے نکل کر ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ عظمت علی نے اپنا مکان بھی بنوا لیا تھا۔ بیوی کی ساری شکایتیں دور ہو گئی تھیں اب اس کے پاس کافی زیورات تھیں۔ نہ بدلی تو شکلیں۔ اور بڑے اطمینان سے اس خاندان کو کباڑیوں کا خاندان کہا جاسکتا تھا۔

لیکن عظمت علی نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ اس پیشے سے پوری طرح مخلص تھا۔ دکان پر اس نے کوئی ملازم نہیں رکھا تھا۔ سارے کام اپنے ہاتھ سے سرانجام دیتا تھا۔ اس کے خیال میں کاروبار پر جب تک اپنی نظر نہ رہے وہ چمکتا ہی نہیں ہے۔ نوکر رکھ کر انسان آرام طلبی کا عادی ہو جاتا ہے اور آرام طلبی اچھے کاروبار کی قاتل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہلکی بھاری چیزیں وہ خود ہی سنبھالتا تھا۔

گرمیوں کی ایک دوپہر تھی لو چل رہی تھی اور عظمت علی دکان کے بالکل اندرونی حصے میں ایک ٹرک کی سیٹ پر بیٹھا پنکھے کی ہوا کھا رہا تھا۔ حالانکہ گرمیوں کی دوپہر بڑی تباہ کن ہوتی ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب باہر شدید لو چل رہی ہو۔ پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا گیا ہو اور پھر پنکھے کی ٹھنڈی ہوا لگ رہی ہو۔ ایسے اوقات میں نیند ٹوٹ ٹوٹ کر آتی ہے۔ لیکن عظمت علی کے اصول بہت سخت تھے بھلا کاروبار کی جگہ بھی سونے کے لئے ہوتی ہے۔ نیند نہ کیا چیز اور پھر اس نے نیند کو بھگانے کے لئے ہی تو یہ پنکھا رکھا تھا۔ زنگ خوردہ پنکھا بھی کوئی بیچ ہی گیا تھا۔ بظاہر وہ عام پنکھا تھا لیکن اس کی مشین غالباً ہیلی کاپڑ کی تھی۔ وہ زنانے دار آواز ہوتی تھی کہ مروے بھی جاگ انھیں۔ یہ پنکھا تو مردوں کو بھی سکون سے نہ سونے دیتا عظمت علی کیا چیز تھے۔

عظمت علی پنکھے کی ہوا میں ٹرک کی پھنی ہوئی سیٹ پر دراز تھا کہ اسے باہر کچھ آہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی آیا تھا۔ وہ فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور اس نے ایک آواز سنی۔

”کوئی ہے۔؟“

عظمت علی باہر نکل آیا۔ پرانے طرز کے لباس میں لمبوس ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا تھا۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید تھے چہرے بے تاثر نظر آ رہا تھا اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ تم کب آؤ گے۔؟“

”آج کیا دن ہے۔“ نودارد نے پوچھا۔

جعرات ہے شاید۔

”میں آئندہ جعرات کو اسی وقت آؤں گا۔“ تم معماروں کو بلا لینا ٹھیک ہے۔“

”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ میں دوستانہ طور پر تمہارا کام ضرور کراؤں گا۔“

عظمت علی نے اس پر احسان کیا۔ حالانکہ اس کی دوستی تو نودارد کی لائی ہوئی چیز سے تھی۔ اگر تقدیر ساتھ دے رہی ہے تو اس بار اسے زبردست منافع ہو سکتا ہے۔ نودارد کے چلے جانے کے بعد عظمت علی کا سکون بھی چلا گیا۔ اس نے جلدی جلدی ایک ٹوٹا ہوا برش تلاش کیا اور صابن کے ٹکڑے کو لے کر وہ بار کو برش سے گھسنے بیٹھ گیا۔ جوں جوں مٹی چھٹ رہی تھی بار نکھرتا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ چمکنے لگا۔ خالص اور کھرا سونا معلوم ہوتا تھا۔

عظمت علی نے سوچا اتنی بڑی رقم لگائی ہے فوری طور پر اس کا فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ گھر لے کر گیا اور گھر والی کو پسند آگیا تو بلاوجہ ڈھائی ہزار روپے پھنس جائیں گے اس لئے پہلے اس کا تیا پانچہ ضروری ہے۔ بار کو اچھی طرح صاف کر کے اس نے خشک کیا اور پھر اپنی واسٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس کے بعد لباس وغیرہ درست کر کے اس نے دوکان بند کی اور سائیکل لے کر نکل کھڑا ہوا۔

لو کے تھپڑے پھٹے ہوئے جوتے کی طرح تاڑ تاڑ پڑ رہے تھے۔ لیکن وہ ان سے بے نیاز شرم میں نکل گیا۔ کاروبار کے دوران اسے کام کی جگہوں کا بھی پتہ چل گیا تھا۔ چنانچہ گوٹے بھائی موٹے بھائی جیولرز کی دوکان کے سامنے اس نے سائیکل کھڑی کی اور دوکان میں داخل ہو گیا۔

اندر کے پرسکون ماحول میں گوٹے بھائی موٹے بھائی او نگھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر اس طرح ہڑبوا کر اٹھے جیسے ڈاکو گھس آئے ہوں۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر عظمت علی کو دیکھا اور عظمت علی نے کچھ کہے بغیر بار نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا۔

جوہری کی آنکھ ہی پہچان سکتی ہے۔ گوٹے بھائی موٹے بھائی نے اسے پرکھا اور پھر

حوالیہ انداز میں عظمت علی کو دیکھنے لگے ”بیچنا ہے۔؟“

”ہوں گویا چھپروالی بات ہے۔ لیکن دیکھو دوست میں اتنی قیمتی چیزیں نہیں خریدتا۔ اس کے لئے تمہیں کسی جوہری کے پاس جانا چاہیے۔“ عظمت علی کا دل اندر سے اچھل رہا تھا۔ اتنی قیمتی چیز کو وہ کسی طور ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔

”میں کہیں اور نہیں جانا چاہتا۔ تم اسے خرید لو۔“

”میں تو۔ میں تو اس کے صرف ڈھائی ہزار دے سکتا ہوں تمہیں۔؟“

”لاؤ۔“ نودارد نے کہا۔ اور عظمت علی کا رنگ فق ہو گیا پندرہ بیس ہزار کی چیز اسے صرف ڈھائی ہزار میں مل رہی تھی۔ اس نے دوبارہ بار کو گھس کر دیکھا۔ ”سونے ہی کا ہے نا۔ یا لیکن اس میں کوئی کھوٹ نہیں نظر آرہی تھی۔ عظمت علی نے اسے جیب میں ڈال لیا۔ اور پھر تجوری سے ڈھائی ہزار کے نوٹ گن کر اس کے حوالے کر دیئے۔

نودارد نے نوٹ جیب میں رکھ لئے اور پھر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ کچھ اور چیزیں

بھی تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔“

”لاؤ۔“ عظمت علی جلدی سے بولے۔

”ابھی نہیں۔ آئندہ ہفتے آؤں گا کیا تم اس کے علاوہ بھی میرا کچھ کام کر سکتے ہو۔؟“

”مثلاً؟“

”میں یہ درخواست تم سے دوستانہ طور پر کر رہا ہوں۔ اگر تم میری مدد کرو گے تو

میں تمہارا ممنون ہوں گا۔“

”کو کہو۔“ عظمت علی خوش اخلاقی سے بولا۔ آج زبردست منافع کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”مجھے کچھ معماروں کی ضرورت ہے۔ ایک چھوٹی سی عمارت تعمیر کرانا چاہتا ہوں۔“

”اوہ اچھا کہاں تعمیر ہوگی یہ عمارت۔؟“

”یہیں قریب ہی۔“

”ہوں۔ میری کسی سے شناسائی تو نہیں ہے لیکن جس مزدور سے میں نے کام لیا تھا

اس کا گھر میں جانتا ہوں۔ اس سے بات میں کر لوں گا۔“

”تمہاری عنایت ہوگی اس کے عوض میں تمہیں بھی بہت کچھ دوں گا۔“

”رسید ہے؟“ وہی سوال گوٹے بھائی نے کیا جو کہ ایک کامیاب دوکاندار کو کرنا چاہیے۔

”نہیں میری مرحوم ساس کو ان کی ساس نے دیا تھا۔ اس زمانے میں رسیدیں نہیں ہوتی تھیں۔“ عظمت علی نے کہا۔

”ہوں۔“ گوٹے بھائی نے دوکان کے دروازے سے باہر جھانکا اور پھر ہار کو کانٹے پر رکھ دیا۔

”تیرہ تولے پاؤ رتی کا ہے۔“ گنینہ کاٹ کر بارہ تولے رہ جاتا ہے۔ کتنا پیسہ دوں اس کا۔“

”جوہری تم ہو سیٹھ۔“

”وہ تو ہے بابا۔ مگر چھپر کا مال ہے۔ رسید کے بغیر میں تیرے کو اس کے پندرہ ہجاردوں گا۔“ بول نکالوں۔“

”صرف پندرہ ہزار گوٹے بھائی۔؟“

”سولہ سے زیادہ ایک پائی نہیں دوں گا بولو نکالوں۔؟“

”نکالو۔“ عظمت علی نے دل کی دھڑکنوں کی تیزی چھپاتے ہوئے کہا۔ اور گوٹے بھائی موٹے بھائی سولہ ہزار روپے گن کر عظمت علی کے سامنے ڈال دیئے۔ عظمت نے وقت کی سب سے بڑی عظمت اپنی صدری میں چھپالی اور پھر سلام کر کے باہر نکلنے لگا تو گوٹے بھائی کی آواز سنائی دی۔

”ارے بات سنو بابا۔ تیری ساس کی ساس نے جتنے بیورات تیری ساس کو دیئے ہیں سب لے آنا اور میرے سے زیادہ تیرے کو کوئی پیسہ نہیں دے گا آں۔“

”ٹھیک ہے گوٹے بھائی۔“ عظمت علی نے کہا۔ اور باہر نکل کر تیزی سے چل پڑا۔ لیکن کچھ دور چل کر اسے اپنی سائیکل یاد آئی جسے وہ گوٹے بھائی کی دوکان پر ہی بھول آیا تھا۔

سازھے تیرہ ہزار کی آمدنی نے اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تھے لیکن چیز دو ٹکے کی مو قیمتی ہوتی ہے۔ وہ تیزی سے چلنا اور سائیکل اٹھا کر واپس دوکان چل پڑا۔

شام کو وہ عجیب خیالات کا شکار رہا تھا اس نووارد کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ شکل و صورت سے تو وہ چور نہیں معلوم ہوتا تھا۔ عجیب بیزار بیزار سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار اس کی ملکیت تھا۔؟ اگر تھا تو وہ اسے اتنی سستی قیمت پر کیوں بیچ گیا۔؟“

کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ممکن ہے وہ آئندہ جمعرات کو آہی جائے۔“ یہ بات اس نے گھر والوں سے بھی چھپائے رکھی۔ باہر کی باتیں گھر میں بتانا بے وقوفی ہے۔

لیکن آنے والی جمعرات کے لئے وہ تیار تھا۔ اس نے ممدو سے بھی بات کر لی تھی اور جمعرات کی دوپہر کو اسے آنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ دوسری جمعرات کو اس نے دوسرا کوئی کام نہیں کیا اور ممتاز عالم کا انتظار کرنے لگا۔ عین اس وقت جس وقت ممتاز عالم پہلی بار آیا تھا۔ وہ دوبارہ عظمت علی کی دوکان پر پہنچ گیا۔ ممدو کو عظمت علی نے باہر بٹھا دیا تھا۔

عظمت علی نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ ”آؤ عالم جی۔ کچھ چنبو گے ٹھنڈا گرم۔“

”نہیں بھائی۔ میرا کام کیا۔؟“

”ہاں جی۔ وہ ممدو باہر بیٹھا ہے۔ کچھ لائے ہو۔؟“

”اسی ہاں یہ لو۔“ اس بار اس نے دو وزنی کنگن نکال کر عظمت علی کو دیئے۔ دس تولے سے کم نہ ہوں گے۔ عظمت علی نے انہیں دو ہزار میں خرید لیا۔ گاہک کی بے نیازی وہ پہچان گیا تھا۔

سودے کی لین دین کے بعد اس نے ممدو کو بلایا اور ممتاز عالم سے اس کا تعارف کرایا۔

”میں تم سے ایک خوبصورت عمارت تعمیر کرانا چاہتا ہوں تمہارے دوسرے ساتھی بھی ہوں گے۔“

”ہاں جی مستری عالم بخش بہت بڑے کاریگر ہیں وہی میرے استاد بھی ہیں۔ آپ کہیں تو ان کو بلاؤں۔“

”نہیں دوست۔ بعد میں ان سے باتیں کر لیتا۔ آؤ میں تمہیں کام سمجھا دوں۔ آؤ مہرے ساتھ۔“ اور ممدو اس کے ساتھ چل پڑا۔

ہے چھ ہزار کی۔“

مدد بتاتا رہا اور عظمت علی اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ متاب عالم اس کے بعد دو تین بار آیا۔ اس نے دوسری بہت سی چیزیں فروخت کیں۔ عظمت علی کے لئے تو وہ سونے کی کان تھا لیکن اب اس کے دل میں سخت تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ آخر متاب عالم یہ زیورات کہاں سے لاتا ہے ممکن ہے کوئی قدیم خزانہ ہی اس کے ہاتھ لگ گیا ہو جتنے زیورات لاتا ہے سب کے سب پرانے طرز کے ہوتے ہیں۔ ضرور کوئی ایسی ہی بات ہے۔ کیونکہ اس کا تعاقب کر کے اس کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ اس نے سوچا۔

اس دوپہر کو متاب عالم نے عظمت علی کے ہاتھ دس ہزار روپے کا مال فروخت کیا تھا جس کے عظمت علی کو یقیناً پچاس ہزار ملنے والے تھے۔ متاب عالم کی راہ میں عظمت علی آنکھیں بچھائے رہتا تھا۔

”آپ کا کام کب پورا ہو رہا ہے متاب جی۔؟“ عظمت علی نے پوچھ لیا اور متاب عالم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کونسا کام؟“

”وہ مدد بتا رہا تھا کہ آپ کوئی مقبرہ بنا رہے ہیں۔؟“

”ہاں بس آخری کام رہ گیا ہے۔ مقبرہ تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔“

”کس کا مقبرہ ہے بی۔؟ آپ کے کسی گھرے عزیز کا! آپ کی نگن یہی بتاتی ہے۔“

عظمت علی نے کہا۔

”بس یہی سمجھ لو۔“ اس نے گول مول سے انداز میں جواب دیا۔

”کیا آپ کی محبوبہ یا بیوی کا ہے؟“

”ارے نہیں عظمت علی اس دور میں کون کسی کے لئے کیا کرتا ہے۔“ متاب عالم نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہاں جی یہ بھی ٹھیک ہے ویسے آپ بہت اچھے انسان ہیں متاب جی۔ میں آپ کی کوئی اور خدمت کر سکتا ہوں۔“

”پھر کب آئیں گے عالم جی۔“ عظمت علی نے پوچھا۔

”کسی بھی دن تمہیں پھر تکلیف دوں گا!“ متاب عالم نے کہا اور مدد کے ساتھ

چلا گیا۔

عظمت علی نے ان دونوں کو قبرستان کی طرف جاتے دیکھا تو اس کے ذہن میں آج عجیب سے خیالات آرہے تھے۔ یہ شخص کون ہے؟ شکل و صورت سے کوئی خاندانی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یہ دولت ممکن ہے اس کی خاندانی ہو کسی مجبوری کا شکار ہو کر وہ ان زیورات کو فروخت کر رہا ہو۔ لیکن اتنے قیمتی زیورات اتنی معمولی قیمت پر چور ہی فروخت کر سکتا ہے۔ کون ہے جسے ان کی اصل قیمت نہ معلوم ہو۔ نہیں یہ اس کی ملکیت نہیں۔ بہر حال اگر چور بھی ہے تو عظمت علی کا کیا جاتا ہے۔ اسے تو پھر دس ہزار کا منافع ہونے والا ہے۔“ اور یہی ہوا بھی موٹے بھائی گوٹے بھائی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مال لاتے رہنے کی ہدایت کر دی۔ ان کنگنوں سے عظمت علی کو پورے دس ہزار کا منافع ہوا تھا۔

دن رات گزرتے رہے۔ ایک ہفتے بعد وہ پھر آیا۔ اور اس بار تین قیمتی زیورات عظمت علی کے ہاتھ فروخت کئے جن کی قیمت عظمت علی نے اسے آٹھ ہزار ادا کی تھی اور ان زیورات سے عظمت علی کو پورے انیس ہزار کا منافع ہوا۔

عظمت علی کی عظمت میں چار چار چاند لگ گئے تھے۔ ایک دن دوپہر کو مدد اسے نظر آیا۔ اور سلام کرنے کے لئے اندر آ گیا۔ عظمت علی نے خوش اخلاقی سے اس سے سلام دعا کی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے مدد؟“

”بس جی۔ وہی متاب عالم کا کام کر رہے ہیں۔ جلدی ختم ہو جائے گا۔ مگر بڑا دل

گردے کا مالک ہے عظمت بھائی دل کھول کر پیسہ خرچ کر رہا ہے۔“

”ارے ہاں۔ کیا ہوا تھا اس دن۔؟“

”کام مل گیا ہے۔ مقبرہ بنا رہا ہے قبرستان میں۔ استاد بھی دل سے کام کر رہے

ہیں۔ پیسے کی تو اسے پروا ہی نہیں ہے۔ جو مانگو دے دیتا ہے۔ سنگ مرمر کی گاڑی منگوائی



ہونے لگی۔

”جب پوری قبر کھل گئی تو متاب عالم نے سیدھے ہو کر عظمت علی کو دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”آؤ۔“

”عظمت علی کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ اس نے وحشت کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا لیکن مقبرے میں کوئی دروازہ ہی نہیں تھا۔ چاروں طرف دیواریں ہی دیواریں تھیں۔ وہ اس میں بند تھا۔

”ارے ارے دروازہ کہاں گیا۔؟“ نہ جانے کیسے اس کے حلق سے ڈوبتی سی آواز نکلی۔

”یہ ہے دروازہ۔ آؤ“ متاب عالم نے مسکراتے ہوئے کھلی قبر کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔ ”آؤ۔ دیر مت کرو۔ دھوپ کم ہوتے ہی مزدور آجائیں گے۔“

لہجہ کچھ ایسا بھیانک تھا کہ عظمت علی کے قدم خود بخود کھلی ہوئی قبر کی طرف اٹھ گئے۔ متاب عالم قبر میں اتر گیا اور بادل ناخواستہ عظمت علی کو بھی جیتے جی قبر میں اترنا پڑا۔ نہ جانے کتنی بلندی سے وہ نیچے گرا پڑا۔ اس حیرت سے چاروں طرف دیکھا ایک چھوٹا سا ٹھنڈا کمرہ تھا۔ جس میں ایک طرف ایک تابوت کھلا ہوا رکھا تھا۔ اس خالی تابوت کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی۔ عظمت علی کے بدن میں خوف کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

”یہ میری حقیقت ہے۔ پرانی بات ہے۔ یہاں سے چھ میل دور ایک آبادی مرید پور کے نام سے مشہور تھی۔ میں وہاں کاسب سے بڑا زمیندار تھا۔ آج بھی تم سرکاری کانڈات میں مرید پور کے متاب عالم کے بارے میں دیکھ سکتے ہو۔ میرے تین بیٹے تھے۔ بڑے نازدق سے میں نے ان کی پرورش کی۔ وہ جوان ہوئے تو ان کے رنگ ڈھنگ اچھے نہ تھے۔ ان کی نگاہوں میں میری کوئی حقیقت نہ تھی۔ سب اپنی اپنی رنگ رلیوں میں مصروف رہے۔ پھر میں نے ان کی شادیاں کر دیں۔ بیویاں آئیں تو وہ مجھے بالکل ہی بھول گئے میری ساری دولت ان کے نام ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے اپنا قدیم خزانہ ان سے چھپا رکھا تھا۔ جب میں ان سے مایوس ہو گیا تو اس دنیا سے میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ میں نے سوچا

”کرو گے۔؟“ متاب عالم نے پوچھا۔ انداز عجیب تھا۔

”دل و جان سے۔؟“

”تو پھر تو میرے ساتھ۔ آجاؤ دوکان یونہی چھوڑ دو کوئی تمہاری کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائے گا یہ میری ذمہ داری ہے۔“ متاب عالم نے کہا اور بادل ناخواستہ عظمت علی بھی تیار ہو گیا۔ متاب عالم اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ دونوں کا رخ پرانے قبرستان کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ قبرستان میں داخل ہو گئے۔

قبرستان میں ہو کا عالم تھا۔ گرمی شدید پڑ رہی تھی۔ اس وقت مزدور بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ کام بند تھا۔ خوبصورت سفید عمارت دور ہی سے صاف نظر آرہی تھی۔ ”یہ عمارت بنوا رہے ہیں آپ۔“ عظمت علی نے پوچھا۔

”ہاں کیسی ہے۔؟“

”بہت خوبصورت ہے جی۔“

”آؤ۔ اندر سے دکھاؤں۔“ متاب عالم نے کہا۔ اور مقبرے کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ عظمت علی بھی ساتھ تھا باہر کی بہ نسبت اندر کا ماحول ٹھنڈا تھا۔ عمارت کے پتھروں پر ایک گڑھا نظر آ رہا تھا جس پر اینٹیں چن دی گئی تھیں۔ غالباً کوئی بیٹھی ہوئی قبر تھی۔

اس پر اسرار ماحول میں عظمت علی کو ایک عجیب سی دہشت محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس نے اظہار نہیں کیا متاب عالم کو نہ جانے کیا سوچھی اس نے قبر سے اینٹیں ہٹانی شروع کر دی تھیں۔

”یہ یہ کیا کر رہے ہیں آپ یہ تو کوئی پرانی قبر معلوم ہوتی ہے۔“ عظمت علی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ متاب عالم نے ہاتھ روک کر ایک لمحے کے لئے گردن گھمائی اور عظمت علی کا بدن کانپنے لگا۔ ”ان آنکھوں میں ایک خوفناک چمک تھی مسور کر دینے والی چمک عظمت علی کا بدن سن ہو کر رہ گیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز نے ساتھ نہ دیا۔

متاب عالم خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہا اور قبر ایک غار کا دہانہ معلوم

عظمت علی دہشت سے کانپ کر رہ گیا۔ متاب عالم نے دونوں چوڑیاں اپنے ہاتھ سے اس کی جیب میں رکھیں اور آگے بڑھ کر تابوت میں جالیٹا۔ اور پھر عظمت علی کے حلق سے دہشت کی چیخیں ابل پڑیں۔ ”تابوت میں ایک استخوانی ڈھانچے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

دہشت کی ایک بھیانک چیخ مار کر وہ قبر کے کھلے ہوئے منہ کی طرف لپکا۔ بدحواسی میں کئی بار نیچے گرا لیکن بالآخر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ مقبرے کا دروازہ اسے کھلا ہوا ملا تھا۔ اس نے دوکان کی طرف دوڑ لگائی۔ دور سے گورکن اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ پورے پندرہ دن گزر گئے تھے۔ عظمت علی نے دوکان کی طرف رخ بھی نہیں کیا تھا۔ اب اس دوکان کی طرف جاتے ہوئے اسے شدید خوف محسوس ہوتا رہا۔ ایک ہفتے تک تو وہ شدید بخار میں مبتلا رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنی داستان کسی کو نہیں سنائی تھی کاروباری معاملات بھی بھلا کسی کو بتانے کے ہوتے ہیں۔

سولہویں دن جب وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا تو دفعتاً اس کی بیوی اس کی گردن کی پشت پر دیکھنے لگی۔

”یہ سفید نشان کیسا ابھر رہا ہے تمہاری گردن پر۔“

”سفید نشان۔“ عظمت علی نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں۔ بالکل کوڑھ کا سا نشان ہے۔“ بیوی سادگی سے بولی لیکن عظمت علی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ پڑی۔

”کک کوڑھ کا نشان۔ کفن کفن آہ سب کچھ کرنا ہو گا ارے کفن۔ جلدی کفن۔“

”عظمت علی — عظمت علی کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“

”مجھے کفن ہو گیا ہے۔ ہائے ایک بار پھر اس قبر میں اترنا پڑے گا اسے کفن دینا پڑے گا۔ پھنس گیا میں تو بری طرح پھنس گیا۔ بیوی مجھے دوسرے کپڑے دو بازار جانا ہے۔“

”کیا ہو گیا تمہیں کیا بک رہے ہو۔؟“

”کپڑے نکالو۔ جب تک میں اسے کفن نہ دوں گا چین نہیں ملے گا۔ ہائے کفن

انسان کے لئے اس دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر میں شدید بیمار ہو گیا اور اس بیماری کے دوران میرا انتقال ہو گیا۔ لیکن میرے کسی بیٹے نے میری خبر بھی نہیں لی۔ نئے صرف میرے ملازموں نے دفن کر دیا اور اس کے بعد آج تک میرا کوئی بیٹا میری قبر پر نہیں آیا۔ یہ قبرستان بہت پرانا ہے۔ گورکن کچی قبروں کو کھود کر زمین ہموار کر دیتے ہیں اور نئی قبر بنا دیتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کسی دن میری باری بھی آجائے گی۔ اب انسان اپنی آخری آرام گاہ میں بھی بے چین ہے چنانچہ پہلے میں وہ اپنا قیمتی صندوق یہاں لے آیا کسی بھی کام کے لئے دولت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میری دولت کسی طور تو میرے کام آئی۔ چنانچہ میں نے سوچا اپنا مقبرہ ہی تعمیر کرا لوں۔ تو میں نے یہ سب کچھ کیا۔ مجھے کسی اور چیز کی ضرورت تو ہے نہیں۔ اب بھی بہت سے زیورات باقی ہیں اور میرا مقبرہ مکمل کے قریب ہے اب میں کم از کم آرام سے سو تو سکوں گا۔ تم نے مجھ سے پوچھا تھا عظمت علی کہ میں تمہاری خدمت کروں۔ تو میرے دوست۔ میرے ذریعہ تمہاری تقدیر ہی بدل چکی ہے کیا تم اس سے انکار کرو گے۔“

”عظمت علی کا تو سر بھی نہیں ہل رہا تھا۔ خوف و دہشت سے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔“

”تم بس ایک آخری کام کر دینا۔ یہ لو“ متاب عالم نے تابوت کے نیچے ہاتھ ڈال کر سونے کی دو چوڑیاں نکالیں۔ ”انھیں رکھ لو۔ میرے لئے عہدہ سے لٹھے کا کفن خرید لینا۔ اور پھر مجھے اس کفن میں لپیٹ کر میری قبر درست کر دینا۔ سمجھتے ہو یہ کام ضرور کرنا ہے۔ اب مجھے اجازت دو۔ موت کے بعد بھی مجھے سب کچھ خود ہی کرنا پڑا ہے۔ بولو یہ کام کرو گے؟“

عظمت علی نے سر ہلانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن کانپنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا۔

اگر تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا عظمت علی تو سمجھ لو کہ میں تمہیں زندہ درگور کردوں گا۔ تمہارے پورے بدن پر کوڑھ نکل آئے گا اور تم کوڑھی ہو کر رہ جاؤ گے۔ میری یہ بات یاد رکھنا۔

کفن۔“ عظمت علی بری طرح کراہ رہا تھا اور اس کی بیوی اسے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔“



## پراسرار مسافر

چاند پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی، رات کے ٹھیک بارہ بجے تھے۔ میں اس پنچر ٹرین میں پہلی بار ہی سفر کر رہا تھا۔ اب تک میرے سفر کے چار گھنٹے گزر چکے تھے ریاست رام پور سے چلے ہوئے ٹرین کو چھ گھنٹے ہوئے تھے اور میں نے اسے مارہرہ سے پکڑا تھا جو رام پور سے تیس میل پر واقع ہے۔

نصف شب کی وجہ سے اسٹیشن بالکل سناں معلوم ہو رہا تھا۔ عمارت کے چند کمرے روشن ضرور تھے مگر یہ روشنی صرف اندر تک ہی کفالت کر رہی تھی۔ میں نے سر ٹکل کر نیم پختہ پلیٹ فارم کو غور سے دیکھا۔ چونکہ ایک گھنٹہ پہلے میرا سگریٹ ختم ہو چکا تھا اور ڈبے میں میرے علاوہ کوئی مسافر بھی نہیں تھا جس سے سگریٹ مستعار مانگ لیتا۔ مگر پلیٹ فارم کی اداسی نے مجھے اور بھی مایوس کیا کوئی خواہنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے مایوس ہو کر سر اندر کر لیا اور دھندلی روشنی میں تازہ اخبار پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ گاڑی رک جانے کی وجہ سے لائٹ بہت مدھم تھی تاہم جلی سرخیاں اب بھی پڑھی جاسکتی تھیں۔

کمپارٹ کا دروازہ کسی نے کھولا تو میں ادھر متوجہ ہو گیا ایک اسمارٹ سے نوجوان نے اعتراض کیا تو قلی کو یہ بکس نیچے رکھنا پڑا بکس اتنا بڑا اور چوڑا تھا کہ دو ایک برتھوں کے درمیان والی تمام جگہ اس بکس سے پر ہو گئی۔ ڈبے میں کوئی مسافر علاوہ میرے نہیں تھا اس لئے اس بکس کی وجہ سے کوئی قباحت بھی نہیں تھی پورا ڈبہ اب بھی خالی پڑا تھا۔ نوجوان میرے سامنے والی برتھ پر آکر بیٹھ گیا اس نے قلی کو اجرت کے علاوہ ٹپ

مائن پر نہ تو اسٹیشن ہی اچھے ہیں اور جو ہیں بھی ان پر کوئی انتظام وغیرہ نہیں کیا جاتا۔ یقیناً جانے بہت سے اسٹیشن تو پانی اور روشنی جیسی بنیادی ضرورتیں بھی پوری کرنے سے قاصر ہیں۔“

نوجوان نے ثفن میں سے چند پوریاں نکالیں اور پھر کانچ کے ایک پیالے میں آلو کی سبزی رکھ کر ڈبہ میری طرف بڑھا دیا۔

”میرا خیال ہے آپ اس بھیٹ کو ضرور سونیکار کریں گے۔“ دیانند نے ادب سے کہا۔

”شکریہ ستیارتھی صاحب۔“ میں شام کو کھاپی کر چلا ہوں اور اس وقت قطعی بھوک نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو بالکل ناممکن بات ہے جناب“ میں ہمیشہ گھر سے بھوکا چلتا ہوں اور ڈبے میں بیٹھ کر کھانے میں بڑا آئند ملتا ہے۔ اب آپ کو میرا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔“ اس نے میرا ڈبہ میرے قریب رکھ دیا۔

”سنئے تو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو بالکل زبردستی والی بات ہے آپ کو بھوک لگی ہے آپ شوق سے کھانا کھائیں۔“

”مگر شرمینا جی۔ میں کبھی تنہا نہیں کھاتا۔ گھر میں بھائی بہن اور کانپور میں دوستوں کے ساتھ۔ اب آپ زیادہ اعتراض نہ کریں۔ آپ کو ہماری قسم۔“ آخر میں اس کا لہجہ بالکل نسوانی ہو گیا تھا۔

دیانند کا خلوص قابل ستائش تھا اس لئے مجبوراً مجھے اس کی پیش کش قبول کرنا پڑی۔ یوں بھی سفر کی وجہ سے کھانا جلد ہضم ہو گیا تھا پھر اتنے خلوص کو ٹھکرانا میری نگاہ میں ایک برائی سے کم بات نہ تھی۔

ہم نے ایک ساتھ کھانا ختم کیا۔ پانی کا انتظام میرے پاس بھی تھا مگر پانی بھی مجھے دیانند کے تھرماس کا پینا پڑا وہ مجھ سے پہلے تھرماس کھول چکا تھا۔

چند پوریاں کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر میں فرحت محسوس کر رہا تھا لیکن سگریٹ کی طلب میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ میں شاید دیانند سے سگریٹ کے بارے میں کچھ کہتا

بھی دی تھی اس کے علاوہ اس کی خوش پوشاکی میرے لئے توجہ کا باعث تھی۔ چار گھنٹے سفر میں منہ باندھے بیٹھا رہا تھا اس لئے ایک ہم سفر آجانے سے اس وقت مجھے دلی مسرت ہوئی تھی اس کی بھوری آنکھوں سے نسوانیت ٹپک رہی تھی۔ گاڑی روانہ ہوئی تو ہماری اجنبیت بھی ختم ہو گئی، میں نے نوجوان کو مخاطب کر کے پوچھا:

”غالباً کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔“

نوجوان نے نہایت خندہ پیشانی سے مسکرا کر جواب دیا:

”جی کانپور تک جانا ہے اور یہ گاڑی آپ جانتے ہیں کل شام تک کانپور پہنچے گی۔“

میں حیران رہ گیا۔ اس نوجوان کی آواز میں بلا کی نسوانیت تھی۔ جب اس نے جواب دیا تو میں یہ سمجھ رہا تھا کوئی لڑکی مجھ سے مخاطب ہے اگر وہ پس پردہ کسی سے گفتگو کرتا تو ہرگز کوئی اسے مرد کہنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ مجھے خاموش پا کر نوجوان بولا۔

”آپ کہاں تک جا رہے ہیں؟ میرا خیال ہے آپ بھی۔“ پھر وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

”آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔“ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحہ کیا۔

نوجوان کا ہاتھ بھی نسوانی ہاتھ کی طرح نرم و نازک تھا۔

پھر میں نے قدرے تامل کے بعد۔ اپنا نام بتایا۔

”آپ کا اسم شریف۔؟“

”دیانند ستیارتھی۔ ڈی اے وی کالج کانپور میں فلسفہ کا لیکچرار ہوں۔“

اس تعارف سے مجھے خوشی تو ہوئی لیکن اب نوجوان کے مقابلے میں خود کو ہلکا پا رہا تھا چونکہ میں ایک معمولی سائبرنس مین ہوں۔ کچھ اسی قسم کے جذبات کا میں نے اظہار کیا مگر نوجوان نے اس کے برعکس میرے ادب و احترام میں کوئی کمی نہ ہونے دی۔ وہ نہایت خوش گفتار اور لطیفہ گو ثابت ہوا یہی وجہ تھی کہ اتنی رات گزر جانے کے باوجود میری آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

”میں تو اس اسٹیشن سے روانہ ہوا ہوں۔“ اس نے اپنا ثفن کی پیراٹھا کر کہا۔ لیکن آپ کافی دور سے سفر کر رہے ہیں یقیناً راستے میں آپ کو بڑی دشواری ہوئی ہوگی اس ذیل

لیکن اپنی فطری خیا کے سبب نہ کہہ سکا۔ مگر دو منٹ بعد یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔

اس نے اپنی اپنی کھولی اور پھر دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں کریوں اے کا ڈبہ اور ماچس موجود تھی۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے سگریٹ کے ڈبے کو دیکھا مگر پھر فوراً ہی دوسری طرف دیکھنے لگا۔ شاید دیانند میری دلچسپی کا راز پا گیا تھا۔

اس نے سگریٹ کا ڈبہ کھول کر میری طرف بڑھا دیا اور کمال شائستگی سے کہا۔

”آپ شوق فرماتے ہوں تو سگریٹ حاضر ہے۔“

”شکریہ۔“ میں نے ایک سگریٹ نکال لیا اور جب دیانند بھی اپنی سگریٹ ہونٹوں میں دبا چکا تو اس نے ماچس جلا کر پہلے میری سگریٹ جلائی پھر اپنی سگریٹ سلگانے لگا۔

میں درمیانے درجے کا سگریٹ پیتا ہوں اتنی اعلیٰ سگریٹ بس کبھی کبھار ہی پی ہے شاید اسی لئے چند کش لینے کے بعد میرا جسم سناٹے میں آگیا۔ میں نے سوچا۔ شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ میں نے بہت دیر سے سگریٹ نہیں پیا ہے۔ دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ اعلیٰ کوالٹی کے سگریٹ میں نشہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔“

سگریٹ ختم ہونے سے پہلے ہی میری حالت غیر ہو گئی۔ اب میں بالکل مجھول سا ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ جلتا ہوا سگریٹ بھی برتھ پر ہی گرا دیا جسے دیانند نے بچھا کر باہر پھینک دیا۔ دیانند اسی وقت اٹھ کر کھڑکیاں بند کرنے لگا پھر وہ دروازہ اندر سے بند کر کے واپس آگیا۔ اب اس کے چہرے پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھ جا رہا تھا۔ تڑپنے بنے اور بولنے کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ میرے حواس خمسہ پوری طرح بیدار تھے مگر قوت عمل بالکل مفقود ہو چکی تھی۔

اور جب دیانند نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا تو میری حالت ایک اپانج سے مشابہ تھی۔ دیانند نے مجھے سیٹ سے اٹھا کر پیچھے پر لٹا دیا اس کے بعد وہ چابی سے بڑے ٹرنک کا دروازہ کھولنے لگا میں اس کی تمام حرکات دیکھ رہا تھا ہر آہٹ سن رہا تھا مگر زبان بولنے سے معذور تھی۔ ٹرین اپنی عمومی رفتار سے چھک چھک کرتی چلی جا رہی تھی۔ ان دنوں تمام گاڑیاں کوئلے سے چلا کرتی تھیں اور ایسی گاڑیاں چھوٹے اسٹیشنوں پر بھی کافی

دیر رکا کرتی تھیں۔

میل ٹرینوں کے مقابلے میں ان گاڑیوں میں تکلیف تو زیادہ ہوتی تھی۔ مگر گاؤں اور قصبات کے باشندوں کو ایسی گاڑیاں بہت مناسب رہتی تھیں اول تو ہر اسٹیشن پر رکنے کی وجہ سے سواریاں آرام سے چڑھ اتر سکتی تھیں پھر یہ کہ ان گاڑیوں کی تعداد بھی خاصی تھی جس کی وجہ سے ٹرین میں زیادہ رش بھی نہیں ہوتا تھا۔

پندرہ بیس منٹ گزر چکے تھے غالباً کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔ گاڑی کی رفتار کچھ کم ہو گئی تھی مگر دیانند نے کمال مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے اسی وقت ٹرنک کا تالہ کھول دیا بعد ازاں اس کا بھاری بھر کم اوپری ڈھکن اٹھا دیا اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ میں حیرت سے اس نوجوان کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے قریب رک کر پینے ایک نظر مسکرا کر میری جانب دیکھا پھر مجھے دونوں ہاتھوں پر لاش کی مانند اٹھالیا۔

عجیب بے بسی کا عالم تھا وہ بھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اب وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے مگر صرف سوچ کر رہ گیا۔

اس کج بخت سگریٹ نے مجھے زندہ لاش میں منتقل کر دیا تھا۔

دیانند نے مجھے آہستہ سے صندوق میں لٹا دیا۔ یہ صندوق یوں لگتا تھا جیسے میرے ناپ سے ہی بنایا گیا تھا جب نوجوان مجھے لٹا کر ہٹ گیا تو پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میرے برابر کوئی دوسرا جسم بھی موجود ہے۔

میں کسی گوشت پوست کے انسان کے قریب ہی بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا برابر والے جسم کی گرمی اور ساخت کا اندازہ اس کی قربت سے واضح ہو رہا تھا اور میں یہ جان چکا تھا کہ یہ بھی میری طرح کوئی اس بلا کا شکار ہے۔

”کاش اس وقت میں آزاد ہوتا۔ میرے سامنے اس دبلے پتلے لیکچرار کی کیا حقیقت تھی میں اسے دو ہاتھوں میں سیدھا کر دیتا۔ مگر دائے ناکامی کے۔ میں تو ہل جل بھی نہیں سکتا تھا۔

دیانند نے ٹرنک کا ڈھکنا بند کر کے پھر قفل لگا دیا۔ ٹرین اب کافی آہستہ ہو چکی تھی وہ شاید رکنے والی تھی۔ دھچکے کم ہوتے ہوتے انہی کی حد تک رہ گئے تھے۔ اور اب یوں

لگتا تھا جیسے گاڑی پانی پر تیر رہی ہو۔ پھر معمولی سا دھچکا لگا اور زنجیریں بجنے کی آواز پیدا ہوئی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر کھڑی ہو گئی تھی۔

عجیب و غریب صندوق تھا وہ بھی۔ آج بھی سوچتا ہوں تو روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے حالانکہ میں اس میں بند تھا اور بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اس کے باوجود کسی قسم کی گھٹن کا احساس نہیں تھا نہ معلوم کس طرف سے اندھیری گور میں تازہ ہوا آرہی تھی بہر حال تاریکی دل کو ہولائے رہی تھی لیکن خوف کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ دوبارہ جب ٹرین آگے روانہ ہوئی تو میں کسی قدر مطمئن ہو چکا تھا۔ میں نے تن بہ تقدیر حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور ہر مصیبت جھیلنے کے لئے خود کو آمادہ کر چکا تھا۔

دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ٹرنک کا تالا آواز کرنے لگا، دیانند نے قفل کھول دیا تھا۔

ٹرنک کا دروازہ کھلتے ہی تازہ ہوا اور روشنی بکس میں دوڑ آئی۔ میں نے دیکھا دیانند کے بجائے ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ ٹرنک پر جھکی ہوئی اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور باریک ساڑھی میں اس نوجوان لڑکی کا سرخ سپید جسم کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اس نے گلابی ساڑی کے ساتھ گلابی کلدانی کا بلاؤز پہنا ہوا تھا اور دلہن کی طرح زیورات سے آراستہ تھی اس کے جسم سے پھونتی ہوئی سوندھی خوشبو میرے دل و دماغ کو تازہ کر رہی تھی۔ وہ دلکش انداز میں مسکراتی جا رہی تھی۔

مجھے اس نے با آسانی اس قبر سے نکال کر پھر سے برتھ پر ٹیک لگا کر بیٹھا دیا اور ایک بار پھر سے ٹرنک کا قفل لگانے لگی کپارٹ میں اب بھی میرے اور اس کے علاوہ کوئی تیسرا پنجر نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرا اور دیانند کا سامان جوں کا توں رکھا تھا۔ بھوری آنکھوں والی یہ دوشیزہ دیانند کی بہن معلوم ہوتی تھی۔

اب میں سخت حیران تھا کہ چند منٹ قبل اس کپارٹ میں دیانند موجود تھا اچانک وہ کہاں چلا گیا۔ اور یہ دوشیزہ اتنی جلدی کہاں سے آگئی۔ بالفرض وہ پچھلے اسٹیشن سے سوار ہوئی تھی تو اس کا سامان کہاں ہے اور کیا وہ بالکل تنہا سفر کر رہی ہے یہ مجھ مان لیا جائے کہ

وہ تنہا سفر کر رہی ہے تو پھر دیانند کہاں گیا۔ اگر دیانند کے لئے یہ سوچا جائے کہ وہ پچھلے اسٹیشن پر اتر گیا تھا تو اس کا سامان کپارٹ میں کیوں ہے؟

پھر میں غور سے اس دوشیزہ کو دیکھنے لگا جو اس سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں دیانند بیٹھا تھا اوہ۔ اچانک میرے دل نے کہا، یہ تو دیانند ہی ہے بالکل وہی نقش و نگار ہیں وہی آواز فرق صرف لباس اور بالوں کا ہے پہلے دیانند سر پر ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا اور سوٹ میں ملبوس تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے سامنے والی برتھ پر گرے رنگ کا وہی سوٹ رکھا ہوا دیکھا جو دیانند نے پہن رکھا تھا۔

”کیا سوچ بچار ہو رہا ہے۔“ دوشیزہ نے مسکرا کر کہا اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا آواز میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اچھا تو یہ دیانند ہی ہے نہیں بلکہ یہ وہ عورت ہے جو پہلے دیانند بن کر مجھ سے متعارف ہوئی تھی اور مجھے پوریاں کھلائی تھیں اس کے بعد سگریٹ۔ اوہ کس قدر عجب تھی وہ سگریٹ، میرے لب ہل بھی نہ سکے حالانکہ میں دنیا جہاں کی باتیں سوچ رہا تھا۔ دوشیزہ اب تک میری جانب میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میری نگاہوں میں ہزاروں سوالات تھے مگر اس کے بشرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ نہیں بتانا چاہتی پھر وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس بار لڑکی نے برتھ پر رکھا ہوا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور اس میں سگریٹ نکال کر میرے قریب آگئی اس کے دوسرے ہاتھ میں ماچس دبی ہوئی تھی۔

لڑکی نے ایک سگریٹ جبراً میرے ہونٹوں میں گھسیڑ دی حالانکہ میں ہرگز دوبارہ اس مصیبت کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا مگر اس وقت میرا کوئی عمل میرے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔

ڈبہ اس نے پھر سے برتھ پر رکھ کر ماچس جلائی اور میرا سگریٹ سلگا دیا۔ غیر ارادی طور پر میں سگریٹ کے کش لینے لگا اس بار بھی پہلا کش لیتے ہی مجھ سے بیضا رہنا دو بھر ہو گیا۔ میں اب تک برتھ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا مگر اب لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا میرا دماغ گھوم رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے پوری گاڑی پھر کسی کی مانند گولائی میں چکر کھا

رہی ہے۔

نہ معلوم کب تک یوں ہی بے سدھ پڑا رہا دوبارہ جب آنکھ کھلی تو لڑکی کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کیں۔

”اٹھئے۔ اب صبح ہونے والی ہے“ اس نے اپنا نرم و نازک بدن میرے جسم سے مس کر کے کہا۔

اس وقت میری حالت دیدنی تھی۔ میرے لئے یہ سب کچھ ایک خواب کی سی کیفیت سے زیادہ نہیں تھا۔ ایسا خواب جس میں کبھی لرزادینے والے واقعات سامنے آتے ہیں اور کبھی اتنے رومانی مناظر کہ انسان خود پر قابو نہ رکھ سکے۔

یہ منظر اتنا ہی جذباتی تھا کہ میں بے اختیار ہو سکتا تھا مگر ذہن پر گزشتہ واقعات کا غبار چھایا ہوا تھا۔ فی الحقیقت میں اب تک سخت خوفزدہ تھا۔ یہ سارے واقعات میرے نزدیک بالکل غیر فطری تھے اور میں دل ہی دل میں اس کو بدروح سمجھ بیٹھا۔ اور اب خدا جانے مجھ سے وہ کیا کام لینا چاہتی ہے۔ ضرور یہ کوئی نازیبا حرکات کی مرتکب ہوگی اور مجھے بھی کسی ایسے ہی گورکھ دھندے میں الجھائے گی۔ یہ سوچ کر میں جان چھڑانے کی فکر میں تھا مگر میرے حواس پر اس کی حسین قربت کا اثر بھی ہو رہا تھا لڑکی کے لباس سے خوشبو کے بھپکے میری ناک میں داخل ہو رہے تھے اس نے اپنے نصف جسم کا سارا بوجھ میرے بدن پر ڈال کر مجھے از خود رفتہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی تاہم میں خود پر جبر کر کے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

اچانک لڑکی نے اپنا خوبصورت منہ میرے قریب لا کر بڑے پیار سے کہا۔

”گوتم بابو۔ کیا ابھی اور سونے کا وچار ہے دیکھو صبح ہونے والی ہے پورب میں پھنسنے لگی ہے۔“

میں نے ہاتھ اٹھانا چاہا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اب میرا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے پورے جسم کو ایک دم اس لڑکی سے الگ کر لیا اس ثابت کی وجہ سے لڑکی کا سر برتھ سے ٹکرا گیا تھا اور خود میرے بھی ہلکی سی پٹ آئی تھی۔ مگر پھر سے تندرست ہونے کی خوشی میں مجھے اس چوٹ کا رتی بھر احساس نہیں ہوا۔

”تم کون ہو؟ اور یہ تم مجھے گوتم بابو کیوں کہہ رہی ہو۔“ پہلی بار خوفزدہ لہجے میں میں نے اس سے کہا۔

”میں تمہاری دھرم پتی رادھا ہوں۔ راجن گڑھ کے پنڈت رام دیال کی بیٹی۔“ وہ مسکرا کر بولی اور پھر رک کر بولی۔ ”اور تم میرے پتی دیو ہو گوتم بابو پنڈت کشن لال کے پتر‘ راجن گڑھ سے چار میل دور گوتمی کے کنارے تمہارا گاؤں اور میری سسرال ہے تم تو اس کا نام بھی بھول گئے ہو گے۔ خیر میں بتاتی ہوں اس گاؤں کا نام ہے نرائن گنج۔ یہ کانپور سے صرف دو میل دور ہے اب تو وہ بھی شہر سے مل گیا ہے یہاں کی آبادی میں بھی زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ گوتمی کے کنارے پر آباد ہونے کے کارن یہاں ہر وقت یاتریوں اور اشراف کرنے والوں کا آنا جانا رہتا ہے پھر کنارے پر بنے ہوئے مندر اور شمشان یہ سب گاؤں کو شہر بنانے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔“

”یہ بکواس ہے فراڈ۔“ میں نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”میں گوتم بابو نہیں ہوں۔ اور کچھ بتاؤں یہ کہ میرے گاؤں کا نام نرائن پور نہیں بلکہ میں‘ مارہرہ کا باشندہ ہوں۔“ میں نے نہایت جلع کئے لہجے میں کہا تھا مگر رادھا مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ برتھ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور بے اختیار چوڑیوں اور زیورات سے لبریز گوری بانیں میرے گلے میں حائل کر دیں۔

میں نے احتجاج کے طور پر ان بانوں کو الگ کرنا چاہا مگر نرم و نازک ہاتھ اس وقت آہنی سلاخوں کی مانند سخت ہو گئے تھے۔

”تم آخر کیا بلا ہو۔“ میں نے زچ ہو کر کہا۔ ”اور مجھ سے کیا چاہتی ہو۔“

”صرف ایک ماہ کے لئے تم سے چند کام لینے ہیں مگر ایک شرط پر۔ میں تمہیں اس کا معاوضہ دوں گی اس کی دو صورتیں ہیں اگر تم کام کے بدلے معاوضے میں رقم چاہو گے تو دے دی جائے گی اس صورت میں تمہیں میرے جسم سے کوئی مطلب نہ ہو گا۔“

لیکن میں نے اس کی بانیں ہٹا کر کہا۔ ”پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو پھر یہ کہ اس کام کے صلے میں مجھے کیا معاوضہ دیا جائے گا۔ ہاں میں ایک بات صاف طور سے بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں شادی شدہ آدمی ہوں اور تعلیم یافتہ بھی۔

پراسرار بڑا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اس نے قفل کھولا اور جب ڈھکنا اٹھایا تو میرے لئے ایک اور خوفناک منظر موجود تھا۔

بکس میں رکھا ہوا انسانی جسم میرا اپنا جسم تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اسے چھو کر دیکھا۔ مگر وہ جسم تو بالکل ٹھنڈا تھا بالکل مردہ۔ حالانکہ وہ مکمل میرا جسم تھا میزالباس پہنے ہوئے۔

”یا اللہ۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں زندہ بھی ہوں اور میرے سامنے میرا فوت ہوا جسم بھی موجود ہے۔ وہ جسم ایک ناقابل تردید حقیقت کے روپ میں میرے سامنے تھا۔

میں نے خوف بھری آنکھوں سے رادھا کی طرف دیکھا مگر رادھا نے اسی وقت مسکرا کر ڈھکنا بند کر دیا اور پھر سے قفل لگا دیا۔ جب ہم واپس اپنی سیٹوں کی طرف آ رہے تھے تو گاڑی آہستہ ہو گئی تھی شاید کوئی اسٹیشن نزدیک تھا۔ اس بار بھی ہم کھڑکی کے قریب والی دو سیٹوں پر بیٹھے جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں۔

صبح کاؤب ہو چکی تھی اندھیرا چھٹنے لگا تھا اور میں سوچ رہا تھا آج کا سورج میرے لئے نہ معلوم کیا مصائب لے کر آ رہا ہے۔

پھر میں نے اپنے دل سے چند سوالات کئے۔ میں نے کہا۔

”کیا میں اس بلا سے بچ سکتا ہوں۔“ جواب میں دماغ نے کہا ”ہرگز نہیں۔“

پھر میں نے سوچا۔ ”کیا میں اس خوبصورت بلا کو دھوکہ دے کر نکل سکتا ہوں“ اور اگر نکل گیا تو کیا سعیدہ (میری بیوی) اور دیگر گھروالے مجھے پہچان سکیں گے، اپنا سکیں گے۔“

اس بات کا جواب بھی نفی میں تھا۔ پھر میں نے سوچا۔ ”اچھا تو اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

”قسمت پر بھروسہ کر کے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہئے۔“ دماغ نے جواب دیا۔

میں بے اختیار ہو کر دل ہی دل میں خود کو کوئٹے لگا کر کیوں کانپور جانے کا قصد کیا۔ خالہ زاد بھائی کی شادی کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ مگر دماغ نے اس کے خلاف بھی مجھے

میری بیوی بہت خوبصورت ہے اور شادی کو صرف ایک سال ہوا ہے۔“

”یہ میں نے اس لئے کہا کہ تم جان لو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میں تم سے جسمانی رشتہ ہرگز نہیں رکھنا چاہتا بلکہ میں تو اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔“

رادھا بڑے اطمینان سے مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے ایک لفظ کے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور ہاتھ روم کی طرف چل دی۔ ہاتھ روم کا دروازہ کھلا تو سامنے لگے ہوئے شیشے میں مجھے اپنی شکل نظر آئی اپنی شکل دیکھ کر ایک دلدوز چیخ میرے منہ سے نکل گئی میرے اپنے وجود کی بجائے ایک دوسرا جسم موجود تھا جس سے میری کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ اب میرے سر پر ایک چھوٹی سی چوٹی بھی تھی جیسے ہندو رکھتے ہیں اس کے علاوہ چہرے کے نقش و نگار جسمانی سختی حتیٰ کہ قد میں بھی فرق آچکا تھا۔

میرا دماغ اس وقت بھی میرا ہی دماغ تھا مگر جسمانی طور پر میری حالت یکسر بدل گئی تھی۔

”اوہ۔“ میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ رادھا اب بھی میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ پھر میں نے اپنے شانوں پر اس کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ سر اٹھا کر دکھ بھری نظروں سے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اب رادھا کی نگاہوں میں بلا کی شفقت نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور میں دھیرے دھیرے اٹھ کر اس کے برابر ہی کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

”سنو جی۔ میں آپ کو زیادہ کشت نہیں دوں گی آپ کیول ایک ماہ اپنی زبان بند رکھنے کا وعدہ کریں۔ اس ایک ماہ میں آپ کے لئے بہت سی عجیب باتیں ہوں گی مگر ان کا سمبندھ آپ کی ذات سے نہیں ہو گا اور نہ آپ کو کوئی کشت بھوگنا پڑے گا۔“

”مگر رادھا دیوی۔“ میں نے پہلی بار اس کا نام لیا۔ اس بار وہ کھل اٹھی تھی۔ ”یہ کیا اسرار ہے کہ میں دفاعی طور سے۔“ رادھا نے میری بات کٹ کر کہا۔

”ان باتوں کے لئے ابھی سے من میں اندیشوں کو جگہ مت دو، اگر دیکھنا چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ چابیاں سنبھالتی ہوئی ایک بار پھر ان برتھوں کے درمیان آگئی جہاں وہ



ساتھی ہے اور یہ حالت ناشتے کے بعد سے شروع ہو گئی تھی۔

دھیرے دھیرے میں سفر سے لطف اندوز ہونے کے لئے رادھا کو چھیننے لگا۔ رادھا نئی بیانی دہنوں کی طرح حجاب سے کبھی مسکرا دیتی کبھی گرم نگاہوں سے دیکھ لیتی۔ گاہے بہ گاہے پیار کی ایسی میٹھی نظر میرے چہرے پر ڈالتی کہ مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ اس کے باوجود میں اپنی سیٹ سے چٹنائی رہا۔

”اس سوٹ کا کیا کرنا ہے۔“ میں نے رادھا سے اس پر اسرار سوٹ کے بارے میں پوچھا جو اب تک بالائی برتھ پر رکھا تھا۔ ایک منٹ تک رادھا نے جواب نہ دیا۔ مگر جب میں نے دوبارہ پوچھا تو وہ بولی۔

”اے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لوںاتھ۔“ اس کی آواز میں بلا کی خود سپردگی موجود تھی۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی اور تازہ اخبار دیکھنے لگا جو پچھلے اسٹیشن سے خریدا تھا۔

دوپہر سے پہلے ایک ایک کر کے تمام مسافر اتر گئے اور ہم لوگ ایک بار پھر تنہا رہ گئے۔ ہمارا سفر تو شام تک تھا اور یہ مصیبت بہر حال گزاری ہی تھی۔ تنہائی مٹی تو میں نے پہلی بار پیار سے رادھا کا ہاتھ تھامنا۔ اس نے روٹھے ہوئے انداز میں میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ”بابو جی“ ابھی سے وعدہ خلائی شروع کر دی۔

شرمندہ ہو کر میں نے رادھا کی کلائی چھوڑ دی۔ مگر وہ اپنی سیٹ سے اٹھ چکی تھی۔ ہم دونوں قریب والی ایک لمبی برتھ پر ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئے اس طرح مجھے کافی سرور آ رہا تھا رادھا کے جسم کی گرمی نہایت لطیف تھی۔

”ایک بات بتاؤ گی۔“ میں نے اس کی ٹھوڑی کو اٹھا کر کہا۔

”شرم سے رادھا کی آنکھیں بند ہو گئیں وہ اس وقت بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ مگر میں اپنے وعدے پر قائم تھا۔“

”تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ اور میں اپنے بارے میں بھی“ تاکہ میں اپنے ذہنی خلفشار سے بھی بچ جاؤں اور تمہارے لئے کار آمد آدمی ثابت ہو سکوں۔“

”کیا معلوم تھا کہ ایسے واقعات سے سابقہ ہو گا اور پھر دماغ کی اس بات کی دل نے بھی تصدیق کر دی۔ یہ کوئی نہایت بڑا اسٹیشن تھا یہاں گاڑی نصف گھنٹے تک کھڑی رہی۔ پلیٹ فارم پر کافی چہل پل تھی اور گاڑی رکتے ہی چند مسافر ہمارے ڈبے میں بھی آ گئے تھے۔ یہ لوگ ہم سے مٹی دور ہٹ کر الگ بیٹھے تھے۔ شاید رادھا کو دیکھ کر ان لوگوں نے یہی سوچا ہو کہ میں اپنی دہن کو رخصت کر کے لا رہا ہوں۔ رادھا لباس اور زیورات کی وجہ سے دہن معلوم ہو رہی تھی۔

میں نے ایک بار دی چائے والے کو قریب بلا کر چائے اور ناشتہ لانے کو کہا۔ میرا فوراً ہی آرڈر لے کر چلا گیا۔ اب رادھا نے دوسرے لوگوں کی آمد کی وجہ سے تھوڑا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا وہ اس وقت شرمیلی گزیا سی لگ رہی تھی ذرا دیر پہلے کی رادھا اور اس دہن میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

میرا چائے اور ناشتہ لے آیا۔ میں نے ضد کر کے اپنے ساتھ رادھا کو بھی ناشتہ کرایا لیکن وہ بری طرح شرما رہی تھی جب میرا برتن لے جا رہا تھا تو میں نے اسے نوٹ دے کر سگریٹ منگایا وہ فوراً ہی مطلوبہ سگریٹ کے چند پیکٹ دے گیا۔

کانپور اب بھی بہت دور تھا۔ ایک بار تو میں نے سوچا کیوں نہ کسی بڑے اسٹیشن سے میل گاڑی پکڑ لی جائے تاکہ دن بھر کی جھک جھک سے نجات مل جائے مگر رادھا اس بات پر آمادہ نہیں تھی مجبوراً مجھے اس ٹرین میں سفر جاری رکھنا پڑا۔

اب میرے لمبے چوڑے جسم پر بوسکی کی قیض اور سفید باریک سی دھوتی تھی کانوں میں راج کماروں کی مانند سفید ہیرے بھی پڑے ہوئے تھے اس میں ج دھج میں بلا کی قدامت تھی اور یہ جسم میرے لئے بالکل نیا تھا۔ میں جو کلین شیو رہنے کا عادی تھا اب میرے چہرے پر ٹھاکوں کی مانند بڑی بڑی مونچھیں اگی ہوئی تھیں۔

فروری کی درمیانی تاریخیں تھیں موسم اتنا خوشگوار تھا کہ خود بخود طبیعت میں امنگیں پیدا ہو رہی تھیں نہ جانے کیوں اب میں اپنی سابقہ زندگی سے دور سا ہو گیا تھا اور پوری طرح رادھا کی طرف راغب نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے رادھا میری جنم جنم کی

”آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی بابو جی میں ابھی یہی بات کہنے والی تھی۔“  
میں خاموش ہی رہا میری توجہ دیکھ کر ذرا توقف کے بعد راواہانے کہا:

”بہت دن پہلے کی بات ہے، یوں سمجھ لو جگ بیت گئے نرائن پور اس سے کانپور سے بیس میل دور ایک بڑا سا شہر تھا۔ یہ پنڈت رام نرائن کی ریاست تھی اور اس ریاست میں دو قومیں آباد تھیں پنڈت اور ٹھاکر، چونکہ پنڈتوں کی حکومت تھی اسلئے ریاست کے ٹھاکران سے دبے رہتے تھے۔ ریاست میں کبھی جھگڑا فساد نہیں ہوتا تھا۔

ہم نے جس جنم میں اس ریاست میں آنکھ کھولی اس سے تمہارے پتا کشن لال گدی پر براجمان تھے تم ان کے اکلوتے بیٹے اور ریاست کے راجکار تھے میں نے بھی تمہاری ریاست کے ایک زمیندار پنڈت رام دیال کے گھر میں آنکھ کھولی تھی ان کے چار بیٹے تھے اور میں اکلوتی بیٹی۔ بڑے لاڈ پیار سے میری پرورش ہوئی ریاست میں ہمارا بڑا سلمان تھا راجہ سے ہماری رشتہ داری ہوتی تھی اس کارن ہمیں ایک جاگیر ملی ہوئی تھی۔

پتاچی بوڑھے ہو گئے تھے اور جاگیر کی دیکھ بھال بھائیوں نے شروع کر دی تھی۔ اب میں بھی عیانی ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ہندو رسم و رواج کے مطابق لڑکیوں کی شادی باہر ہوا کرتی تھی۔ ہندوؤں میں اب بھی یہی طریقہ رائج ہے۔ یہ لوگ ذرا سی بھی رشتہ داری نکل آنے کی صورت میں بیٹی نہیں دیتے۔

لیکن بابو جی۔ میرے ساتھ قسمت نے ایک عجیب مذاق کیا۔ ایک دن جب ریاست میں زبردست میلہ لگا ہوا تھا اور میں سیلیوں کے ساتھ کھیل تماشے دیکھتی پھر رہی تھی ایک جگہ دھڑ سے آئے ہوئے بہادروں کا دنگل ہو رہا تھا۔ یہ دنگل کشتی کا دنگل نہیں تھا بلکہ ہتھیاروں سے جگمگ لڑنے کا دنگل تھا اور اسی دن پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا یعنی راج کمار گوتم بابو کو۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام یودھاؤں کو شکست دے دی اور بس اسی دن وہ میرا من بھی جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔

میں آخر تک تماشہ دیکھتی رہی اور جب راج کمار سبے پا کر مخلوں کی طرف جانے لگا تو میں نے انہیں راستے میں روک کر بدھائی دی۔ میری نگاہیں ان کے چوڑے چکلے سینے اور لمبے بازوؤں پر تھیں ان کے لمبے بال اور بڑی بڑی آنکھیں میرا من ہر لے گئیں۔

میری کلپنائیں راجکار سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ وہ میرے بالکل قریب آکر بولے:

”سچ بتا راواہا کیا یہ سچ ہے کہ تو نے مجھے بدھائی دی ہے اور یہ جو تیری نظریں“

میں نے بات کاٹ کر کہا: ہمارا ج نظروں کی بات چھوڑو ذرا میرے من سے پوچھو۔“ اتنا کہہ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ لاج کے مارے اور کوئی شبد منہ سے نہ نکل سکا۔ میری سکھیاں ذرا دور تھیں میں پھر ان میں جا ملی مگر راج کمار بہت دیر تک وہیں کھڑے میری طرف دیکھتے رہے۔ ہماری حویلی راج محل کے قریب تھی۔ اس دن کے بعد میں اکثر راج کمار سے ملنے محل جانے لگی۔ میرے وہاں جانے میں کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ ہماری قربت داری پہلے ہی تھی پھر ہم بھی جاگیر دار تھے اور پڑوسی بھی۔

محل میں کئی بار ایسا ہوا کہ راج کمار مجھے تنہائی میں مل گئے ایک شام اف کتبی رنگین تھی وہ شام، دن بھر برکھا ہوتی رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی دکھپارے کے آنسو ہیں جو تھکتے ہی نہیں مگر شام سے پہلے بارش ختم گئی۔ موسم بہت سمانہ ہو گیا تھا۔ میرے من میں راج کمار کی یاد کروٹیں لینے لگی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں اسی وقت ان سے ملنے راج محل چلی گئی اتفاق کی بات وہ بھی اپنے محل کے باہر مل گئے۔ اس دن میں نے پیلا بستی جوڑا پہنا ہوا تھا اور اس لباس میں میرا شریر سرسوں کے پھول کی مانند لگ رہا تھا۔

اس شام پہلی بار میرے ہونٹوں نے امرت رس چکھا تھا اور بس اس رات کے بعد میں راجکار کے پریم میں دیوانی ہو گئی ہمارا پریم زیادہ دیر تک بستی والوں کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ریاست کا ہمارے بعد سب سے بڑا زمیندار ایک ٹھاکر پر تپ سنگھ تھا۔ پر تپ سنگھ کی حویلی بھی ہمارے قریب میں تھی اس کی بہنیں میری سکھیاں تھیں اور اکثر ہماری حویلی میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ مگر جب سے میں نے راجکار کو دیکھا تھا میرا من کہیں نہیں لگتا تھا میں جب بھی موقع ملتا راج محل نکل جاتی۔

ایک رات جب میں اپنی حویلی کی طرف جا رہی تھی تو پر تپ سنگھ راستے میں مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا:

”ارے راواہا اتنی رات گئے کہاں سے آرہی ہے۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ لپک کر میرے سامنے آگیا۔ اس طرح

مگر تقدیر کی خرابی میرے ارادوں کا مذاق اڑا رہی تھی۔

ایک ماہ بعد میرا لگن طے ہو گیا اتفاق سے میرا ہونے والا بچی لگن کے سے وطن واپس آ گیا ابھی تک ہمارے خاندان والوں نے بر نہیں دیکھا تھا اس لئے دولہا کو لگن کے سے ریاست میں طلب کیا گیا مگر قاعدے کے مطابق وہ ہمارے گھر نہیں ٹھہر سکتا تھا اس لئے پر تپ سنگھ نے دولہا والوں کو اپنی حویلی میں ٹھہرایا۔ پر تپ سنگھ کی ان لوگوں سے جان پہچان تھی۔

میں نے رو کر اپنی جان ہلکان کر لی تھی میرا شریر پیلا پڑ گیا تھا۔ مگر گھر والوں نے اس بات کو عام لڑکیوں کا دکھ سمجھا۔ ادھر راج کمار غم سے دوہرا ہو گیا تھا وہ اپنی زبان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا مگر اپنے سامنے اپنی ریاست سے میری ڈولی اٹھتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا تھا۔ ”میں ضرور کوئی تدبیر کروں گا۔“ بس اسی پلت سے میری ہمت بندھی تھی۔ لگن کا سے آ گیا تھا۔ دولہا والے کافی دور سے آئے تھے وہ لوگ دوپہر کو آ کر پر تپ سنگھ کی حویلی میں ٹھہر گئے۔ شام کو سب لوگ اکٹھے ہو گئے اور بڑی دھوم دھام سے لگن ہو گئی۔ قاعدے کی رو سے ایک رات کے لئے میری رخصتی کر دی گئی۔ دولہا والوں نے پر تپ سنگھ کی حویلی کو ہی میری سہاگ رات کے لئے مناسب سمجھا۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اس میں ایک کمرہ میرے لئے سجا دیا گیا۔ رات کو بہت دیر تک پر تپ سنگھ کی بہنیں اور گاؤں کی اور دوسری لڑکیاں مجھے چھیڑتی رہیں میری آنکھ کا آنسو بند نہ ہوتا تھا۔ بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ اب میں راج کمار کی طرف سے بھی بایوس ہو گئی تھی اب ہو بھی کیا سکتا تھا میں پرانی ہو گئی تھی اور آج رات کے بعد میں اس قابل ہی کہاں رہوں گی کہ راج کمار کو منہ دکھا سکوں۔ میں نے اپنے من میں سوچا پھر میں نے ایک بھیانک فیصلہ کر لیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ صبح کو گھر جا کر خود کشی کر لوں گی۔ اگر اس وقت میں دلہن بنا کر کمرے میں بند نہ کر دی گئی ہوتی تو اسی سے خود کشی کر لیتی۔

میرا بچی واقعی بہت سندر تھا۔ میں نے لگن کے سے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی اس وقت مجھے آنسو بہانے سے فرصت ہی کہاں تھی بس ایک دو منٹ کو تھک کر چپ ہو گئی تھی۔

میرا راستہ رک گیا۔ میں نے ناراض ہو کر کہا:

”دیکھ پر تپ۔ میرے راستے سے ہٹ جاو رنہ۔“

اس نے میری بات کاٹ کر کہا:

”ورنہ کیا۔ راج کمار سے کہہ کر کولو میں پلوادے گی۔“

اس کی باتوں پر غصہ تو مجھے بہت آیا تھا مگر میں نے ضبط سے کام لیا اور خوشامدانہ لہجے میں کہا:

”پر تپ بھیا۔ مجھے جانے دو ماما جی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”اچھا جی ہم بھیا ہو گئے۔“ وہ جل بھن کر بولا ”اور وہ راج کمار تیرا کون ہے اس کے پاس رات رات بھر رہے پڑی تو ماما جی ناراض نہیں ہوتیں اور ہمارے ذرا روکنے سے ناراض ہو جائیں گی۔“

وہ یہ کہتا ہوا میرے بالکل قریب آ گیا تھا اس کی آنکھوں میں شیطان ناچ رہا تھا اور میں دل ہی دل میں سہمی جا رہی تھی۔

اتفاق ہے کچھ دور آہٹ ہوئی تو پر تپ سنگھ چلا گیا ورنہ اس دن رام جانے وہ پاپی کیا کر گزرتا۔

میں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی۔ میں نے سوچا اگر کوں گی تو میری بدنامی ہوگی ہاں اب میں بہت احتیاط کرنے لگی تھی میں زیادہ دیر تک راج محل میں بھی نہیں رکتی تھی کئی بار راج کمار نے مجھ سے شکایت کی مگر میں ہنس کر ٹال گئی تھی۔

پر تپ سنگھ میرے پیچھے پڑ گیا تھا نہ معلوم کیسے وہ سمجھ لیتا تھا کہ آج میں راج کمار سے ملنے جاؤں گی کئی بار میں نے راج کمار کو پر تپ سنگھ کی حرکتوں کے بارے میں بتایا۔ وہ بہت ناراض ہوا کہ یہ بہت پہلے کیوں نہ بتائی پھر ہم بہت دیر تک اس مصیبت سے بچنے کے لئے تدبیریں سوچتے رہے لیکن بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی راج کمار اپنے رشتے کی بات اس لئے نہیں کر سکتا تھا کہ ہماری اس سے رشتہ داری تھی ایسی صورت میں شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنے پریمی سے صاف شبدوں میں کہہ دیا تھا۔ ”میں جان دے دوں گی مگر اپنے شریر کو کسی غیر کا ہاتھ نہیں لگنے دوں گی۔“

باہر ولایت میں رہ کر پتی کو شراب پینے کی عادت پڑ گئی تھی اور یہاں جب پر تپ سنگھ سے ان کی ملاقات ہوئی تو وہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ انہیں ایک بہترین ساتھی مل گیا ہے۔ پر تپ سنگھ ان سے چار ہاتھ لمبا نکلا۔ یہ دونوں جملہ عروسی کے برابر والے کمرے میں بیٹھ کر شراب پی رہے تھے۔ دولہا نے یہ کمرہ اسی لئے چنا تھا کہ بارات والوں کو اس کی برائی کا پتہ نہ چل سکے۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ وہاں سے چپ چاپ دلہن کے پاس چلا جاؤں گا۔ تمام دن اور آدھی رات تک بیٹھے بیٹھے میرا شریر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ مجبوراً ذرا دیر کے لئے میں مسہری پر لیٹ گئی۔ زیورات بھاری کپڑوں اور پھولوں کی وجہ سے میں بہت تھک گئی تھی لیکن ہی نیند آگئی۔

نہ معلوم کس وقت میری آنکھ کھلی مگر اتنا معلوم تھا کہ رات کافی بیت چکی ہے کمرے میں گھپ اندھیرا ہے اور کوئی میرے شریر پر جھکا ہوا ہے میں نے سوچا پتی دیو کو اب موقع ملا ہے اور وہ میری دنیا برباد کرنے آگئے ہیں۔

جب میں بالکل ہی بے بس ہو گئی تو روہانسی ہو کر بولی:

”جھگوان کے لئے میری دو باتیں سن لو۔ میں تمہارے سامنے اپنے باپ کا اقرار کرتی ہوں حالانکہ میرا شریر گنگا کی طرح پوتر ہے مگر میری آتما گندی ہو چکی ہے۔ اب میں ایک آتما دو آدمیوں کو کیسے دے سکتی ہوں۔ میں راجکمار گوتم سے محبت کرتی ہوں اس کا پریم میری نس نس میں رچ بس چکا ہے۔ میں اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔

میں چاہتی تو یہ شریر بھی گندہ ہو جاتا مگر ہم نے پریم کیا ہے سچا پریم ہمارے پیار میں گندگی نہیں تھی۔ راج کمار نے بھی میرے شریر کو چھونے کی کوشش نہیں کی مگر اپنی آتما کی طرح میں اس شریر کو بھی ان کی امانت سمجھتی ہوں کیا تم اس بات پر بھی مجھے سوینکار کر لو گے۔“ یہ میرا آخری ہتھیار تھا۔ اس سے اس نے پھر سے کمرے میں روشنی کر دی اور میں اپنے دولہا کو دیکھ کر چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ یہ پر تپ سنگھ تھا۔

جب میں ہوش میں آئی تو اس پاکھنڈی نے بڑے گھمنڈ سے کہا:

”دیکھا رادھا رانی۔ ہم نہ کہتے تھے ہم سے بچ کر کہاں جاؤ گی۔“ جاؤ اپنے راج کمار کو بلا لاؤ اور مجھے سولی پر چڑھا دو یا اپنے شرابی پتی سے شکایت کر دو جو برابر والے کمرے

میں بے سدھ پڑا ہے۔“

میرے اوپر قیامت گزر گئی تھی۔ شاید پتی دیو کو بھی اپنی غلطی کا علم ہو گیا تھا وہ صبح ہی ناشتہ کئے بغیر چلا گیا اس کے چلے جانے سے ریاست میں بڑا چرچا ہوا اس کے ساتھی بھی فوراً ہی روانہ ہو گئے تھے۔

تیسرے دن ہمارے گھر میں کھرام مچ گیا اس دن اطلاع آئی تھی کہ پتی دیو نے گنگا میں ڈوب کر خود کشی کر لی۔

رونا پینا رات تک ہوتا رہا اور جب سب لوگ تھک ہار کر سو گئے۔ تو میں نے اسی رات کو زہر کا پیالہ پی لیا۔“

رادھا اپنی داستان سنا کر رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا:

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ تم لوگ مر گئے اور پھر اب زندہ ہو۔“

”یہ سب کچھ ممکن ہے بابو جی۔“ رادھا نے ہونٹ بھیج کر کہا۔

”اب تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو۔ وہ بھی بتا دو۔“ میں نے دو سرا پہلو اختیار کیا۔

”ان باتوں کا جواب آنے والا وقت دے گا۔“ پر اسرار انداز میں رادھا نے کہا۔

گاڑی پھر سے رکنے کے لئے آہستہ ہو رہی تھی اس لئے میں نے بھی اسے مزید کیدنے کی کوشش نہیں کی۔

گاڑی ایک جنکشن پر رکی پہلی بار بڑا اسٹیشن دیکھ کر مجھے قدرے مسرت ہوئی۔

پلیٹ فارم پر اتر کر میں نے بک اسٹال کا رخ کیا اور چند کتابیں اور میگزین خرید لایا۔

ٹرین یہاں جم کر رہ گئی تھی اب دوپہر ہو چکی تھی اس لئے ہم نے کھانے سے فراغت پائی تاکہ کوئی پریشانی نہ ہو۔ ڈبے میں اب کافی رش ہو گیا تھا تاہم یہ بڑی بوگی تھی اس لئے ہمارے قریب کوئی نہیں تھا۔ ہم آزادی سے بات چیت کر سکتے تھے لیکن اس وقت باتوں سے زیادہ مطالعے میں لطف آ رہا تھا۔

رادھا کے لئے میں ہندی کا رسالہ لے آیا تھا وہ اس میں لگ گئی تھی۔

ٹرین اس جنکشن سے چلی تو واقعی پنجر ٹرین بن گئی ہر اسٹیشن پر آنے جانے والوں

تم لوگ شادی کے بعد کیا مناتے ہو۔“  
اب ہم سمجھ کر یہ بڑے میاں ہنی مون کو فنی کون کہہ رہے تھے۔ ہم لوگ ان کی ساوگی پر بے اختیار ہنس دیے۔

کاربازاروں سے گزر رہی تھی اور بھیڑ ہونے کی وجہ سے رفتار بہت سست تھی۔ اسی دوران رادھا نے سرگوشی میں کہا

”دیکھو وہاں کسی سے زیادہ باتیں مت کرنا۔ میں اپنے بارے میں بتاؤں۔ میں کچھ دن پہلے لندن سے تعلیم پا کر لوٹی ہوں اور ہماری شادی کو صرف دو ہفتے ہوئے ہیں۔ یہاں میرا میکہ اور تمہاری سسرال ہے۔ اس جنم میں تمہاری دو سائیاں اور دو سالے ہیں تم رامپور کے رہنے والے ہو۔ اور تمہارا نام گوتم بابو ہے تمہاری ساس کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”دونوں سالوں کی شادی ہو چکی ہے اور بڑی سالی شیلہ کی مگنی طے پا چکی ہے۔“

میں نے تفصیلات ذہن نشین کر لیں اور پھر ہم لوگ خاموشی سے سفر طے کرتے رہے۔

شہر سے کچھ دور نکلتے ہی گوتمی ندی کا خوبصورت اور لمبا پل آگیا اس پل کو پار کرتے ہوئے میں نے گوتمی کے کنارے مندر اور شمشان بنے ہوئے دیکھے۔ اور بہت سے اشران گھٹ بھی تھے جہاں پختہ پڑھیاں اور فرش بنے ہوئے تھے آبادی کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ مگر دس پندرہ منٹ تک موٹر فرائے بھرتی رہی۔ یہاں تک کہ بڑی بڑی کوٹھیوں کا علاقہ آگیا۔ مگر اس طرف آبادی گھنی نہیں تھی۔ کوٹھیوں کے درمیان کافی قطعات خالی پڑے تھے۔ ان کوٹھیوں کے سامنے جنگلات کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا بہت سے کھیتوں میں مختلف فصلیں کھڑی تھیں ایک طرف پختہ اور نیم پختہ چھوٹے مکانات کا سلسلہ بھی تھا۔

رادھا کے گھر والوں سے ملاقات ہوئی تو دل خوش ہو گیا سب ہی تعلیم یافتہ اور بلند اخلاق لوگ تھے ہر شخص گھل مل کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اپنے اپنے طور پر خاطر مدارت کر رہے تھے رادھا کی بہنیں رادھا کی طرح خوبصورت اور سلیقہ مند تھیں وہ بڑے ادب و احترام سے ملیں مختصر یہ کہ اپنی مصنوعی سسرال کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

کی بھیڑ لگی رہی اس لئے کانپور تک میں رادھا سے کوئی بات نہ کر سکا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر رہ گئے۔

کانپور ابھی دور تھا کہ ایک بار پھر ڈبے میں ہم تنہا رہ گئے اور ذرا دیر بعد میں نے بدلی ہوئی رادھا کو دیکھا اب وہ تمام لباس اور زیورات اتار کر معربی طرز کا لباس زیب تن کر چکی تھی۔ پہلی بار میں نے اس کے ماڈرن بال دیکھ کر انتہائی حیرت کا مظاہرہ کیا یہ اس کا تیسرا روپ تھا۔

کانپور اسٹیشن پر ٹرین رات کو نوبے لگی چونکہ دو گھنٹے لیٹ ہو گئی تھی۔ قلیوں سے مسلمان اتروا کر ہم باہر آئے۔ رادھا اسٹیشن کے باہر غور سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔ جب ہم نکلتے دے کر گیٹ سے باہر آئے تو ایک لمبا پل پار کر کے اس طرف آنکے جہاں رکشے اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں اب رادھا کے اختیار میں تھا۔ اس لئے اپنی طرف سے میں نے کوئی پہل نہیں کی دو منٹ گزرے تھے کہ ایک لمبی سیاہ رنگ کی شیور لیٹ ہمارے قریب آکر رکی۔

”بوڑھا ڈرائیور باہر آیا اور ”رادھا بیٹی“ کہہ کر ہماری طرف بڑھا۔ ات دیکھ کر رادھا کے چہرے پر رونق آگئی تھی اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”آگے بنواری چاچا۔“

”ہاں بیٹی۔ راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی، پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ بھلا کنور صاحب کی موجودگی میں ہماری بیٹی کو کیا کٹ ہو سکتا ہے۔“

”گھر پر تو سب راضی خوش ہیں۔“ رادھا نے کار میں بیٹھ کر پوچھا۔ میں اس سے پہلے بیٹھ چکا تھا۔

”ہاں ہاں بیٹا۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اس دن تمہارے پتا جی کہہ رہے تھے رادھا بس آنے ہی والی ہے۔“

اس کا تار تو آگیا ہے فنی کون بس ختم ہو گیا۔“

”فنی کون؟“ میں نے اور رادھا نے ایک ساتھ کہا۔ بوڑھا ڈرائیور ذرا سا سٹٹا گیا پھر بولا۔

”کعبخت یادداشت بہت خراب ہے بوڑھلا ہے نا۔ شاید یہی کہا تھا یا کچھ اور بھی وہ

”اچھا تو پھر آج کیا کرنا ہے۔“ میں نے تیار ہو کر کہا۔

”آج تو صرف آرام کرنا ہے۔“ راوہا نے مسکرا کر کہا ہم دونوں خواب گاہ میں چلے گئے یہاں پہلے سے دو مسیروں کا انتظام کیا گیا تھا۔ حسب وعدہ میں نے راوہا سے کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گئے۔

دوسرے دن راوہا اور اس کی بہنیں مجھے کانپور گھمانے لے گئیں مگر ہم دوپہر تک لوٹ آئے۔ طعام سے فارغ ہو کر میں آرام کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا مگر راوہا مجھ سے اجازت لے کر اپنے شکار کی تلاش میں نکل گئی۔

تیسرے پہر ہم نے چائے اپنے کمرے میں پی۔ اس کے بعد وہ مجھے آج کے شکار کی تفصیل بتانے لگی۔

”میرا آج شکار پر تپ سنگھ کا پوتا انوپ ہے۔ حالانکہ یہ بوڑھا آدمی ہے اور پوتی پوتوں والا مگر میں نے اپنے جذبہ انتقام کو تسکین دینے کے لئے آج اس کا انتخاب کیا ہے۔“

”لیکن وہ رات کے وقت تمنا کھیتوں کی طرف کیسے آئے گا۔“ میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

راوہا بے اختیار مسکرا دی پھر بولی۔ ”میں نے اس کی فطرت کا اندازہ کر لیا ہے اسے کیمیا بنانے کا شوق ہے۔ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے۔ میں نے جب اس سے کہا کہ ساوہو مہاراج ہمیشہ رات کو ملا کرتے ہیں۔ میں یہ کر سکتی ہوں کہ ان کھیتوں کے قریب تک انہیں لے آؤں پھر تم خود ان سے بات کر لینا مگر وہ ایک وقت میں صرف ایک آدمی سے بات کرتے ہیں اور اگر کوئی پاس کھڑا ہو تو ہرگز منہ نہیں کھولتے ان کا استھان ایک جوہڑ کے کنارے ہے۔ بوڑھا یہ سن کر میری خوشامد کرنے لگا اور رات کو اکیلے آنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے مجھے یہ ہدایت کر دی ہے کہ یہ بات کسی کو نہ بتاؤں کیونکہ اس کے بیٹے اور پوتے ان باتوں سے بہت ناخوش ہوتے ہیں۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ کام بس بتا ہی سمجھو۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور جواباً راوہا

یہ کوٹھی جس میں راوہا کے والدین رہتے تھے اچھی خاصی قلعہ نہایتھی۔ دس بارہ سکروں اور کئی دروازوں پر مشتمل ہونے کے علاوہ لان، باغیچہ اور یکم کورٹ وغیرہ بھی کچھ تھا۔

ہمیں کوٹھی کے ایک حصے میں دو کمرے جو نہایت الگ تھے دے دیئے گئے دن میں ہم الگ رہتے تھے مگر ہم نے سونے کے لئے ایک کمرہ منتخب کر لیا تھا۔ لیکن پہلی ہی رات میرے سامنے راوہا کی ایک عجیب و غریب شخصیت ابھر کر آئی۔

سب کو خدا حافظ اور شب بخیر کہہ کر جب ہم اپنی خوابگاہ میں داخل ہوئے تو راوہا نے کہا:

”بابو جی۔ اب ہمیں اپنا کام شروع کرنا ہی اس کی تفصیل سن لیجئے۔“

میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

”ضرور میں تو خود پوچھنے والا تھا۔“

”یہاں ہمیں کئی آدمیوں کا خون کرنا ہے۔“ نہایت اطمینان سے راوہا نے کہا۔ تمہیں حیرت ہو رہی ہے حالانکہ یہ بالکل سچ ہے۔ دراصل پر تپ سنگھ ٹھاکر کے رشتے دار سب کے سب یہیں رہتے ہیں۔ انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے میں نے ایک جدید طریقہ کار اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ماڈرن لباس میں ملبوس راوہا اس وقت اینگلو انڈین لگ رہی تھی۔ اس نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ”ہمارا شکار ایک آدمی ہوا کرے گا۔ اس شخص کو پھانسی کر ایک خاص جگہ تک لانا میرا کام ہوگا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد میں جو کچھ کہوں آپ کو اس پر عمل کرنا ہے اس طرح ہم ان ظالموں کا کام تمام بھی کر سکیں گے اور قانون کے سنگین ہاتھوں سے بچ بھی جائیں گے۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔“ میں نے کہا۔

”بہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں جو کوئی وہی کروں گا لیکن ایک درخواست ہے

کہ مجھے جلدی چھٹی دے دینا۔“

”میں اس کا وعدہ کرتی ہوں۔ تمہارا شریر تمہارے کمرے میں محفوظ ہے بس جیسے

ہی کام ختم ہو۔ تمہیں سکت کر دیا جائے گا۔“

بوڑھا خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ اور اس کی سٹی بگم ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے اس پر ترس بھی آیا مگر رادھا کی پراسرار شخصیت نے میرے اس جذبہ رحم کو فوراً ہی کانور کر دیا۔

چند ثانیوں کے بعد رادھا نے چینی کے پیالے میں ابلتا ہوا پانی انڈیلا۔ اب اسکیم کا آخری حصہ شروع ہو رہا تھا۔

اچانک میری بدلی ہوئی آواز گونجی ”آخری وقت میں بھگوان کو یاد کر لے بڑھے کھوسٹ‘ لے اب تیرا سے آپہنچا۔“

یہ کہہ کر جو نئی چاقو کی الٹی دھار ذرا طاقت سے بوڑھے کے گلے پر پھیری گئی اور اس وقت تھوڑا سا گرم پانی رادھا نے اس کے سینے پر ڈال دیا۔ بوڑھا فرط خوف سے تھر تھرایا اور پھر دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

میں نے جبکہ کر اس کی بنصیں ٹٹولیں۔ مگر وہ تو زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ ہم نے اطمینان کرنے کے بعد سالان کو جوں کا توں رکھا اور نہایت ہوشیاری سے بوڑھے کی لاش اٹھا کر کھیتوں میں ڈال آئے۔

دوسرے دن بوڑھے انوپ کی لاش ایک کسان نے کھیت میں دیکھی فوراً ہی اس کے بیٹوں کو اطلاع کر دی گئی۔ عام خیال یہ تھا کہ رات کے وقت انوپ کھیتوں کی طرف آیا ہو گا اور کسی جانور نے اسے ہلاک کر دیا ہو گا۔ مگر اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے کہا۔ ضرور انوپ سنگھ کو کسی زہریلے ناگ نے ڈس لیا ہے۔

بوڑھے کی موت کا اس کے خاندان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا اسی دن شام کو انوپ سنگھ پھونک دیا گیا۔ تیسری رات ہمارا شکار انوپ سنگھ کا بڑا بیٹا سروپ سنگھ تھا یہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا مگر بازو اب بھی مضبوط تھے۔ اسے بھی رادھا نہ جانے کس بہانے سے جوہڑ تک لائی تھی اسے دوپٹے کے لئے مجھے کافی زور آزمائی کرنی پڑی تھی مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ رادھا کا قاتل مولا کس قدر کامیاب رہا ہے۔

واقعہ کی صبح جب سروپ کمار کی لاش کھیتوں میں پائی گئی تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے کچھ لوگوں نے کہا۔ ”یہ محض اتفاقی حادثات نہیں ہو سکتے ضرور اس میں کوئی راز

بھی مستردی۔

نہایت گزری تھی کہ میں اور رادھا کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس طرف بالکل سناٹا تھا۔ چاند چھپ چکا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں راستہ بمشکل نظر آ رہا تھا۔

مجھے کھیتوں کے درمیان ایک پگنڈی پر تنہا چھوڑ کر رادھا کچھ دیر کے لئے ایک طرف چلی گئی۔ یہ پگنڈی جوہڑ کے کنارے پر تھی۔ رادھا کا رخ دوسری جانب بنی ہوئی عمارتوں کی طرف تھا۔ میں دس بارہ منٹ تک بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ میں اپنے کام کے لئے بالکل تیار تھا۔ جیب میں ایک سیاہ کپڑے کی پٹی موجود تھی جس کو شکار کی آنکھوں پر باندھنا تھا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ میں نے ایک سایہ پگنڈی پر آتے ہوئے دیکھا یہ رادھا تھی۔ میں بے جلدت قریب کے کھیت میں چلا گیا اور جب رادھا کے ساتھ چلتا ہوا ایک بوڑھا آدمی میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے باہر نکل کر اسے پیچھے سے دو بوج لیا آن واحد میں جیب میں رکھی ہوئی پٹی اس شخص کی آنکھوں پر بندھ چکی تھی۔

ہلکے پھلکے بوڑھے پر قابو پانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ رادھا میرے ساتھ تھی ہم جوہڑ کے کنارے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ بوڑھے آدمی کو بے بس کر کے کھڑا کر دیا گیا اسے حکم دیا گیا کہ بے حس و حرکت کھڑا رہے۔ پھر رادھا اسکیم کے بقیہ حصے پر عمل کرنے کا انتظام کرنے لگی۔ اس نے مجھے بھی مختصر ایتنا دیا تھا اور میں اس کا طریقہ کار سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ واقعی یہ وہی بات تھی کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

رادھا کے اشارے پر میں نے گرم پانی کی بوتل اٹھالی اور ایک لمبے پھل کا چاقو نکال لیا۔

رادھا مجھے اشارہ کر کے بوڑھے کے عقب میں چلی گئی میں نے حسب پلان چاقو کا الٹا کند حصہ اس کے گلے سے لگا کر کہا:

”اب تو اپنی موت کے لئے تیار ہو جا۔ اولالچی بوڑھے کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ بھگوان دنیا بھر کی دولت تجھے ہی دے دے گا۔“

می نم پایا گیا تھا۔

ایک ماہ کے اندر ایک ہی خاندان کے بارہ افراد اسی طرح موت کے گھاٹ اتارے باچکے تھے۔ اب انوپ کے خاندان میں بیوہ عورتیں اور کنواری لڑکیاں رہ گئی تھیں۔ اس ماندان کی کسمپرسی پر پورا ملک افسوس کر رہا تھا۔ حکومت کی طرف سے نااہل پولیس والے ٹاڈیے گئے تھے اور تھانوں میں نیا اسٹاف تعینات کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ تجربہ کار جاسوس بھی مقرر کر دیئے گئے تھے۔

عوامی حلقوں نے انوپ سنگھ کے خاندان کے ساتھ 'نمایت ہمدردی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہزاروں آدمی ان بیواؤں سے ملنے بھی گئے تھے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس خاندان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ان کا دشمن کون ہے۔ اب تک جتنے واقعات ہوئے تھے وہ صرف اسی خاندان تک محدود تھے۔ اس علاقے میں دوسرے لوگ اب بھی خیریت سے تھے لیکن پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ اخبار والے دھڑا دھڑا اس خاندان کی بیواؤں کے انٹرویو چھاپ رہے تھے۔

ایک شام جب ہم چائے سے فارغ ہو کر تنہا بیٹھے تھے تو میں نے راوہا سے کہا۔  
”ہمارا معاملہ پورا ہو چکا ہے۔ تم اپنے دشمنوں کا صفایا کرنے میں کامیاب ہو گئیں اب میرے لئے کیا حکم ہے۔“

”میں آپ کی بچہ احسان مند ہوں۔ جو آپ حکم دیں گے میرے لئے اس میں کوئی عذریا تامل نہ ہو گا۔“ راوہا نے خلوص کے ساتھ کہا۔

”دوسرے دن ہم پھر بائی ٹرین رامپور روانہ ہو گئے۔ راوہا کا شوہر اپنی دلہن کو گھر لے جا رہا تھا۔ ہمارے ساتھ وہ پراسرار صندوق بھی موجود تھا۔

سفر کی رات نمایت خوشگوار تھی۔ ہم فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے اس لئے بوگی میں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا مسافر نہیں تھا۔

آج راوہا بہترین لباس پہنے ہوئے تھی۔ جدید طرز میں کئے ہوئے بال اور خوبصورت سینے کو نیم عریاں کرنے والا اسکرٹ پہنے ہوئے وہ جاپانی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے اور مجھے نیند آرہی تھی۔ یہی حال راوہا کا تھا۔

ہے۔“

پوچھنے کو واقعہ کی اطلاع کی گئی۔ کچھ فاصلے پر تھانہ واقع تھا۔ پولیس دوپہر کو آئی اس وقت تک لاش اسی جگہ پڑی رہی تھی۔ کسی طرح اخباری رپورٹس کو بھی اس کی اطلاع مل گئی اور اسی دن پریس کو یہ عجیب و غریب خبر دے دی گئی کہ مضافاتی علاقے میں ایک ایسی لاش پائی گئی ہے جس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہے صرف سینے پر بنوں والا حصہ بھیگا ہوا ہے۔

پولیس کی ابتدائی کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دی گئی۔ تیسرے دن اخبارات میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی شائع ہو گئی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ موت حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ رپورٹ کی اشاعت کے بعد لوگوں نے یہی رائے زنی کی کہ سرورپ سنگھ شاید گھر والوں سے بدظن ہو گیا تھا اور زیادہ غم کرنے کی وجہ سے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

لیکن تیسرے دن پھر ایک لاش منظر عام پر آئی۔ یہ سرورپ سنگھ کا چھوٹا بھائی دلیپ تھا۔

پچاس سالہ دلیپ کی لاش بھی بالکل ایسی ہی حالت میں پائی گئی تھی۔ ابھی اس کی انکوائری ہی ہو رہی تھی کہ اس خاندان کا آخری بزرگ چالیس سالہ کلڈیپ سنگھ بھی ایک دن کھیتوں میں مردہ پایا گیا۔ اس کی موت بھی حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی۔

ایک ہی خاندان میں ایک ہی انداز میں چار اموات ہو چکی تھیں لیکن اخبارات میں تین کا تذکرہ چل رہا تھا انوپ کی موت پردہ راز میں جا پڑی تھی۔ حکومت کے ذمے داران بوکھلا گئے تھے اخبارات نے پولیس اور انتظامیہ پر کافی کیچڑ اچھالی تھی۔ اس لئے متعلقہ تھانے سے باقاعدہ ایک گارڈ اس علاقے میں تعینات کر دیا گیا۔

پولیس تعینات رہی مگر ایک ہفتے بعد پھر اسی خاندان کا ایک نوجوان سلطان سنگھ کھیتوں میں مردہ پایا گیا۔ سلطان سنگھ سرورپ سنگھ کا واحد بیٹا تھا اس کی موت بھی حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی اس کے جسم پر بھی کوئی زخم نہیں تھا اس کا گزربان



اچانک میں نے راوہا سے ایک بے ٹکا سوال کر دیا۔

”کیا ہم دوبارہ کبھی نہ مل سکیں گے۔“

اس نے شفیق نظروں سے میری طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

”میرا کام ختم ہو چکا ہے اب میں اپنے راج کمار کے پاس ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں

مگر یہ سچ ہے کہ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

”صرف یاد رکھو گی۔“ میں اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا راوہا اسی طرح بیٹھی رہی

آج وہ جذبات سے بالکل عاری نظر آ رہی تھی۔ خشک باتوں سے تنگ آ کر میں نے سونے

کا ارادہ ظاہر کیا۔

ایک بار پھر راوہا نے وہی پراسرار سگریٹ کا ڈبہ نکال کر ایک سگریٹ مجھے پیش

کیا۔ راوہا کے معنی خیز اصرار پر مجھے پھر وہی سگریٹ پینی پڑی اور سگریٹ پیتے ہی میں

ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔ لیکن میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ایک بار پھر راوہا نے مجھے اسی بکس میں لاش کے قریب لٹا دیا۔ صندوق کا دروازہ

بند کر کے قفل لگا دیا نہ معلوم کب تک میں اس میں پڑا رہا۔

صندوق پھر سے کھولا گیا۔ اور مجھے لاش کی طرح نکال کر برتھ پر ٹیک لگا کر بٹھا دیا

گیا۔ اس بار پھر راوہا نے میرے منہ میں سگریٹ دبا دی اور ماچس جلا کر سگریٹ سلگا دی۔

میں کش لے کر بیہوش ہو گیا دوبارہ آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ کپارٹ میں میرے سوا

کوئی دوسرا نہ تھا۔ راوہا اور اس کا سالانہ نجانے کہاں غائب تھا۔ ہاں میری اٹیچی موجود تھی

اور جب میں نے گھر پہنچ کر اٹیچی کھولی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پوری اٹیچی کرنسی نوٹوں

سے بھری پڑی تھی۔ اوپر ہی ایک پرچہ رکھا ہوا تھا۔ خط ہندی میں تحریر کیا ہوا تھا۔

”شریمان جی۔“

”میں آپ کی بیحد شکر گزار ہوں اپنے وعدے کے مطابق یہ حقیر سا نذرانہ حاضر

ہے آشا ہے آپ اسے سوئیکار کر لیں گے۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ فقط آپ کی

دوست راوہا۔“

میں نے جب سعیدہ کو یہ واقعہ سنایا تو اس نے سچ ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر اس

بات پر وہ بھی الجھ کر رہ گئی کہ اگر یہ سب کچھ غلط تھا تو میری اٹیچی کو نوٹوں سے کس نے بھر

دیا تھا۔ مجھے پرچہ کس نے لکھا تھا اور میں ایک ماہ تک کہاں غائب رہا تھا۔ جبکہ کانپور والوں

نے پہلے ہی سعیدہ کو مطلع کر دیا تھا کہ تمہارا شوہر یہاں نہیں پہنچا۔

واقعات اتنے پراسرار تھے کہ نہ کسی سے کہتے بنتی تھی اور نہ ہضم ہوتے تھے۔

تجسس اپنی انتہا کو پہنچا تو میں نے ان واقعات کی اصلیت جاننے کا عزم کر لیا۔ سب سے پہلے

میں نے گزشتہ ماہ کے اخبارات اکٹھے کئے اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تمام واقعات اور

انٹرویو اخبارات میں موجود تھے۔

پھر ایک دن میں اور سعیدہ کانپور روانہ ہو گئے اس بار سعیدہ نے مجھے تنہا جانے کی

اجازت نہیں دی تھی۔ اس کے علاوہ ہم نے یہ سفر ٹرین سے کیا تھا۔

اپنے خالہ زاد بھائی کے گھر پہنچا تو اس نے جاتے ہی ٹانگ لی۔ اس کی شکایت بے جا

نہ تھی مگر میں نے دولہا دلہن سے معذرت کر لی اور شادی کا ایک خوبصورت تحفہ ان کی

نذر کر دیا اس طرح گلو خلاصی ہو گئی۔

سعیدہ میرے ساتھ شر کے مضافاتی علاقے میں جہاں اخبارات کی نشاندہی کے

مطابق وہ پراسرار اموات ہوئیں تھیں جانے پر بضد تھی۔ مگر یہ بات میں نے نہیں مانی اور

ایک دن میں تنہا اس علاقے میں پہنچ گیا۔

سب کچھ وہی تھا وہی راستے وہی کوٹھیاں وہی ایک طرف بنے ہوئے چھوٹے

مکانات کا سلسلہ اور ان کے سامنے کھیتوں کا طویل حصہ انہی کھیتوں کے قریب ایک جوہڑ

واقع تھا۔ میں نے اس علاقے کے ایک بوڑھے سے ملاقات کی اور پھر میرے خیال کی

تصدیق ہو گئی۔

راوہا کی کوٹھی اسی جگہ موجود تھی۔ میں نے اس کوٹھی میں ایک ماہ گزارا تھا اور

جب میں نے اس کوٹھی پر جا کر ملازم کو پکارا تو بوڑھے ڈرائیور نے مجھے اجنبی نگاہوں سے

دیکھ کر کہا۔

”بابو جی کس سے ملنا ہے۔“

”راوہا دیوی رہتی ہیں۔ ان کی بہن شیلادیوی۔“

”دھا بیٹی رہا کرتی تھیں۔ مگر ان کی شادی کو ڈیڑھ ماہ سے اوپر ہو گیا وہ تو کل لندن چلی گئیں اپنے دولہا کے ساتھ۔“ میں نے بمشکل تمام بوڑھے کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ شیلہ سے ملا دے۔ ہماری یہ ملاقات اسی کمرے میں ہوئی جہاں میں ایک ماہ تک چین کی جسی بجا چکا تھا۔ یہ وہی شیلہ تھی میں نے اسے خوب پہچان لیا تھا۔ مگر وہ مجھے بالکل اجنبی سمجھ رہی تھی۔ میں نے شیلہ کو رادھا کا کلاس فیلو کہہ کر تعارف کرایا تھا اس لئے وہ ملاقات پر آمادہ ہو گئی۔

باتوں کے دوران شیلہ نے کہا۔

دی دی آٹھ سال سے لندن میں تھیں تعلیم مکمل کر کے انہوں نے وہیں ایک ہندوستانی ”گوتھم بابو“ سے شادی کر لی۔ اور ابھی ایک ماہ دولہا کے ساتھ یہاں رہ کر گئیں ہیں انہوں نے درسی تعلیم کے علاوہ پامسٹری اور مسمریزم وغیرہ بھی باقاعدہ سیکھی ہے دیدی نے بتایا کہ انہیں اس علم کو حاصل کرنے میں پورے تین سال لگے تھے۔ اب وہ کچھ عرصے سے پٹنا نائز کے کمالات سیکھ رہی ہے۔ یہ ان کی باہی ہے۔“

ویسے ہمارے دولہا بھائی بہت بڑے آدمی ہیں لندن میں ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔ دیدی نے اپنے شوق کی وجہ سے یہ علوم سیکھے ہیں۔

آخر میں اس نے کہا۔ ”عجب ہے کہ میں نے آپ کو کبھی دیدی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ آٹھ سال پہلے انہوں نے کانپور ڈی اے دی کالج سے بی اے کیا تھا اس کے بعد لندن چلی گئیں۔“

”تم مجھے نہیں جانتی ہو شیلہ دیوی لیکن میں تم سے اور رادھا اور تمہارے سارے خاندان سے واقف ہوں میں رادھا کا پرانا دوست ہوں۔“

شیلہ کے چہرے پر اپنائیت بھری حیرت چھوڑ کر میں چلا آیا وہ دروازے تک مجھے رکنے کو کہنے آئی مگر اب میرے ذہن کی تمام گتھیاں سلجھ چکی تھیں۔ دراصل برسوں پہلے یہاں پر دو خاندانوں میں پرانی رنجش تھی اور رادھا نے اسی جذبے کی تسکین کے لئے اپنا علوم سے کام لیا تھا اور میں اس کی شعبہ بازی سے اس کا دست راست بن گیا تھا۔

## گیارہ دن لیٹ

لیزرا بارلنگ بے حد خوش تھی۔ طیارے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس کے قدم خوشی سے لرز رہے تھے۔ بہت سی سرستیں تھیں جو یکجا ہو گئی تھیں۔ اول تو وہ فضائی سفر پہلی بار کر رہی تھی اس سے قبل بھی اس نے چھوٹے موٹے سفر کئے تھے لیکن صرف ٹرین سے جہاز میں بیٹھنے کا پہلا موقع تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مسٹر بارلنگ کوئی باحیثیت انسان نہیں تھے وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی میں نقشہ نویس تھے۔ بس اتنا مل جاتا تھا کہ درمیانے درجے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کثیر العیال تھے یعنی چار لڑکیاں اور تین لڑکے سب کے تعلیمی اخراجات اور دوسرے مصارف کے بعد کچھ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ معمولات زندگی میں کوئی تنگی بھی نہیں تھی۔

لیزرا ان کی سب سے بڑی اولاد تھی اور اتفاق سے مسٹر بارلنگ اسے سب سے زیادہ چاہتے تھے یہی وجہ تھی کہ لیزرا کو اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کا موقع مل گیا۔ ورنہ شاید وہ مشرق کبھی نہ دیکھ سکتی۔ نہ جانے مسٹر بارلنگ نے کون کون سے اخراجات روک کر اسے مشرق آنے کا موقع فراہم کیا تھا۔

اصل میں لیزرا کو بچپن ہی سے مشرق کی کمائیاں بے حد پسند تھیں اس کی نگاہوں میں وہ کوئی الف لیوی علاقہ تھا جہاں کا ہر فرد پر اسرار تھا اور ہر بات انوکھی لیکن اس نے مشرق دیکھنے کی آرزو کبھی نہیں کی۔ کیا فائدہ ایسی آرزو سے جس کی تکمیل کے سرے سے امکانات ہی نہ ہوں۔ وہ اپنے گھر کے ماحول سے واقف تھی، اپنے باپ کے حالات سے واقف تھی اس لئے اس نے کبھی کسی ایسی آرزو کو دل میں جگہ ہی نہ دی جس کی تکمیل

پھر ایک دن اپنے والد کا خط اور کمپنی کے ہیڈ آفس کی طرف سے ایک لفافہ ملا۔ جس میں ہوائی جہاز کا ٹکٹ اور پاسپورٹ اسے بھیج دیا گیا۔ لیزرا کے دل کی دھڑکنیں بند ہو گئیں اس خوشی سے اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ بمشکل تمام وہ یہ مسرت دبا سکی اور اس نے شتم پشتم تیا ریاں شروع کر دیں۔ بالآخر آج اس کے سفر کا دن تھا۔ اس کے قدم لرز رہے تھے اس کی ماں اور بہن بھائی اسے ایئر پورٹ چھوڑنے آئے تھے۔

جہاز کی آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر اس نے دور کھڑے بہن بھائیوں کو دیکھا جو اس کی طرف ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہہ رہے تھے وہ کچھ ایسے سحر میں گرفتار تھی کہ انہیں دیکھ کر ہاتھ بھی نہ ہلا سکی اور چونکہ دوسرے مسافر آرہے تھے اس لئے خود بھی سہمی سہمی طیارے کے اندر داخل ہو گئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار تھے۔ آنکھوں میں کھوئی کھوئی سی کیفیت تھی۔ اسی وقت ایک ایئر ہوسٹس اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے لیزرا کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اس کا کوپن لے لیا پھر وہ محبت سے اس کا بازو پکڑے ہوئے اس کی سیٹ تک لائی اور اسے پیار سے سیٹ پر بٹھادیا۔

”غالباً یہ آپ کا پہلا ہوائی سفر ہے مس لیزرا“ اس نے کوپن پر لیزرا کا نام پڑھتے ہوئے کہا۔

”اوہ ہاں۔“ اس نے گردن ہلا دی ہوسٹس نے اسے ضروری ہدایات دیں اور پھر دوسرے مسافروں کو اٹھانے لگی۔ لیزرا بدستور خاموش بیٹھی رہی۔ مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھتے رہے، اور پھر وہی ایئر ہوسٹس ایک نوجوان کو لیزرا کے پاس لائی اور اسے اس کی سیٹ پر بٹھاتے ہوئے بولی

”آپ کی ہنسنے لیزرا بارلنگ۔ مجھے یقین ہے مس لیزرا آپ مسٹر عامر کی صحبت میں اپنا سفر دلچسپ گزاریں گی“

اور لیزرا نے گہرائے ہوئے انداز میں اپنے ہم سفر کو دیکھا اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ وہ مشرق تھا۔ خوب صورت خدو خال پاکیزہ آنکھوں والا سانولے سے رنگ کا نوجوان جس کے حسین گھٹنہ والے بال اس کی پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

نوجوان خوش اخلاقی سے گردن خم کر کے مسکرایا۔ لیکن لیزرا پاگلوں کے سے انداز

ممکن نہ ہو سکے۔ لیکن بعض خواہشات اس انداز میں پوری ہو جاتی ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیزرا کے والد مسٹر بارلنگ کی کمپنی کو مشرق کے ایک پل تعمیر کرنے کا ٹھیکہ ملا تھا اور ان کی کمپنی نے فوری طور پر ایک براؤچ اس ملک میں قائم کر دی۔ پھر بہت سے انجنیروں سرورہیروں اور نقشہ نویسوں کی ایک ٹیم روانہ کر دی گئی اس ٹیم میں مسٹر بارلنگ بھی تھے۔ لیزرا خود مشرق نہ جاسکی۔ لیکن اسے اپنے باپ کے جانے کی بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ایئر پورٹ پر اس نے اپنے باپ کو رخصت کرتے وقت خاص طور پر کہا تھا کہ وہ اسے خطوط میں مشرق کے پراسرار واقعات ضرور لکھا کریں اور اس کے والد نے اس کی خواہش کی بھرپور تکمیل کی۔ انہوں نے کچھ حقیقی اور کچھ فرضی واقعات بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ لکھے انہوں نے مشرقی باشندوں کی رہائش اور ان کی رسومات کی ایسی دلکش تصویر کشی کی کہ لیزرا سرشار ہو گئی۔ اس نے خطوط میں اپنے والد کی خوش قسمتی پر رشک کا اظہار کیا تھا۔

اور پھر ایک دن اسے اپنے والد کا خط ملا جسے پڑھ کر وہ ششدر رہ گئی اور جسے پڑھنے کے بعد اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ اس کے والد نے لکھا کہ ایک شام وہ لیزرا کا ایک خط پڑھ رہے تھے کہ ان کی کمپنی کے براؤچ ڈائریکٹر مسٹر گوئے آگئے۔ انہوں نے خط کے بارے میں پوچھا تو مسٹر بارلنگ نے انہیں لیزرا کا خط دکھا دیا۔ تب مسٹر گوئے خط پڑھنے کے بعد مسکرائے اور انہوں نے اپنے خرچ پر لیزرا کو مشرق آنے کی دعوت دی ہے جسے مسٹر بارلنگ نے منظور کر لیا ہے۔ چنانچہ لیزرا تیا ریاں کرے بہت جلد ہوائی ٹکٹ وغیرہ روانہ کر دیں گے۔

ظاہر ہے اس کے بعد لیزرا کی نیندیں حرام نہ ہوتیں تو کیا ہوتا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے مشرق کے خواب دیکھنے لگی اور اب ان خوابوں میں وہ مشرق کی پراسرار وادیوں میں گھوم رہی ہوتی انوکھے سفر کر رہی ہوتی اس کے ساتھ ہی اس نے تیا ریاں بھی شروع کر دی تھیں۔ اپنے تمام اچھے لباسوں کو اس نے پھر سے درست کیا اور انہیں احتیاط سے رکھ دیا۔ کچھ نئے لباس سلوائے اور پھر بے چینی سے اپنے والد کے دوسرے خط کا انتظار کرنے لگی اور

میں اسے دیکھ رہی تھی۔ نوجوان نے نظریں جھکالیں پھر لیزرا کو دیکھا اور دوبارہ نظریں جھکالیں لیکن لیزرا بدستور اسے ایک ٹک دیکھے جارہی تھی۔

وہ مشرق کا باشندہ ہے۔ غالباً کوئی شہزادہ، ہاں چہرے سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ اس کے وطن میں اس کا عالی شان محل ہو گا وہاں اس کی حکومت ہوگی سیکٹروں خادم اور اس کے حکم کے لئے دستہ بستہ کھڑے رہتے ہوں گے۔ ضرور — ضرور وہ مشرق کا کوئی شہزادہ ہی ہے۔

نوجوان نے ایک بار پھر دیکھا اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔  
 ”کیسی دلکش مسکراہٹ ہے اس کی بالکل بالکل خوابوں کے شہزادوں جیسی۔ وہ کیسا پیارا ہم سفر ملا ہے اسے۔ گویا پر سرار داستانوں کی ابتدا ہو گئی۔ اس نے مسرت سے سوچا اور پھر نوجوان کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ نوجوان کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ وہ لیزرا کے اس طرح گھورنے سے ہی کچھ نزوس ہو گیا تھا۔ اس کی اس بے تکلفی پر اور حیران ہو گیا۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی پاگل تو نہیں ہے۔

”نف فرمائیے مس لیزرا“ اس نے کسماتے ہوئے پوچھا اور لیزرا اچھل پڑی۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس نے کسی اجنبی نوجوان کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا ہے اور اسے دیر تک گھورتی رہی ہے۔ اس نے جلدی سے نوجوان کے بازو سے ہاتھ ہٹا لیا اس کی پیشانی پر پینے کے قطرات ابھر آئے تھے۔

اسی وقت پائیلٹ کیبن سے مسافروں سے بیلٹ کس لینے کی درخواست کی گئی۔ جہاز کے انجن اشارت ہو گئے تھے۔ لیزرا نے بھی اپنی سیٹ بیلٹ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نزوس تھی۔ اس لئے کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے چاروں طرف بے بسی سے دیکھا، لیکن اسی وقت اس کے ہم سفر نے اس کے سیٹ بیلٹ کھول کر اس کے جسم سے کس دیئے اور پھر مسکراتا ہوا سیدھا ہو گیا۔ لیزرا اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی تھی۔

جہاز دن وے پر دوڑنے لگا اور پھر وہ فضا میں پرواز کرنے لگا۔ لیزرا کو چکر آرہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اسے اپنا جسم بے حد ہلکا لگ رہا تھا۔ فضا میں پہنچ کر جب جہاز سیدھا ہوا تو لیزرا کی طبیعت بحال ہو سکی۔ دوسرے مسافروں نے بیلٹ کھول دی

تھی لیکن لیزرا اسی طرح بیٹھی تھی۔

”یہاں میں بیلٹ کھولنے میں آپ کی مدد کروں مس لیزرا؟“ نوجوان نے جھک کر اس سے پوچھا۔

”اے۔۔۔ وہ۔۔۔ شکریہ میں۔۔۔ میں“ لیزرا نے بیلٹ کھولنے کی کوشش کی اور کسی نہ کسی طرح اس میں کامیاب ہو ہی گئی۔ بیلٹ کھولنے کے بعد اس نے گہری گہری سانس لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنی کیفیت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔ وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہی ہے۔ کیا سوچے گا یہ نوجوان اس کے بارے میں۔ شاید وہ اس سے متنفر ہو جائے یا اسے ناپسند کرنے لگے۔ پہلے ہی مرحلے پر یہ ناکامی بڑی تکلیف دہ ہوگی۔ وہ تو مشرق کے باشندوں سے گھٹنا ملنا چاہتی تھی ان سے ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی لیکن اب کیا کرے اب تو بات بگڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو رینگ آئے تھے کیا کرے اب وہ کیا کرے اس کا ہم سفر اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

افوہ وہ اپنا وقار کھو بیٹھی ہے۔ کیوں نہ وہ اس نوجوان کو بتا دے کہ یہ اس کا پہلا ہوائی سفر ہے یہی مناسب رہے گا ورنہ ورنہ وہ اس سے نفرت کرنے لگے گا۔ پورے راستے اس سے بات نہ کرے گا۔ آنسو اس کی بند آنکھوں سے بہہ نکلے اور اسی وقت نوجوان نے آہستہ سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”کیا بات ہے مس لیزرا کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے؟“ اس کی ہمدردانہ آواز سنائی دی اور لیزرا نے آنکھیں کھول دیں۔

”ہاں۔۔۔ ہاں میں پہلی بار ہوائی سفر کر رہی ہوں میں ایک غریب لڑکی ہوں۔ لیکن مجھے مشرق دیکھنے کی شدید خواہش تھی تب میرے والد کی کمپنی کے ڈائریکٹر نے مجھے اپنے خرچ پر ایشیا بلایا ہے۔ میں نے پہلے کبھی ہوائی سفر نہیں کیا اس لئے گھبرائی ہوئی ہوں۔“ اس نے روتے ہوئے بتایا اور اپنی پیشانی نوجوان کے کندھے پر رکھ دی۔

نوجوان کے چہرے پر پہلے سنجیدگی کے آثار نظر آئے پھر وہ مسکرانے لگا۔ اس نے لیزرا کا سر شانے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیزرا اس کے شانے پر سر رکھے

”یقیناً آپ خالص مشرقی انداز کی لڑکی ہیں۔ ورنہ یورپ کی لڑکیوں میں نسائیت بہت کم ہوتی ہے۔ میں تھوڑی ہی دیر میں آپ کی بے حد عزت کرنے لگا ہوں۔ کیا میری دوستی قبول کریں گی؟“

”اوہ۔ اوہ میں خوشی سے پاگل نہ ہو جاؤں ابھی تو میں نے مشرق کی زمین پر قدم بھی نہیں رکھا ہے اور — اور میں آپ کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔“ لیزرا نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

”کون سا سوال؟“ لیزرا نے مسرت سے پوچھا۔

”یہی کہ کیا آپ میری دوستی قبول کریں گی؟“

”میری خوش قسمتی ہے۔ آپ میرے دوست ہیں۔“ اس نے گرم جوشی سے عامر کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔

”شکریہ مس لیزرا کیوں نہ ہم مشرق کے بارے میں گفتگو کریں —“

”میری بھی یہی خواہش ہے کہ میں کسی مشرقی سے اس کے وطن کے بارے میں معلوم کروں۔“

”ہمارا وطن —“ عامر نے گہری سانس لی ہمارا وطن سیدھے سارے لوگوں کا دیس ہے وہاں کی داستانوں میں سلاگی ہے۔ ہم لوگ فریب ناپسند کرتے ہیں حقیقت سے ہمیں پیار ہے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے میں نے مشرق کے بارے میں بہت سی کہانیاں سنی ہیں۔ کیا وہ حقیقت ہیں؟“

آپ مجھے ان کے بارے میں بتائیے اگر وہ سچ ہوئیں تو میں تصدیق کروں گا۔“ عامر نے کہا۔

”کیا وہاں کے لوگ رومان پسند ہوتے ہیں؟“

”ہمارے ہاں عشق عبادت ہے بشرطیکہ وہ سچا ہو اور اس میں کسی فعلی جذبے کو دخل نہ ہو۔“

سکتی رہی اور نوجوان کا کوٹ اس کے آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔ وہ بڑے مشفقانہ انداز سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ پھر جب لیزرا کی سسکیاں تھمیں تو اس نے بڑے پیار سے کہا۔

تو اس میں رونے کی کیا بات ہے مس لیزرا۔ یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آپ کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔“

”ایں —“ لیزرا نے اس کی بات سنی، غور کیا اور پھر جلدی سے اس کے شانے سے سر ہٹالیا۔ سر ہٹاتے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کرتی رہی ہے اور اس پر پھرید حواسی کا حملہ ہوا۔

”وہ ارے — وہ — آپ — آپ کا کوٹ۔“ لیزرا نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا اور پھر اپنا ننھا سا رومال نکال کر اس کے شانے کو صاف کرنے لگی۔

”رہنے دیجئے، رہنے دیجئے مس لیزرا۔ وہ آپ کے آنسوؤں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔“ عامر نے اس کا سفید ملائم ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”میں — میں شرمندہ ہوں۔ میں از حد شرمندہ ہوں۔ دراصل میں بہت بے وقوف ہوں۔ اپنے اوپر قابو نہیں پاسکتی۔“ کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے جناب؟“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں مس لیزرا۔ نہ جانے آپ اس قدر گھبرا کیوں گئی ہیں۔“ نوجوان نے ملائیت سے کہا۔

آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا میں تو مشرقیوں سے بے پناہ محبت کرتی ہوں مجھے مشرق کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ اب جبکہ میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو رہی ہے تو مجھے خدشہ ہے کہ میں کہیں مشرقیوں کی محبت حاصل کرنے میں ناکام نہ ہو جاؤں دراصل پہلے میں لوگوں سے زیادہ نہیں ملی ہوں۔ مجھے سلیقہ نہیں آتا۔“ وہ دل گداز لہجے میں بولی۔

”آپ بے حد مخلص، بے حد نیک خاتون ہیں مس لیزرا بلاشبہ آپ دنیا کی سب سے نیک خاتون ہیں۔ ایک مشرقی کی حیثیت سے میں آپ کو بے پناہ پسند کرنے لگا ہوں؟“

”واقعی؟“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔

نے پوچھا۔

”میں نے۔“ لیزرا نے چونک کر کہا۔ ”میں کس سے محبت کرتی کوئی ملا ہی نہیں۔ اور پھر میں بچپن سے کسی شہزادے سے محبت کرنے کے بارے میں سوچتی تھی۔ ہمارے ملک میں بھی ڈیوک ہوتے ہیں پرنس ہوتے ہیں لیکن کمائیوں والے نہیں۔ وہ تو عام قسم کے شہزادے ہوتے ہیں کوئی بھی تو خاص بات نہیں ہوتی ان میں اگر ہوتی بھی تو وہ مجھ سے محبت کیوں کرتے۔ میں تو ایک غریب لڑکی ہوں۔ شہزادے تو شہزادیوں سے محبت کرتے ہیں۔“ وہ اداس ہو گئی۔

”آپ خود کو اس قدر حقیر کیوں سمجھتی ہیں۔ محبت میں امارت و غرور کا کوئی تصور نہیں ہے۔ کیا آپ نے میرے وطن کی کمائیوں میں یہ نہیں پڑھا کہ شہزادے بھکاریوں سے محبت کرنے لگے اور انہوں نے ان کے لئے تاج و تخت بھی چھوڑ دیا۔“

”پڑھا ہے۔ ایک کہانی پڑھی تھی۔ واقعی بڑی دلچسپ کہانی تھی۔“ آپ لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اوہ؟“

”مس لیزرا۔“ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد عامر نے اسے آواز دی اور وہ خیالات سے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا آپ میرے ملک چل کر چند روز کے لئے میری مہمان بننا پسند کریں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ مشرق کو میں اپنے طور پر آپ سے روشناس کر سکوں۔“ مجھے یقین ہے کہ آپ بے حد مسرور ہوں گی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ لیزرا کسی سوچ میں ڈوب گئی پھر گردن اٹھا کر بولی۔

بلاشبہ یہ پیش کش بے حد دل کش ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ آپ میری اس قدر پزیرائی کریں گے۔ لیکن میرے ڈیڈی میرے منظر ہوں گے۔ انہوں نے مجھے ملاٹ اور خط بھیجا ہے ممکن ہے وہ ایئر پورٹ پر مجھے ریسو کرنے کے لئے موجود ہوں۔ بلکہ یقینی طور پر ہوں گے۔ وہ مجھے بے پناہ چاہتے ہیں۔“

”میرا وعدہ ہے کہ میں آپ کے ڈیڈی کو مطمئن کر دوں گا اور ان کو اطلاع بھیجوا دوں گا آپ میری مہمان ہیں۔ بس آپ اطمینان رکھیں کہ آپ کے ڈیڈی کو کوئی تردد نہ

”کیا وہاں کے لوگ بہت پراسرار ہوتے ہیں؟“

”میں نے بتایا تاکہ وہ ساوگی پسند ہوتے ہیں۔ آپ کے ماحول سے مختلف اس لئے وہ آپ کو پراسرار لگتے ہیں۔“

”لیکن میں نے اور بھی بہت سے قصے سنے ہیں؟“

”مثلاً؟“ نوجوان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہاں کے بارے میں کچھ پراسرار داستانیں مشہور ہیں مثلاً سپر نیچرل لوگوں کی داستانیں جو عجیب و غریب قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ پرستانوں کی خوب صورت پریوں کی داستانیں ہمارے ہاں بھی موجود ہیں لیکن فرضی تصور کی جاتی ہیں لیکن سنا ہے وہاں یہ داستانیں حقیقت ہوتی ہیں کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں مشرق کے لوگ عموماً ان داستانوں پر یقین رکھتے ہیں۔“

”تو کیا وہاں یہ داستانیں حقیقت کے روپ میں نہیں ہوتیں کیا وہاں پریوں سے ملاقات کا شہل ہے؟“

”تو آپ ان سے ملاقات کرنے وہاں جا رہی ہیں؟“ عامر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، اگر وہ لوگ مجھ سے ملنا پسند کریں۔“ لیزرا نے کہا اور عامر ہنسنے لگا۔

”درحقیقت آپ بہت ہی معصوم ہیں مس لیزرا مجھے حیرت ہے کہ یورپ کے ماحول میں آپ نے یہاں کے رنگ کیوں نہیں پکڑے؟“

”دراصل مسٹر عامر۔ ہمارے وسائل بے حد محدود ہیں۔ بس یوں سمجھیں کہ کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیتے ہیں۔ عیش و عشرت کی گنجائش نہیں ہے۔ کیا آپ وہاں کی کسی ریاست کے شہزادے ہیں مسٹر عامر.....؟“

”شہزادہ؟ کیوں۔۔۔۔۔ آپ کو یہ گمان کیسے ہوا؟“

”بس ایسے ہی۔ آپ بے حد خوب صورت ہیں اور میں نے سنا ہے کہ وہاں کے شہزادے اور شہزادیاں بے حد خوب صورت ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟“

”محبت تو سب ہی کرتے ہیں مس لیزرا کیا آپ نے کسی سے محبت نہیں کی؟“ عامر

ہوگا۔“ عامر نے کہا۔

”اوہ تب تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن آپ کو زحمت ہوگی لیزرا نے اپنی مسرت دباتے ہوئے کہا۔

بلاشبہ یہ پیش کش اسے بہت پسند آئی تھی۔ اس کے ڈیڈی کے وسائل محدود تھے اور پھر وہ بہر حال ملازم تھے ٹھیک ہے کمپنی کے رحم دل ڈائرکٹر نے اسے دعوت دی تھی۔ وہ اسے گھومنے کے لئے کارڈے دیتا۔ شاید اس کے ڈیڈی کو ایک آدھ ہفتہ چھٹی مل جاتی۔ لیکن ان کو تو خود یہاں کے اندرونی علاقوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہوگی اور یہ نوجوان اس کا دوست عامر تو خود وہاں کا باشندہ ہے۔ وہ اپنے وطن کے ایک ایک چپے سے واقف ہوگا۔ اور پھر ایک ہم عمر اور پسندیدہ شخص کے ساتھ تو سیر کا لطف آجائے۔

”خوب۔۔۔“ عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گویا آپ کو تکلف رہتا ہے؟“

”نہیں“ لیزرا شرع گئی۔

”تو پھر پٹے ہے کہ آپ میری مہمان رہیں گی؟“

”ہاں ٹھیک ہے لیکن اس شرط پر کہ آپ میرے ڈیڈی کو فوری طور پر مطلع کر دیں گے کہ میں خیریت سے ہوں اور وہ میرے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔“

”یہ میری ذمہ داری ہے۔ آپ اطمینان رکھیں؟“

”تب مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ لیزرا نے کہا اور عامر مسکراتے لگا۔

عامر کی صحبت میں یہ طویل سفر بے حد دلچسپ ہو گیا تھا اب لیزرا خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی جو بوجھ اس کے ذہن پر تھا وہ کب کا اتر چکا تھا اب اسے اپنی بھی کوئی حیثیت معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن سے احساس ختم ہو گیا تھا کہ وہ ایک حقیر لڑکی ہے اور صرف ایک آدمی کی رحمی سے اسے یہ دلچسپ سفر مہیا کیا گیا ہے۔ اب تو وہ عامر کی مہمان تھی۔ راستے بھر وہ عامر کے کان کھاتی رہی۔ عامر نے اسے بتایا کہ اس کے دو بھائی ہیں ایک بہن ہے ان کی چھوٹی سی الگ تھلگ دنیا ہے جہاں وہ عیش و آرام سے رہتے ہیں۔

اور طیارہ ایک ایئر پورٹ پر اترنا۔ ایشیا کے اس ملک تک کے سفر میں چار اسٹاپ ہوتے تھے۔ جن میں یہ تیسرا آخری اسٹاپ تھا۔ اس کے بعد طیارے کو اس ملک کے ایئر پورٹ پر اترنا تھا جہاں لیزرا کا باپ مقیم تھا۔

لیکن عامر نے اسی تیسرے اسٹاپ پر اترنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”کیوں۔ یہاں کیوں کیا تم یہاں رہتے ہو؟“

”نہیں۔ ہم وہیں چلیں گے جہاں تمہارے والد مسٹر بارلنگ قیام پذیر ہیں۔ یہاں سے ہماری سواری ہمیں لے جائے گی؟“ عامر نے کہا۔

لیکن مسٹر عامر یہ تو دوسرا ملک ہے کیا کیا ایئر پورٹ کا عملہ ہمیں باہر جانے دے گا۔“

”میرا خیال ہے وہ لوگ ہمیں نہیں روکیں گے یہاں میرے بہت سے ساتھی موجود ہیں عامر نے کہا اور لیزرا نے شانے ہلا دیئے اور عامر اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے طیارے کی میڈیوں کی طرف بڑھ گیا جہاں سے دوسرے چند مسافر اتر رہے تھے وہ لوگ بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ نیچے اتر آئے حالانکہ طیارے کے پاس مقامی کسٹم کا عملہ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن کسی نے ان دونوں سے تعرض نہیں کیا۔ اور عامر نے لیزرا کو پاسپورٹ دکھانے دیا۔ لیزرا تعجب سے منہ پھاڑ کر رہ گئی۔ پھر عامر اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایئر پورٹ کے مین گیٹ سے باہر نکل آیا اور لیزرا گھبرا کر بولی۔

”مسٹر عامر۔۔۔ میرا سامان؟“

”وہ آجائے گا“ عامر نے گردن خم کر کے مسکراتے ہوئے کہا اور لیزرا بے چینی سے پیچھے پلٹ کر دیکھنے لگی۔ انہوں نے آخری میڈی سے نیچے قدم رکھا تھا کہ ایک اعلیٰ درجے کی لمبی کار ان کے سامنے آکر رک گئی اس سے دو باوردی آدمی نیچے اترے انہوں نے انہیں کی سی وردی پہن رکھی تھی اور اس میں وردی میں وہ بہت خوب صورت نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک جلدی سے کار کا عقبی دروازہ کھولا اور عامر نے لیزرا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لیزرا جو اس کار کو دیکھ کر سکت رہ گئی تھی بادل خواستہ اس میں بیٹھ گئی کار کی گھڑیاں اس کے نازک بوجھ سے دب گئیں اور عامر بھی اس کے برابر آ بیٹھا۔

”شان! کسٹم ہاؤس میں مس لیزرا کا سلمان موجود ہو گا اسے اٹھا لاؤ۔“ عامر نے حکم دیا۔

”بہت بہتر بناب؟“ ایک وردی پوش نے کہا اور آہستہ آہستہ پرسکون قدموں سے چلتا ہوا ایرپورٹ کے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ لیزرا پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی اس ایرکنڈیشنڈ گاڑی کو دیکھ رہی تھی کبھی عامر کو اور جب اس سے نہ رہا گیا تو اس نے آہستہ سے عامر کے کان میں سرگوشی کی۔

”کیا یہ تمہاری کار ہے؟“

”کیوں پسند نہیں آئی؟“ عامر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بہت خوب صورت ہے۔ ایسی کاریں تو ہمارے ہاں کے کروڑ پتیوں کے پاس ہوتی ہے کیا تم بہت مالدار انسان ہو عامر۔“

”بس خدا کا عنایت کردہ سب کچھ ہے تمہیں کسی چیز کی تکلیف نہ ہوگی؟“

”کیا تم اسی ملک کے باشندے ہو؟“

”نہیں یہ میرا وطن نہیں ہے۔ میرا وطن وہی ہے جہاں تم جا رہی تھیں۔ اور اب جہاں ہم جائیں گے۔“

”اوہ لیکن یہاں تمہارے ساتھی کیسے موجود ہیں۔“

”ہمارے نمائندے بہت سے شہروں، بہت سے ملکوں میں ہیں۔“

”تو میرا خیال درست تھا۔“ لیزرا نے خواب ناک آواز میں کہا

”کونسا خیال؟“

”تم ضرور مشرق کے شنراوے ہو۔ ارے میں تو تمہاری شکل دیکھ کر ہی پہچان گئی تھی مگر مجھے اپنی خوش فہمی پر جس قدر ناز ہو کم ہے میری تم سے ملاقات نہ ہوتی تو میں مشرق سے اس قدر لطف اندوز نہیں ہو سکتی تھی جتنی اب ہوں گی۔ بتاؤ کیا تم روایتی شنراوے ہو؟“

”میں ایک معمولی انسان ہوں لیزرا اور بس جو کچھ ہوں تم دیکھ لوگی۔“ عامر نے جواب دیا اور لیزرا اس ملازم کو دیکھنے لگی جو اس کا اٹیچی کیس اور باسکٹ لئے آ رہا تھا۔ ان

نے دونوں چیزیں ڈکی میں رکھیں اور پھر ڈرائیور کے پاس آ بیٹھا اور پھر لمبی کار سڑکوں پر پھسلنے لگی۔

”تم کہاں کہاں کی سیر کراؤ گے؟“

”جہاں کی تم کو ملے گی؟“

”بس تم مجھے تمام علاقے دکھا دینا میں تو ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔؟“

”تب ٹھیک ہے اپنی سیر کے پروگرام میرے اوپر چھوڑ دو۔“ عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن میرے ڈیڈی کو اطلاع ضرور مل جانی چاہیے۔“ لیزرا نے کہا۔

”فوری طور پر — تم مطمئن رہو۔“ عامر نے کہا اور لیزرا خاموش ہو کر اس خوب صورت شہری سڑکوں اور بازاروں کو دیکھتی رہی پھر کار حسین رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی جہاں اعلیٰ طرز کی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ انہیں میں سے ایک کوٹھی کے سامنے کار رک گئی۔ کوٹھی کے گیٹ پر کھڑے ملازم نے جو ایک دوسری خوب صورت وردی میں ملبوس تھا۔ کوٹھی کا آہنی گیٹ کھول دیا اور کار اندر داخل ہو کر پور ٹیکو میں رک گئی۔

لیزرا کار کی کھڑکی سے گردن نکالے اس خوب صورت کوٹھی کو دیکھ رہی تھی اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب سب لوگ نیچے اتر گئے۔ پھر جب عامر نے اس کے سامنے کار کا دروازہ کھولا تب وہ چونکی۔

”آئیے مس لیزرا۔ کیا آپ نیچے نہیں اتریں گی۔“

”ہائے عامر یہ تمہاری کوٹھی ہے۔ یہ تمہاری ہی کوٹھی ہے۔ کیسی خوب صورت‘ کیسی دلکش ہے یہ“ وہ نیچے اترتے ہوئے بولی اور عامر نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کوٹھی کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آئیے اندر چلیں۔“ اور وہ اس کا ہاتھ پکڑے وئے کوٹھی کے مین گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ خوب صورت محرابوں والے دروازے سے گذر کر وہ ایک چوڑی راہداری میں پہنچ گئی۔ جہاں سنگی مجستے چھت کا وزن اپنے کندھوں



”مس لیزرا کو غسل کراؤ اور انہیں مقامی لباس پہنا دو۔“  
 ”جو حکم“ چاروں لڑکیوں نے بیک وقت کہا اور لیزرا سے انھنے کی درخواست کی۔  
 ”سچ سچ — سچ جاؤں۔ یہ مذاق تو نہیں ہے۔“ لیزرا نے کھڑے ہوتے ہوئے  
 پوچھا۔

”نہیں مس لیزرا آپ جیسی معصوم لڑکی سے ایسا مذاق نہیں کیا جاسکتا۔ آپ بے  
 دھڑک جائیں۔ انہیں اپنی خدامائیں سمجھیں جو کام چاہیں ان سے لیں“ اور وہ سحرزدہ سی  
 ان خداموں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ خدامائیں اسے لئے ہوئے اس دروازہ سے باہر نکل  
 گئیں۔ دروازے کے دوسری سمت بھی ایک راہداری تھی جو رنگین ٹائلوں کے فرش سے  
 مزین تھی اس راہداری کے دونوں سمت دروازے بنے ہوئے تھے۔ ایک خوب صورت  
 دروازے کے سامنے خدامائیں رک گئیں ان میں سے ایک نے جلدی سے دروازہ کھولا اور  
 پھر بڑے ادب سے لیزرا سے اندر چلنے کی درخواست کی۔ لیزرا اندر داخل ہو گئی۔ ایک بار  
 پھر اس کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ یہ پورا کمرہ تھا جس کے چاروں طرف کی دیواروں میں  
 رنگین شیشے آویزاں تھے۔ دیواریں شیشوں ہی کی بنی ہوئی تھیں اور ان شیشوں میں لیزرا کو  
 مختلف رنگوں میں اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔

پھر ایک ملازمہ باہر نکل گئی اور باقی خداموں میں سے ایک نے دروازہ اندر سے بند  
 کر لیا۔ اس کے بعد خدامائیں مسکراتی ہوئی آگے بڑھیں اور لیزرا کے جسم سے لباس  
 اتارنے لگیں۔

”تم — تم کیوں — لباس کیوں اتار رہی ہو؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔  
 ”غسل نہیں کریں گی حضور“ ایک ملازمہ نے شیریں آواز میں کہا۔ وہ انگریزی بول  
 رہی تھی لیکن لہجہ مختلف تھا۔  
 ”تت — تو یہ غسل خانہ ہے۔“

”جی ہاں۔“  
 ”اوہ گہری پانی کہاں ہے؟“ لیزرا نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”وہ بھی میا ہو جائے گا حضور آپ لباس اتاریں۔“

پر اٹھائے ہوئے کھڑے تھے نیچے فرش پر اتنا موٹا قالین بچھا ہوا تھا کہ لیزرا کے پاؤں ٹخنوں  
 تک اس میں دھنسے جا رہے تھے۔ لیزرا خواب کے عالم میں عامر کا ہاتھ پکڑے چل رہی  
 تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح گھوم گھوم کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ راہداری کے اختتام پر  
 ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ جس میں ایک طرف قیمتی صوفے پڑے ہوئے تھے۔ ہال میں  
 آکر عامر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور لیزرا چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگی۔

میرا خیال ہے سفر کی تھکن دور کرنے کے لیے غسل مناسب رہے گا۔ ایک بات  
 عرض کروں مس لیزرا آپ میری مہمان ہیں۔ اب آپ نہ تو کسی قسم کا تکلف کریں اور  
 نہ کسی بات پر اعتراض کریں۔ اس طرح آپ ہمارے پورے ماحول سے لطف اندوز  
 ہو سکیں گی۔“

”اے یہ سب کچھ دیکھ کر میرے حواس ہی کب قائم ہیں جو میں تکلف یا تعرض  
 کروں گی۔ بتاؤ اب کیا کروں؟“ لیزرا نے کہا اور جواب میں عامر نے تالی بجائی۔

ہال کا ایک دروازہ کھلا اور چار لڑکیاں اندر داخل ہو گئیں۔ وہ چاروں انتہائی خوب  
 صورت تھیں اور انہوں نے مشرقی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایسے لباس لیزرا نے صرف  
 تصویروں میں دیکھے تھے۔

وہ چونک کر لڑکیوں کو دیکھنے لگی اور اسے اپنے جسم پر پہنا ہوا لباس بے حقیقت  
 محسوس ہونے لگ اور وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے  
 عامر کو دیکھنے لگی۔

”یہ آپ کی خدامائیں ہیں آپ ان سے تمام کام لے سکتی ہیں۔“ عامر نے کہا۔

”ارے ارے کیا مذاق ہے وہ براہمان جائیں گی۔“ لیزرا آہستہ سے بولی۔

”کیوں! براہمان کی کون سی بات ہے؟“ عامر نے پوچھا۔

کیا وہ شہزادیاں نہیں ہیں؟“

”نہیں لیزرا میں نے آپ سے غلط نہیں کہا ہے وہ آپ کی خدامائیں ہیں۔“ عامر  
 نے کہا اور پھر خداموں کو اشارے سے قریب بلایا۔ وہ ادب سے چلتی ہوئی اس کے سامنے  
 پہنچیں اور جھک کر سیدھی ہو گئیں۔

”مگر.....؟“

ہم تو خدائے میں حضور ہم سے شرم نہ کریں آپ کو تنہا غسل کرنے میں قناعت ہو گی۔ براہ کرم ہمیں اپنا فرض پورا کرنے دیں۔“ ملازمہ نے حسین انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور لیزا نے گہری سانس لے کر خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ملازمائیں اس کا لباس اتارنے لگیں اور چند لمحات کے بعد وہ عریاں تھی۔ رنگین آئینے اس کے حسین جسم کے نقوش مختلف رنگوں میں پیش کر رہے تھے۔ یوں تو وہ روزانہ ہی غسل کرتی تھی اس نے اپنے جسم پر کبھی توجہ نہیں دی تھی لیکن آج — آج اسے اپنا جسم بے حد حسین لگ رہا تھا اور اسے احساس تھا کہ کچھ اور آنکھیں بھی اسے دیکھ رہی ہیں۔ اسے بڑی شرم محسوس ہوئی اور وہ معیوب نظروں سے قریب کھڑی لڑکیوں کو دیکھنے لگی۔

”پھر نہ جانے کیا ہوا چھت سے پانی کی پھواریں نکلنے لگیں رنگین آئینوں نے پانی کو بھی رنگ دیا قریب کھڑی ہوئی لڑکیاں اس کے جسم کو اسفنج سے صاف کرنے لگیں اور نرم و لطیف اسفنج سے اس کے جسم میں گدگدیاں ہونے لگیں لڑکیاں اسے غسل کراتی رہیں اور وہ شرماتی رہی۔ اس کے جسم میں گدگدیاں ہوتی رہیں اور اس پر بے خودی کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر وہ غسل سے فارغ ہو گئی چوتھی لڑکی نے دروازے پر دستک دی اور ان میں سے ایک نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ چوتھی لڑکی کے ہاتھوں پر چاندی کا ایک تھال تھا جس میں کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ ایک ریشمی چادر اس کے جسم کے گرد لپیٹ دی گئی اور پھر لڑکیاں اسے اپنے ہاتھوں سے لباس پہنانے لگیں۔

عجیب لباس تھا بے حد حسین اور جب لباس پہن کر خود کو آئینے میں دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ اوہ — وہ کیا سے کیا بن گئی تھی۔

”کیا یہ میں ہی ہوں؟“ اس کے منہ سے نکلا اور پھر لڑکیاں اس کے سنہرے بال گوندھنے لگیں اور ایک خاص انداز میں بال باندھے اور اب لیزرا خود بھی خود کو نہیں پہچان سکتی تھی۔

تب ملازمائیں اسے ہاتھ روم سے نکال کر ایک اور کمرے میں لے گئیں۔ یہ کمرہ بھی اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ انہوں نے اسے ایک کوچ پر بٹھا دیا۔ اور پھر ان

میں سے تین لڑکیاں باہر نکل گئیں اور ایک اس کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی۔

”ارے تم نیچے کیوں بیٹھ گئیں اوپر بیٹھو۔“

”ہم خدائیں ہیں حضور ہماری جگہ یہی ہے۔“ ملازمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مگر تم عامر صاحب کی ملازم ہو۔؟“

”اور آپ ان کی دوست ہیں۔ مالکوں کے دوست بھی مالک ہوتے ہیں۔“ ملازمہ

نے جواب دیا۔

”اوہ۔ دراصل تم نہیں جانتیں۔ میں تو خود ایک غریب لڑکی ہوں۔ میں نے تو اتنا

قیمتی لباس ایسی عالیشان کوٹھی خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ ایک بات بتاؤ گی؟“

”ضرور —“ لڑکی نے جواب دیا۔

”کیا عامر صاحب شہزادے ہیں؟“

”شہزادوں سے بھی بڑھ کر۔ ممکن ہے انہوں نے آپ کو نہ بتایا ہو۔“

”مگر میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔“ لیزرا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں مشرقی

شہزادوں کو خواب میں دیکھتی تھی۔ اور مسٹر عامر جیسے ہی وہ ہوتے تھے لیکن میرے وہم گمان

میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں خود کسی مشرقی شہزادے کی مہمان بنوں گی کیا تم مجھے یقین

دلا سکتی ہو کہ میں عالم خواب میں نہیں ہوں۔“

”آپ مکمل عالم ہوش میں ہو۔“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا اور لیزرا حیرت سے

چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اسی وقت دروازے سے ایک نئی شکل نمودار ہوئی۔ یہ بھی ایک

خوب صورت ملازمہ تھی۔

عامر صاحب نے کھانے کے کمرے میں طلب کیا ہے۔“ اس نے شیریں آواز میں

کہا اور لیزرا کے قدموں میں بیٹھی ہوئی ملازمہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلئے حضور۔“ اس نے کہا اور لیزرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ملازمہ اس کے ساتھ ساتھ

چل رہی تھی تھوڑی دیر کے بعد وہ کھانے کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ اور لیزرا کمرے کو

دیکھ کر مبہوت ہو گئی۔ بڑا جگمگاتا ہوا کمرہ تھا فرش پر قالین بچھا ہوا تھا جس پر ایک سیاہ لمبی

میز رکھی تھی۔ اس کے گرد سیاہ حسین کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر سفید و سنہرے برتن سجے

”کل صبح کو ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے مس لیزرا — آپ یہ فرمائیے کہ آپ مشرق کے کون سے حصوں سے زیادہ متاثر ہیں۔ آپ کو یہاں کون سی کمائیاں زیادہ پسند ہیں تاکہ میں آپ کے لئے پروگرام ترتیب دے سکوں۔ یوں تو میں آپ کو یہاں کے پورے علاقے دکھاؤں گا۔ لیکن خاص طور سے آپ کی پسند بھی پتہ چلنا چاہیے۔“

”میں کیا بتاؤں عامر صاحب میں نے جو کچھ دیکھا ہے اسی پر ششدر ہوں مشرقی شہزادوں کی بھی کیا زندگی ہوتی ہے وہی سب کچھ جو میں پڑھ چکی ہوں اور جنہیں فرضی داستانیں خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم مجھے یہاں کی پراسرار داستانیں بہت پسند ہیں میں چاہتی ہوں کہ ان رومانی علاقوں کو دیکھوں جہاں کے عشق کی داستانیں کلاسیکی خشیت رکھتی ہیں۔ ان ویران کھنڈرات کو دیکھوں جہاں روحیں آباد ہیں۔ ان سیدھے سادھے انسانوں کو دیکھوں جو مصنوعی زندگی سے دور ہیں جدید شہروں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ میں اپنے ملک میں دیکھ چکی ہوں۔“

”خوب“ عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے کل سے ہمارا سفر شروع ہو جائے گا۔“ عامر نے کہا اور پھر وہ کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ عامر اسے مشرق کی پراسرار کمائیاں سناتا رہا۔ اور لیزرا جب ایک آرام دہ مسہری پر سونے کے لئے لیٹی تو اس کی آنکھوں میں ہزار ہا خواب بے ہوئے تھے۔ پوری رات وہ پراسرار وادیوں کی سیر کرتی رہی۔ عجیب عجیب مناظر دیکھتی رہی۔

صبح کو ملازماؤں نے مدھم سازوں کی آواز سے جگایا خواب سے چونک کر کافی دیر تک وہ حیران رہی اسکا خیال تھا کہ اب آنکھ کھل جائے گی اور وہ اپنے چھوڑے مکان میں ہوگی جس کے بیرونی حصے سے مرغیوں کی کڑکڑاہٹ ابھر رہی ہوگی۔

لیکن یہ طلسم نہیں ٹوٹا۔ سازوں کی مدھم لے جسم میں سرد لہریں پیدا کر رہی تھیں اس نے بستر پر پڑے پڑے انگڑائیاں لیں اور ملازماؤں کے مسکراتے چہرے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ حسب معمول کئی ملازماؤں نے اسے غسل کرایا۔ اور پھر ناشتہ کے کمرے میں لے گئیں جہاں عامر اس کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ عامر نے اسے صبح بخیر کہا اور پھر ناشتہ میں مصروف ہو گئے۔

ہوئے تھے جن کے بارے میں لیزرا نے اندازہ لگایا کہ وہ سونے اور چاندی کے ہو سکتے ہیں چھ ملازماں دست بستہ کھڑی تھیں۔ میز کے گرد بڑی ہوئی ایک کرسی پر عامر ایک خوب صورت سرخ لبادے میں ملبوس بیٹھا تھا۔ لیزرا کو دیکھ کر وہ مسکراتا ہو کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر قدم کیا اور اسے اپنے سامنے بیٹھنے کی پیشکش کی۔ لیزرا سحر زدہ سی بیٹھ گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا بار بار وہ خود کو ہوش میں سمجھنے کی کوشش کرتی۔ لیکن جو نیا منظر سامنے آتا۔ وہ اسے عالم خواب میں لے جاتا۔ وہ خود کو الف لیلو یابو الحسن سمجھنے لگتی جو شہنشاہ ہارون الرشید کے مذاق کا شکار ہوا تھا۔

”مغرب کی حسینہ کی مشرق کے پہلے باب میں خوش آمدید کہتا ہوں۔“ عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شش — شکر یہ عامر صاحب لیکن خدا کے لئے مجھے یہ بتا دو کہ کیا میں واقعی عالم ہوش میں ہوں؟“

آپ ہوش میں ہیں مس لیزرا آپ مشرق دیکھنے کی خواہش مند تھیں میں بحیثیت دوست آپ کو مشرق کی سیر کراؤں گا۔ خود پر سے سحر زدہ کیفیت ختم کر کے مشرق کے حسن سے لطف اندوز ہوں۔“

”لیکن آپ — آپ مجھے کیسے مل گئے عامر صاحب —“

بس یوں سمجھیں میں آپ کے استقبال کے لئے گیا تھا اور بالآخر آپ کو یہاں لے آیا۔“ عامر نے کہا اور پھر ملازماؤں نے کھانا سرو کرنا شروع کر دیا۔

لذیذ ترین کھانے تھے۔ عامر اصرار کر کے لیزرا کو کھلاتا رہا اور لیزرا ایک ایک کھانے کے بارے میں دلچسپی سے پوچھتی رہی وہ کوشش کر رہی تھی کہ خود پر یہ کیفیت ختم کر دے آخر عامر کیا سوچے گا اسے احساس رکھنا چاہیے کہ وہ ایک ایئرٹن پرنس کی مہمان ہے اور کھانے کے دوران اس نے کافی حد تک خود پر قابو پایا۔

کھانے کے بعد اسے ساتھ لئے کمرے سے باہر نکل آیا پھر وہ اسے اس کوٹھی کے ایک ایک حصے کی سیر کراتا رہا۔ اور لیزرا مرعوب ہوتی رہی۔ پھر وہ نشست کے کمرے میں آ بیٹھے اور عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم سفر کے لیے تیار ہیں مس لیزرا لیکن مجھے آپ سے ایک اور بات دریافت کرنا تھی۔

”کیا.....“

”کیا آپ اپنے سفر کے لئے جدید ذرائع پسند کریں گی یا پھر یہاں بھی مشرقی انداز کا سفر پسند کیا جائے گا۔“

”اگر مجھے یہاں کے ہر رنگ سے روشناس کرایا جاسکے تو بڑی مسرت محسوس کروں گی۔“ لیزرا نے کہا۔

”ٹھیک ہے رتھ تیار کراؤ۔“ عامر نے کہا اور ملازماؤں میں سے ایک ملازمہ سر جھکا کر باہر نکل گئی۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑی دیر تک وہ گفتگو کرتے رہے پھر ملازمہ نے آکر اطلاع دی کہ رتھ تیار ہے اور عامر نے اس سے چند لمحات کی اجازت طلب کی ملازماں لیزرا کے گرد جمع ہو گئیں اور لیزرا ان کے درمیان بڑی فرحت محسوس کرنے لگی۔

تقریباً دس منٹ کے بعد عامر واپس آگیا۔ اب وہ ایک جدید لباس میں تھا۔ اس نے لیزرا کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔ باہر ایک محرابی رتھ کھڑا ہوا تھا جس میں بیلوں کی جگہ چار سفید رنگ کے تندہ رست گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ گھوڑوں پر سونے چاندی کا ساز سجا ہوا تھا۔ اور رتھ بھی گنگا جمنی کا کام تھا خوب صورت وردی میں بیٹھے ہوئے کوچوان نے ایک چوکی رکھ دی اور لیزرا اس چوکی سے گزر کر رتھ میں جا بیٹھی۔ اندر آرام وہ مچلیں گدیاں لگی ہوئی تھیں۔ عامر بھی رتھ میں آ بیٹھا اور اس نے باریک سے پردے گرا دیئے۔ اور سبک رفتار گھوڑے چل پڑے۔ ان کی رفتار دیکھ کر لیزرا کو چکر آ رہے تھے حالانکہ گاڑی شہر کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ لیکن کوئی اس کی طرف نہیں تھا۔ ایک بار لیزرا کا دل بہت تیزی سے دھڑکا سنسان سڑک پر سامنے سے دو تیز رفتار ٹرک آ رہے تھے۔ انہوں نے پوری سڑک گھیری ہوئی تھی اور بظاہر ایسا کوئی راستہ تھا جہاں سے گاڑی نکل جاتی لیکن نہ تو ٹرکوں کی رفتار کم ہوئی اور نہ ہی کوچوان نے گاڑی کی رفتار سست کی لیکن چند ہی لمحات میں ٹرک دوسری طرف نکل گئے اور گاڑی ہی رفتار سے دوڑتی رہی۔

لیزرا نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے گاڑی ٹرکوں میں داخل ہو کر دوسری طرف نکلی ہو پھر اس کی رفتار سست ہونے لگی۔ لیزرا کو اندازہ نہ ہو سکا کہ اس نے کتنا سفر طے کیا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد عامر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ہم اپنے وطن میں داخل ہو گئے ہیں لیزرا یہ میری سر زمین ہے۔ رومانوں کی سر زمین جہاں کے رومان تمہیں بے حد پسند ہے آؤ میں تمہیں ایک درد ناک منظر دکھاؤں۔

کوچوان گاڑی کا رخ صحرا کی طرف موڑ دو۔“ اور گاڑی کا رخ بدل گیا۔ تھوڑی دیر پر ریت کے اونچے نیچے ٹیلے نظر آ رہے تھے پھر اچانک تیز ہوا چلنے لگی اور ریت کی چادر فضا میں پھیل گئی۔ رتھ رک گیا۔ گرم اور خاک آلودہ ہوا صرف دیکھی جاسکتی تھی۔ رتھ کے اندر اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیزرا حیرت زدہ نظروں سے اس ہوا کو دیکھنے لگی اور دفعتاً اس کے کانوں سے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ ایک عجیب سی درد ناک چیخ اور لیزرا آنکھیں پھاڑنے لگی۔ تب اسے ریت کی چادر میں لپٹا ہوا ایک ہولا نظر آیا۔ بکھرے ہوئے بال، لیکن حسن کی دولت سے مالا مال۔ زمانے کی ستم ظریفیوں کا شکار نسوانی چیخ پھر سنائی دی اور اس کے جواب میں ایک اور چیخ سنائی دی۔ یہ مردانہ آواز تھی۔

لیزرا کی سانسیں بند ہو گئیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے عامر۔ انہیں گاڑی میں بلاؤ، ورنہ یہ دونوں مرجائیں گے۔“ اس نے عامر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اور عامر کے چہرے پر اداسی بکھر گئی۔

”موت ان کا مقدر ہے لیزرا قدرت نے ان کے لئے یہی موت متعین کی ہے تاکہ ان کی داستان زندہ جاوید ہو جائے۔“

”یہ کون ہیں عامر۔ تم ان کی مدد کیوں نہیں کرتے“ لیزرا بے چینی سے بولی۔

یہ سسی ہے۔ ریگزار سندھ کی ایک البر حسینہ اور وہ مکران کا شہزادہ بنوں ہے۔ اور ریت کی دیواریں زمانہ ہے جس نے آخر دو محبت بھرے دلوں کو دفن کر دیا۔ کوچوان آگے بڑھو۔“ عامر نے سست لمبے میں کہا اور کوچوان نے رتھ آگے بڑھا دیا۔

تمہارے ہاں محبت کرنے والوں پر ایسے مظالم کیوں ہوتے ہیں عامر؟“ لیزرا نے دکھ

بھرے لہجے میں کہا لیکن عامر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سرسبز علاقہ شروع ہو گیا اور پھر رتھ ایک دریا کے کنارے رک گیا۔

”اوہ کیسی پر رونق جگہ ہے۔ کونسا دریا ہے؟“

”یہ دریاے چناب ہے وہ دیکھو — وہ کون ہے؟“ عامر نے ایک طرف اشارہ کیا اور لیزرا اس طرف دیکھنے لگی اور پھر وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔

”ارے ارے وہ لڑکی پاگل پن کر رہی ہے۔ کیا مٹی کا یہ برتن اسے دوسرے کنارے پر پہنچا دے گا؟“

”ہاں اس کے پاس محبت کی قوت ہے لیزرا جانتی ہو وہ کون ہے؟“

”نہیں — لیزرا نے گردن ہلا دی۔“

”وہ سوہنی کہانیاں ہے۔ اور دریا کے اس کنارے پر جو ہیولا نظر آرہا ہے وہ اس کا محبوب مہینوال ہے جو اس کا منتظر ہے۔ ان کی زندگی کے تاریک دورے سے وابستہ ہیں سوہنی مہینوال کے بغیر مر بھی نہیں سکتی۔ دریا ان کی محبت کا امین ہے وہ ان دونوں کی جذائی میں کبھی معاون نہیں بن سکتا۔ کو جوان رتھ آگے بڑھاؤ۔“ اور رتھ آگے بڑھ گیا۔

سورج جھکنے لگا اور پھر شام ہو گئی۔ رتھ اب ایک گاؤں کے قریب پہنچ رہا تھا۔ کچے مکانوں کی یہ بستی شام کے دھند لکوں میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اور لیزرا دلچسپی سے اس حسین بستی کو دیکھ رہی تھی۔

”عامر صاحب — اس نے آہستہ سے کہا۔“

”ہوں —“

”کیوں نہ آج رات ہم اس بستی میں قیام کریں مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔ ہم بستی والوں کے رہن سہن کا جائزہ لیں گے۔“

”ضرور — کیا حرج ہے۔“ عامر نے کہا اور گاڑی کو روکنے کے لئے کہا۔

”تمہیں بسو — لگ رہی ہوگی۔ پہلے کچھ کھالیں پھر بستی کی سیر کو چلیں گے۔ اس وقت چاند بھی نکل آئے گا۔ چاندنی رات میں ڈوبے ہوئے کھیتوں میں رومان جنم لیتے ہیں کو جوان کھانے کا انتظام کرو۔“

زمین پر بچے ہوئے قالین پر اعلیٰ درجے کے کھانے پئے ہوئے تھے۔ لیزرا حیران رہ گئی۔ لیکن اس نے ان گرم کھانوں کے بارے میں سوال نہیں کیا۔ یہاں کی ہر چیز پر اسرار تھی۔ یہاں کا ایک ایک شخص پر اسرار تھا۔ وہ کون کون سی چیزوں کے بارے میں پوچھتی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو چاند کی قتیل روشن ہو چکی تھی اور کہیں بانسری کی آواز سنائی دے رہی تھی لیزرا اس آواز کو غور سے سننے لگی۔ اس کی آنکھوں میں خمار سمٹ آیا تھا۔ وہ سحرزدہ سی ہو کر یہ آواز سن رہی تھی جب تک بانسری بجتی رہی وہ مبسوت کھڑی رہی پر بانسری کی لے ختم ہو گئی اور وہ ایک خواب سے چونک پڑی۔ اس حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا پھر عامر کو دیکھ کر ایک گہری سانس لے کر پوچھا۔

”یہ کیا تھا.....؟“

”کسی کے دل کے زخم سک رہے تھے۔“ ”آؤ بستی چلیں۔“ عامر نے کہا اور لیزرا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا بستی میں کافی دور نظر آرہی تھی لیکن عامر کے لمس میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ اسے یہ فاصلہ پتہ بھی نہ چل سکا اس نے بستی کے پہلے مکان کو دیکھا جس میں دیا روشن تھا۔ اور وہ چونک پڑی۔

”اوہ — ہم آبادی پہنچ گئے۔“

”ہاں —“ عامر نے کہا۔ اسی وقت کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑے۔

”آؤ دیکھیں کیا ہے؟ عامر نے کہا اور وہ چل پڑے کافی فاصلے پر بہت سی مشعلیں نظر آرہی تھیں۔ مشعلیں نہ بھی ہوتیں تو ان کی ضرورت نہیں تھی۔ آسمان پر بہت بڑی مشعل روشن تھی وہ دیہاتیوں کے قریب پہنچ گئے۔

ڈھول بج رہا تھا اور گاؤں کی لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ یہ رقص ایک مکان کے دروازے کے سامنے ہو رہا تھا۔ دروازے پر پتوں کی جھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔ کچے مکان کی دیواروں پر چونے سے نقش و نگار بنائے گئے تھے لیزرا پوری پوری دلچسپی سے اس رقص کو دیکھنے لگی۔ وہ بے حد خوش نظر آرہی تھی۔ پھر اس نے عامر کے کان میں سرگوشی کی۔

لیزرا کے لئے گاڑی میں سونے کا بندوبست کر دیا گیا۔ عامر اور کوچوان باہر سوئے تھے۔ پھر دوسری صبح جب لیزرا کی آنکھ کھلی تو ناشتہ تیار تھا۔ ناشتہ کے بعد وہ چل پڑے۔

سفید رتھ کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ تازہ دم گھوڑے برق رفتاری سے دوڑ رہے تھے۔ ماہہ سادہ بستیاں اور وہاں کی روایتیں دیکھتے ہوئے پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ عامر نے اسے نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کرا دی۔ لیزرا نے ان دنوں کو اپنی زندگی کے حسین ترین دنوں میں شمار کیا تھا۔

اس شام انہوں نے ایک سنان اور غیر آبلو علاقے میں قیام کیا تھا۔ چاروں طرف گھنے درخت کھڑے ہوئے تھے اور گھنے درختوں کے درمیان یہ بوسیدہ عمارت بھوت محل معلوم ہوتی تھی جہاں انہوں نے قیام کیا تھا۔ لیزرا کافی دیر تک اس ویران علاقے میں اس عمارت کے وجود پر بحث کرتی رہی تھی لیکن یہ بات طے نہ ہو سکی کہ آخر اس ویرانے میں اس عمارت کا وجود کیا معنی رکھتا ہے۔ تب مجبور ہو کر عامر نے کہا۔

”روحوں کا وجود تو مختلف اشکال میں دنیا کے ہر ملک میں ملتا ہے۔ یہ بات بھی پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے کہ روحیں گمراہی پسند نہیں کرتیں۔ اور ویرانوں کو اپنا مسکن بنا لیتی ہیں یورپ کے بھوت بھی ماڈرن ہوتے ہیں لیکن مشرقی بھوت بے چارے پسماندہ ہیں۔ وہ ننگ دھڑنگ پھرتے ہیں اور ان کی حرکات بھی بس ایسی ہی ہوتی ہے ممکن ہے یہ عمارت بھی بھوتوں کا مسکن ہو۔“

”اوہ — لیزرا کے چہرے پر خوف کے آثار ابھر آئے۔

”یہ بھوت نقصان بھی تو پہنچاتے ہیں عامر —“

”ہاں لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس لئے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”لیزرا کافی دیر تک خاموشی سے کچھ سوچتی رہی اور پھر بولی۔

”مجھے تو واقعی ڈر لگ رہا ہے۔ تم آج بالکل میرے قریب سونا عامر ورنہ میں

دُلف سے سونہ سکوں گی۔“ عامر مسکراتا رہا پھر لیزرا بولی۔

”یہ بھوت کہاں سے آتے ہیں اور کون ہوتے ہیں عامر؟“ ”ارواح خبیثہ جنہوں نے

اہل زندگی بدکاری میں گزار دی ہو۔ دراصل روح ایک لطیف شے ہے۔ اگر یہی فطرت

یہ لوگ کیوں ناچ رہے ہیں؟“

”اس مکان میں کسی کی شادی ہے۔ دو رومان بھرے دلوں کے ملاپ پر جشن منایا جا

رہا ہے۔“

”اوہ کیا میں انہیں دیکھ سکتی ہوں جن کی شادی ہو رہی ہے۔“ لیزرا نے کہا اور عامر خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑے مکان کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ عورتیں آجاری تھیں لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوا۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے کمروں میں جھانکتے ہوئے اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں پیلے کپڑوں میں ملبوس نمکی دہن سہاگ رات کے تصور کے رنگ چہرے پر بکھیرے گردن جھکائی بیٹھی تھی۔

”ہائے کیسی رو میٹک کیسی حسین ہے۔؟“ لیزرا نے کہا۔

”کیا میں اس سے باتیں کروں؟“

”وہ تمہاری زبان نہیں جانتی ہوگی اور پھر وہ اس وقت جن تصورات میں مگن ہے۔ اسے ان میں کھوئے رہنے دو ظلم ٹوٹ جانے سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔“ عامر نے کہا اور لیزرا نے گردن ہلا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے واپس چل پڑے پھر راستے میں کہیں دور سے کسی کے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی لیزرا کے قدم رک گئے۔ یہ کیا ہے اس نے پوچھا۔

”ہیر — یہ ہیر کی بستی ہے رانجھے کا دلیں ہے محبت کی داستان دہرائی جا رہی ہے۔ سنو کیا تم اس آواز کے درد کو محسوس کر سکتی ہو۔ یہ بول تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے لیکن محبت کرنے والوں کا تمام دکھ اس آواز میں سمٹ آیا ہے اسی لئے یہ آواز اس قدر پر سوز ہے۔

”ہائے کیسی پراسرار۔ کیسی میٹھی آواز ہے۔“ لیزرا نے کہا اور کافی دیر تک وہیں کھڑی سرسختی رہی۔ یہاں تک کہ آخری بول کے ساتھ گانے والے کی آواز ختم ہو گئی۔

”میں زندگی کے کسی حصے میں اس حسین رات کو نہ بھول سکوں گی۔“ عامر مسکراتے لگا اور پھر وہ گاڑی کے پاس پہنچ گئے کوچوان ان کا انتظار کر رہا تھا۔

”اس جنگل میں اگر بھوت ہوئے تو.....؟“

”مجھے خوفزدہ نہ کرو عامر دیے میں اتنی بزدل بھی نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس خنجر ہو تو میں اس پر حملہ بھی کر سکتی ہوں۔“

”تب پھر تم یہ خنجر رکھ لو۔ ممکن ہے تمہاری کسی بھوت سے ملاقات ہو جائے۔“

عامر نے ایک تیز خنجر اس کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں تم مجھے خوف زدہ کر رہے ہو لیکن میں نے جو کچھ کہا درست ہے“

لیزرا نے کہا۔

”بے شک تم سادہ اور معصوم ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر بھی ہو۔“ عامر نے کہا

اور لیزرا خاموش ہو گئی۔ کئی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

”عامر — تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے، میں اسے زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گی۔ جب میں یورپ میں سیلیوں کو مشرق کی داستانیں سناؤں گی تو خاص طور سے تمہارا تذکرہ کروں گی اور کہوں گی کہ مشرق کے لوگ جہاں پر اسرار اور دلکش ہوتے ہیں وہاں وہ بے حد مہمان نواز اور نیک بھی ہوتے ہیں۔ میں تمہیں زندگی کے کسی دور میں فراموش نہیں کروں گا عامر — اور اب میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے میرے ڈیڈی کے پاس بھجوا دو۔ بہت دن ہو چکے ہیں ڈیڈی میری گمشدگی سے پریشان ہوں گے۔“

ایک رات اور گزار لو کیا تم میرے گھر والوں سے ملاقات نہیں کرو گی۔ ان سے ملنے کے بعد میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں تمہارے ڈیڈی کے پاس پہنچانے کا بندوبست کروں گا۔“

”ہاں — ہاں میں تمہارے گھر والوں سے ضرور ملاقات کروں گی۔ میری خوش قسمتی ہے کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔“

عامر نے اس کا جواب نہ دیا۔ رات خاصی گزر چکی تھی لیزرا کو نیند آنے لگی اور پھر وہ باتیں کرتے کرتے سو گئی۔

اور پھر رات کو نہ جانے کونسا پہر تھا جب سوتے سوتے اس کی آنکھ کھل گئی۔ نہ

سے اسے کثیف کر دیا جائے تو وہ کبھی قرار نہیں پاتی۔ ہمارے مذہب میں موت کا نام ہے لیکن اگر زندگی اچھے اعمال کے ساتھ گزاری ہو۔ اور اگر روح پر کثافت کی غلیظ تہ چڑھی ہو تو موت کے — بعد بھی اسے سکون کی وادیوں میں پناہ نہیں ملتی اور وہ دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے اور پھر ظاہر ہے بری رو میں برے ہی کام کریں گی۔“

”ایک اور مخلوق کا نشان بھی تو ملتا ہے عامر جسے جن کہا جاتا ہے۔“ لیزرا نے کہا اور عامر بری طرح چونک پڑا اس نے عجیب سی نظروں سے لیزرا کی طرف دیکھا اور کئی منٹ تک دیکھتا رہا۔ لیزرا سادگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عامر کی یہ حیرت اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ اور عامر نے جب اس کا سوال اچھی طرح پڑھ لیا تو بولا۔

”تمہیں جنوں کا خیال کیسے آیا؟“

”بس میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کیا یہ روایت غلط ہے؟“

”نہیں تمہارا خیال درست ہے۔ یہ آتش مخلوق ہے انسانوں سے ذرا مختلف لیکن اس کے جذبات، احساسات بھی سو فیصدی انسانوں جیسے ہیں۔ عام حالات میں ان میں اور انسانوں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔“

”کیا وہ عام طور سے نظر آ جاتے ہیں؟“ لیزرا نے پوچھا۔

”عموماً وہ انسانوں کی دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ انسانوں میں اس قدر گھل مل بھی جاتے ہیں کہ وہ انسان تیز نہیں کر سکتا کہ وہ انسان ہیں یا ان سے مختلف کوئی مخلوق۔“

”اوہ —“ لیزرا نے گردن ہلائی۔ ”میں نے ان کے بارے میں بھی بہت سی

کہانیاں پڑھی ہیں۔“

”اگر جن سے تمہاری ملاقات ہو جائے تو کیا تم خوف زدہ ہو جاؤ گی؟“ عامر نے

پوچھا۔

”اگر وہ بھیانک ہو! اور اس نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تب تو ظاہر ہے

لیکن اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ میں کسی جن کو دیکھوں۔“

”اوہ —“ عامر ہنسنے لگا پھر بولا۔

”آپ چلنے کے لئے تیار ہیں؟“

”ہاں۔ جب مسٹر عامر نے کہا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ لیزرا نے کہا۔  
 ”تب پھر میرے ساتھ آؤ۔“ کرمہ صورت انسان نے کہا اور لیزرا اس کے ساتھ  
 کمرے سے باہر نکل آئی۔ کرمہ صورت آدمی اسے لے کر عمارت کے صحن میں پہنچ گیا۔  
 اور اچانک لیزرا نے اس کا قد بڑھتے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس خوف ناک انسان کے جسم  
 میں ہوا بھرنی شروع ہو گئی ہو۔ لیزرا پھر خوف زدہ ہو گئی۔ وہ خوف و دہشت کے عالم میں  
 اس کے بلند ہوتے قد کو دیکھ رہی تھی۔ اب وہ شخص صحن کی دیواروں سے بھی اونچا نکل  
 گیا تھا۔ اس کی ٹانگیں موٹے موٹے ستونوں کی طرح نظر آرہی تھیں اور لیزرا کا دہشت  
 سے برا عالم تھا۔ اور پھر اس کے چوڑے ہاتھ پھیل گئے اور لیزرا کو کسی ننھی سی گڑیا کی  
 طرح اٹھالیا۔ لیزرا کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔ لیکن اسے اس شخص کی ہتھیلیاں بے  
 حد نرم لگ رہی تھیں۔ بالکل فوم کے گدوں کی طرح۔ اور پھر لیزرا کو خوف کے ایک اور  
 جھٹکے کا سامنا کرنا پڑا۔ دیو قامت کسی راکٹ کی طرح سیدھا بلند ہو گیا تھا۔ اس کے پیروں  
 نے زمین چھوڑ دی تھی۔ لیزرا نے دہشت کے عالم میں نیچے دیکھا اور اور آنکھیں بند  
 کر لیں۔ زمین بہت نیچی ہو گئی تھی۔ روشنیاں ننھے ننھے نقطے معلوم ہونے لگی تھیں۔ اگر وہ  
 اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تو کیا ہوگا۔ وہ سوچنے لگی اور اس کا جسم پسینے میں بھیک گیا۔  
 شاید آپ خوف زدہ ہیں خانم لیکن اطمینان رکھئے آپ نیچے نہیں گریں گی۔“

”مگر تم کون ہو؟“ لیزرا نے کہا۔

”میں عرض کر چکا ہوں چونکہ میں شہزادہ عامر کا خادم ہوں اس لئے آپ کا بھی خادم  
 ہوں۔ آپ کو میرے اوپر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

”لیکن تم پرواز کیسے کر رہے ہو۔ تمہارا قد اتنا کیسے بڑھ گیا۔؟“

”آپ نے مشرق کی کہانیوں میں ہمارے پراسرار قصے ضرور پڑھے ہوں گے۔ آپ  
 ہمیں پہچان سکتی ہیں۔“

”لیکن کیا میل کے سب باشندے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہاں کے تمام باشندے  
 پرواز کر سکتے ہیں۔ ان کے قد بڑھ سکتے ہیں۔“

واپس آگئے وہ شکل ایسی ہی بھیاںک تھی جو اسے چھت کے قریب نظر آئی تھی ہاں وہ انسانی  
 چہرہ ہی تھا لیکن کیسا کرمہ کیسا بھیاںک — وہ خوف زدہ ہو گئی اسے سب کچھ یاد آ گیا کہ  
 وہ کہاں ہے۔ عامر سے رات ہی کو بھوتوں کی باتیں ہوئی تھیں۔ اور اب — اب اس  
 کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

کیا یہ بھوت ہے ارواح خبیثہ؟“

”عامر — عامر اس نے خوفزدہ آواز میں پکارا۔ لیکن عامر شاید بے خبر سو رہا تھا۔  
 خوفناک چہرہ بدستور اسے گھور رہا تھا۔ اس کی سفید آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے۔  
 ”عامر —“ لیزرا نے تیسری بار عامر کو پکارا اور گھوم کر اسے دیکھنے لگی لیکن یہ  
 کیا — عامر تو کمرے میں موجود نہیں تھا کمرہ خالی پڑا تھا۔

”لیزرا کے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ عامر کہاں گیا اور — اور اب  
 وہ اس کرمہ المنظر انسان کے ساتھ اس کمرے میں تھی۔ خوف سے اس کے دل کی  
 دھڑکنیں رکنے لگیں اس نے خوف ناک انسان کو آکے بڑھتے دیکھا اور دوسرے لمحے وہ  
 اپنے بچاؤ کے لئے بستر سے اٹھ گئی۔ اسی وقت اس کا ہاتھ عامر کے دیئے ہوئے خنجر پر پڑا  
 اور اس نے خنجر اٹھالیا وہ خوف و دہشت کے عالم میں اپنے بچاؤ کی فکر کرنے لگی وہ خنجر  
 مضبوطی سے پکڑ کر اس خوف ناک انسان کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئی تب اس کی بھاری  
 آواز گونجی۔

”میں تو آپ کا خادم ہوں خانم مجھ سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شہزادہ  
 عامر نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو لے کر  
 ان کے پاس آؤں۔“

”عامر — مگر وہ خود کہاں چلے گئے؟“

”آپ کے استقبال کی تیاریوں کے لئے۔ ان کا خیال تھا کہ جس انداز سے میں آپ  
 کو لے جاؤں گا وہ آپ کو بہت پسند آئے گا۔“

”تم کس طرح مجھے لے جاؤ گے؟“ لیزرا نے دلچسپی سے پوچھا۔ وہ اپنا خوف بھول  
 گئی۔



ہی معصوم خاتون جنھیں مشرق کے اسرار اور یہاں کی روایتوں سے بے حد دلچسپی ہے۔  
 ”ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں مغرب کی حور؟“ معمر شخص نے کہا۔  
 ”مگر عامر — یہ سب کیا ہے کوئی سیارہ ہے؟“ لیزرا نے حیرت سے کہا۔  
 ”یہ ہماری سرزمین ہے لیزرا سیارہ نہیں ہے۔“ عامر نے جواب دیا۔  
 ”لیکن یہ کس جگہ واقع ہے اور — اور۔“ لیزرا حیرت سے دیوانی ہو رہی تھی۔  
 پھر وہ ان لڑکیوں کو دیکھ کر بولی۔

یہ لڑکیاں کون ہیں؟“

”یہ سب خادائیں ہیں جو تمہیں یہاں کی سیر کرائیں گی۔“

”ہائے عامر مجھے بتادو — خدا کے لئے بتادو کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟“

”خواب اتنے طویل نہیں ہوتے لیزرا تم عالم ہوش میں ہو —

”مگر میں نے ایسے انسان نہیں دیکھے جو خلا میں پرواز کرتے ہوں جن کے قد اتنے بڑھ جاتے ہوں۔ وہ شخص کہہ رہا تھا کہ تمہارا قد بھی اتنا ہی بڑھ سکتا ہے۔“

”تم اگر مشرق کی پراسرار داستانوں کی اس قدر دلدادہ نہ ہوتیں تو شاید یہ سب کچھ تمہارے سامنے نہ آتا لیزرا کیا تم سب کچھ دیکھ کر خوش نہیں ہو؟“

”بے پناہ خوش ہوں افوہ جب میں یورپ جاؤں گی تو اپنے بہن بھائیوں اور دوستوں کو یہ سب داستانیں سناؤں گی کس قدر خوش ہوں گے وہ سب اور میری قسمت پر کسی قدر رشک کریں گے۔“

”آؤ بیٹی۔ اندر جائیں ہم تم سے مل کر بہت خوش ہوئے عامر نے تمہارا مکمل تعارف کرا دیا ہے۔“ معمر خاتون نے کہا اور لیزرا کا ہاتھ پکڑ کر عمارت کی طرف بڑھ گئیں حسین لڑکیاں اور سب کے پیچھے چل رہی تھیں۔ پھر وہ عمارت میں داخل ہو گئے لیزرا پاگلوں کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اسے عمارت کے ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایسا فرنیچر پڑا تھا۔ جو لیزرا نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کا دماغی توازن خراب ہو رہا تھا۔ ہر چیز ایسی تھی جو عقل خطا کئے دے رہی تھی کافی دیر تک عامر کے والد اور والدہ اس سے گفتگو کرتے رہے پھر وہ سب اس سے اجازت لے کر چلے گئے عامر بھی

”ہم لوگ یہاں کے خاص باشندے ہیں اس سلسلہ میں شہزادہ عامر ہی آپ کو بتا سکتے ہیں۔“

”کیا عامر بھی تمہاری طرح پرواز کر سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے مجھے ہاتھوں میں لے کر؟“

”بہ آسانی.....؟“

”اوہ۔ تب تو میں ان سے کہوں گی کہ مجھے اس طرح سیر کرائیں۔ دن کی روشنی میں تو یہ سفر اور بھی دلکش لگتا ہوگا۔ لوگ کتنے ننھے ننھے سے نظر آتے ہوں گے لیزرا کے ذہن سے اب خوف کے بادل چھٹ چکے تھے۔ اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا آسمان پر اب روشنی پھیل چکی جا رہی تھی۔ بادلوں کے نم ٹکڑے ان کے جسم سے ٹکرا کر منتشر ہو رہے تھے اور بادلوں کے درمیان یہ پرواز لیزرا کو ایک حسین خواب معلوم ہو رہی تھی۔

”یا خدا — اگر یہ خواب ہے تو کبھی آنکھ نہ کھلنے پائے اور اگر آنکھ کھلے تو خواب حقیقت بن جائے۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور پھر دور سے اسے ایک سرسبز پہی نظر آئی جو رفتہ رفتہ واضح ہونے لگی وہ حیرانی سے اس سرسبز پہی کو دیکھ رہی تھی جس میں مزید رنگ شامل ہوتے جا رہے تھے اور پھر لیزرا کو گھاس کا ایک سرسبز میدان نظر آیا۔ اس طویل و عریض میدان میں جا بجا پھولوں کے گچ نظر آرہے تھے۔ میدان کے آخری سرے پر سنگ مرمر کی ایک حسین عمارت نظر آرہی تھی عمارت سے ایک سیاہ دوش گھاس کے میدان کے دوسرے سرے تک آئی تھی جس کے دونوں طرف سنگ مرمر کے حوض بنے ہوئے تھے۔ میدان کے عین درمیان پھولوں کی محراب بنی ہوئی تھی اور اس محراب کے قریب درجنوں حسین لڑکیاں کھڑی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ایک طرف ایک معمر خاتون اور ایک مرد موجود تھا۔ اور ان کے قریب ہی عامر فاخرانہ لباس میں کھڑا ہوا تھا۔

دیو قامت انسان لیزرا کو لے کر گھاس پر اتر گیا اور اس نے لیزرا کو معمر خاتون اور مرد کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اور لیزرا کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ کوئی جگہ ہے جو زمین سے اوپر بادلوں سے بھی اوپر ہے۔

”میرے والدین سے ملو لیزرا یہ میری والدہ ہیں اور یہ میرے والد اور یہ لیزرا ہے

چلا گیا اور لیزرا ان لڑکیوں کے جھرمٹ میں رہ گئی یہاں بھی لڑکیوں نے اسے نیا لباس پہنایا اور وہ کوئی شنزادی معلوم ہونے لگی۔ لیزرا اس ماحول میں بھی گھل مل گئی اور لڑکیوں سے گفتگو کرنے لگی۔ اور پھر لڑکیوں نے اسے پوری عمارت کی سیر کرائی۔

رات کو کھانے کی میز پر سب لوگ موجود تھے لیزرا کا چہرہ خوشی سے گلنار نظر آرہا تھا۔ کھانے کا اہتمام بھی زبردست تھا کھانے سے فارغ ہونے کے بعد رقص و سرود کی محفل جمی۔ شعلہ بدن رقاصائیں اپنے کمال پیش کرنے لگیں۔ بڑے پاکیزہ رقص تھے لیزرا کو وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ عامر اس کے قریب بیٹھا تھا اور اس کی محویت دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پھر نہ جانے کتنی رات گئے یہ محفل برخاست ہوئی اور پھر عامر نے لیزرا سے اجازت چاہی۔

”خادمائیں تمہیں تمہارے کمرے میں لے جائیں گی۔ آرام کرو۔ صبح ملاقات ہوگی۔“ اس نے لیزرا کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

”ہائے عامر کیسی پیاری زندگی ہے تمہاری کیسے خوش قسمت ہو تم۔ کاش میں بھی ایسی دنیا کی باسی ہوتی۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ میں زیادہ عرصہ تمہاری مہمان نہیں رہ سکتی۔“

”کیوں لیزرا تمہارا جب تک دل چاہے یہاں قیام کرو، تمہیں کیا فکر ہے؟“

”نہیں عامر۔ یہ دنیا بہر حال چھوٹی پڑے گی اور پھر میرے ڈیڈی میری وجہ سے پریشان ہوں گے۔“

”میں نے تم سے کہا ہے نالیزرا کہ تمہارے ڈیڈی بالکل پریشان نہ ہوں گے۔ تم ان کی فکر نہ کرو۔“

”پھر بھی عامر جانا ہے کل تمہارے والدین کی خدمت میں دن گزارنے کے بعد پرسوں میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ گو مجھے اس حسین ماحول سے اتنی جلدی جاتے ہوئے دکھ ہو گا۔ لیکن —“

”جیسی تمہاری مرضی“ عامر نے کہا اور خادمائیں لیزرا کو لے کر چل دیں۔

عامر کی حسین دنیا کا ایک ایک منظر لیزرا کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔ مشرق کی پر اسرار

کمانیاں اب اس کے لئے اس قدر پر اسرار نہ رہیں۔ وہ خود بھی ان کمانیوں کا ایک کمدار بن گئی تھی اس کے سادہ ذہن نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ درحقیقت مشرقی لوگ ایک انوکھی دنیا کے باسی ہیں۔ اس کے ڈیڈی بھی اس دنیا میں آکر کتنے خوش ہوں گے۔“

عامر کے والدین نے اسے الوداع کیا اور ایک خوبصورت بند گاڑی انہیں لے کر چل پڑی۔ گاڑی گھوڑے جتے ہوئے تھے لیکن اس کے باہر کی فضا نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔ عامر اس کے ساتھ موجود تھا اور پھر تھوڑی دیر کے سفر کے بعد گاڑی رک گئی۔ کوچوان نے دروازہ کھولا اور لیزرا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ گاڑی اسی عمارت میں رکی تھی جس میں انہوں نے پہلے قیام کیا تھا۔ جہاں سے انیورپورٹ تک عامر اسے ایک کار میں لایا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ انیورپورٹ پہنچ گئے۔

”تمہارا جہاز تیار ہے لیزرا خدا حافظ۔“ عامر نے اس کے ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ اور لیزرا کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

”پھر کبھی یورپ نہیں آؤ گے عامر۔ اگر یورپ آؤ تو مجھے نہ بھولنا۔ اور میں —“

تو زندگی کے ہر سانس میں تمہیں یاد کیا کروں گی۔“ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

”میری دوستی اتنی کمزوری نہیں ہے لیزرا، جب بھی خلوص دل سے پکارو گی میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“ عامر نے کہا اور پھر اس نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی اتار کر لیزرا کو دے دی اس انگوٹھی میں ایک حسین نگینہ جڑا ہوا تھا۔ اس کے عین درمیان میں عامر کی ایک منضی ہی تصویر مسکرا رہی تھی۔

”اسے پن لو جب بھی تم اسے خلوص سے چومو گی۔ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

”واقعی —“ لیزرا خاموش ہو گئی۔

”ہم لوگ جھوٹ نہیں بولتے عامر نے کہا اور لیزرا اس سے آخری بار ہاتھ ملا کر جہاز کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جہاز کی سیڑھیوں سے اوپر پہنچ گئی اور پھر اس نے عامر کی طرف رخ کر کے ہاتھ ہلایا۔ عامر نے بھی اسے الوداع کہا تھا لیزرا ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ اپنی سیٹ پر آ بیٹھی۔

میں انگوٹھی پڑی ہوئی تھی۔

”یہ درمیان میں عامر کی تصویر ہے۔“

”کیا مطلب؟“ مسٹر بارلنگ حیرت سے بولے۔

”میں اس انگوٹھی کی بات کر رہی ہوں ڈیڈی“ لیزرا نے انگوٹھی مسٹر بارلنگ کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”اوہو ڈیڈی یہ انگوٹھی یہ“ لیزرا نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ اور مسٹر بارلنگ منہ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ انہیں کوئی انگوٹھی نظر نہیں آئی تھی لیکن وہ خاموش ہو گئے لیزرا بھی حیران تھی چند منٹ بعد وہ پھر بولی۔

”میرے لیٹ ہو جانے کی اطلاع آپ کو کیسے ملی تھی؟“

”اوہو مگر تم لیٹ کہاں ہوئی ہو تمہاری ممی نے آج صبح ہی تو تار دیا تھا۔ تمہیں سوار کرنے کے بعد؟“

”آج — اب لیزرا کے حیران ہونے کی باری تھی۔“

”ہاں ہاں کیا خواب دیکھ رہی ہو۔ طیارہ ٹھیک وقت پر پہنچا ہے۔“

”ڈیڈی ڈیڈی آپ نہ جانے کیا کہہ رہے ہیں۔ شاید یہاں کی فضا نے آپ کے ذہن پر اثر ڈالا ہے۔“ لیزرا نے کہا۔

”اور میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہیں آرہیں۔“

”سات اور تین دس اور ایک گیارہ۔“ لیزرا نے حساب لگاتے ہوئے کہا۔ کیا میں

گیارہ دن لیٹ نہیں ہوں۔“

”گیارہ دن۔“ مسٹر بارلنگ نے حیرت سے لیزرا اور پھر مسٹر گریمین کو دیکھتے ہوئے

کہا۔

”یہ دیکھو سولہ اکتوبر ہے۔ آج ہی کا ٹکٹ ہے تمہارے پاس۔“

”سولہ اکتوبر ہے آج۔ آپ مذاق کر رہے ہیں ڈیڈی۔“ لیزرا کا دل دھڑکنے لگا اس

کا ذہن بھٹک رہا تھا کیا وہ سب کچھ درحقیقت خواب تھا لیکن پھر اس نے جلدی سے اپنی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی دیکھی جس میں عامر کی تصویر مسکرا رہی تھی اور یہ انگوٹھی اسے

اس کی آنکھوں میں عامر کی حسین صورت بسی ہوئی تھی اور دل سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد طیارے نے رن وے چھوڑ دیا اور فضا میں پرواز کرنے لگا۔

لیزرا کے برابر کی سیٹ خالی ہی تھی۔ اس نے آنکھوں کی کوروں سے آنسو خشک کئے اور جہاز کے دوسرے مسافروں کو دیکھنے لگی چند لمحات خالی الذہنی کے انداز میں انہیں دیکھتی رہی اور پھر چونک پڑی۔

یہ کیا یہ چہرے تو جانے پہچانے تھے یہ تو تقریباً وہی تمام مسافر تھے جو اس دن سفر میں ساتھ تھے۔ صرف ایک عامر نہیں تھا باقی لوگ وہی تھے کمال ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے وہ سوچتی اور حیران ہوتی رہی پھر اس نے ذہن جھٹک دیا اور اپنے ڈیڈی کے بارے میں سوچنے لگی کئیں ڈیڈی پریشان نہ ہو رہے ہوں لیکن عامر نے کہا تھا کہ میں فکر نہ کروں اس کے ڈیڈی کو اطلاع دے دی جائے گی لیکن کیا ڈیڈی ناراض نہ ہوں گے وہ سوچتی رہی۔ اور طیارے سے سفر جاری رہا۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ پھر ہوسٹس نے مسافروں سے۔ ییلٹس کس لینے کے لئے کہا طیارہ منزل پر پہنچ گیا تھا۔ پھر وہ رن وے پر اتر گیا اور مسافر ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ لیزرا ابھی سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی اس نے استقبال کرنے والوں کے ہجوم پر نگاہ دوڑائی سب سے آگے اس کے ڈیڈی مسٹر بارلنگ کھڑے خوشی سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ لیزرا مسکرا پڑی۔

مسٹر بارلنگ نے محبت سے اسے بھینچ لیا اور پھر وہ اپنے قریب کھڑے ہوئے براؤن ڈائریکٹر مسٹر گریمین سے اس کا تعارف کرانے لگے جن کی کرم فرمائی نے اسے یہاں تک آنے کا موقع دیا تھا۔ اور پھر وہ ایک خوب صورت کار میں بیٹھ کر چل پڑے۔

”کیا آپ کو اطلاع مل گئی تھی ڈیڈی۔ آپ پریشان تو نہیں ہوئے؟“

”ہاں — تمہاری ممی نے ٹیلی گرام دیا تھا کہ تم پہنچ رہی ہو مسٹر بارلنگ نے

جواب دیا۔

”عامر نے آپ کو ٹیلی گرام دیا تھا؟“

”کون عامر — مسٹر بارلنگ نے پوچھا۔

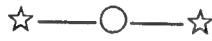
”آپ عامر کو نہیں جانتے۔ دیکھئے یہ ہے عامر۔“ لیزرا نے انگلی سامنے کردی جس

اس کی شکل دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے چشمہ صاف کر کے چاروں طرف دیکھا۔ انہیں دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے چلو طیارہ روانگی کے لئے تیار ہے۔“ انہوں نے اس کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ اور — اور لیزرا انہیں غصے سے گھورنے لگی۔ پھر اس نے معذرت آمیز نگاہوں سے عامر کو دیکھا اور بولی:

”معاف کرنا مجھے افسوس ہے اچھا خدا حافظ؟“ اس نے عامر سے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گئی۔ مسٹر بارنگ اسے متفکر نظروں سے گھور رہے تھے۔ اور لیزرا سوچ رہی تھی۔

”ڈیڈی سچ سچ کریک ہو گئے ہیں۔ انہوں نے عامر سے ہاتھ بھی نہیں ملایا۔ کیا سوچ رہا ہو گا وہ اپنے دل میں۔“



احساس دلا رہی تھی کہ وہ سب کچھ خواب نہیں تھا لیکن سولہ اکتوبر یہ کیا تک ہے قاعدے سے آج سولہ اکتوبر نہیں ستائیس اکتوبر ہونا چاہیے۔ شاید ڈیڈی ہی کریک ہو گئے ہیں اس نے سوچا اور خاموش ہو گئی۔

پورے ایک ماہ تک وہ اپنے ڈیڈی کے پاس رہی مسٹر گریمین بڑے نیک اور خوش اخلاق انسان تھے۔ انہوں نے اپنی کار اور شو فر لیزرا کو دے دیا تھا اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسٹر بارنگ کو بھی ایک ماہ کی رخصت دے دی تھی۔ اور مسٹر بارنگ نے اس ایک ماہ میں لیزرا کو بہت سی جگہوں کی سیر کرائی۔ لیکن لیزرا کو ان میں سے ایک جگہ بھی پسند نہ آئی۔

عامر نے اسے جو کچھ دکھا دیا تھا اس کے بعد کچھ اور اس کی نگاہ میں نہ کھپتا۔ اس کے ڈیڈی کو مایوسی ہوئی تھی اور اب تو عامر کے تذکرے پر وہ کچھ جھلا گئے تھے انہوں نے لیزرا سے کہا تھا کہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ وہ ہمیشہ سے مشرق کی پراسرار داستانوں کے خواب دیکھتی رہی ہے مصیبت یہ تھی کہ وہ لیزرا کی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو ٹٹول کر بھی دریافت نہ کر سکے تھے۔

اور لیزرا سوچنے لگی کہ ڈیڈی واقعی کریک ہو گئے ہیں پھر جس دن وہ اپنے وطن روانہ ہو رہی تھی تو اس کے ڈیڈی مسٹر گریمین اور دوسرے لوگ اسے چھوڑنے آئے تھے اور جب اس کے ڈیڈی نے اسے سینے سے لپٹا کر رخصت کیا تو اچانک اس کی نگاہ ایک طرف اٹھ گئی اور وہ خوشی سے اچھل پڑی اس کی نگاہ عامر پر پڑی جو ایک خوب صورت لمبوس میں کھڑا اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

او ڈیڈی ڈیڈی آئیے آپ کو عامر سے ملاؤں وہ مسرت سے چیخ پڑی۔ اور مسٹر بارنگ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی عامر کے پاس لے گئی۔

”اوہ عامر کیا تم رخصت کرنے آئے ہو؟“

”ہاں لیزرا مجھے علم ہوا کہ آج تم اپنے وطن واپس جا رہی ہو۔“ عامر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ان سے ملنے ڈیڈی یہ عامر ہیں۔“ لیزرا نے کہا اور مسٹر بارنگ بوکھلائے انداز میں

ڈالی پانچ ایک صفرو پانچ سات۔

”آہ، آہ اس کے دل سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ پانچ، سات، نہیں سات، پانچ چاہیے تھا۔ کیسی ستم ظریفی ہے سب کچھ وہی ہے صرف دو نمبروں کے الٹ پھرنے پھر تاریکیاں مسلط کر دی ہیں۔ اس نے اخبار تمہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ دل بجھ گیا تھا اور اس بار تو واقعی ایک دلچسپ مذاق ہوا تھا تمام نمبر وہی تھے۔ بس ایک نمبر آگے پیچھے ہو گیا تھا۔ ممکن ہے دوسرے چھوٹوں نمبروں میں اس کا نمبر نکل آئے لیکن یہاں اس سڑک پر کھڑے ہو کر تمام نمبر تو نہیں دیکھ جاسکتے۔ کوئی چائے خانہ مناسب رہے گا۔ ہاں چائے خانے میں جا کر پہلے نمبروں کو دیکھ لیا جائے اور اگر قسمت نے کچھ دے دیا ہے تو ممکن ہے ستینہ کی کوئی چھوٹی موٹی خواہش پوری ہو جائے۔

اس کے قدم ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کی طرف بڑھ گئے ہوٹل میں خاصی بھیڑ تھی۔ کونے کی ایک میز پر بیٹھ کر اس نے چائے کا آرڈر دیا اور پھر اخبار سامنے پھیلا کر نمبروں کی باریک فرسٹ پر نگاہ دوڑانے لگا۔

البن جوان العمر تھا۔ جوانی کی اس منزل پر جہاں دولت کے حصول کے لئے توہمات یا انعامی نمبروں کا نہیں صرف بازوؤں کا سہارا لیا جاتا ہے لیکن وہ زر پرست نہیں تھا اسے بے پناہ دولت حاصل کرنے کا جنون بھی نہیں تھا۔ اپنے حال میں مست رہنے والا نوجوان تھا۔ دفتر سے اتنی تنخواہ مل جاتی تھی کہ دونوں بہن بھائی مناسب زندگی بسر کر لیتے تھے۔ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ البان کی خواہش تھی کہ کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر ستینہ کی شادی کر دے اور اس کے بعد آزادی سے زندگی بسر کرے۔

لیکن اس کی چیمپی بہن، ستینہ اس کی نگاہیں بلند یوں پر پرواز کرتی تھیں۔ وہ سیرو سیاحت کی بے حد شوقین تھی۔ دیس دیس کی باتوں پر جان دیتی تھی اس نے درجنوں سیاحوں کے سفر نامے پڑھ ڈالے تھے۔ اس کے پاس ہر ملک کا تفصیلی نقشہ تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ ملک، ملک کی سیر کرے لیکن یہ خواہش صرف ایک حسرت تھی جس کے پورے ہونے کے امکانات کہاں سے لاسکتا تھا جو بہن کی خواہش پوری کر سکتا؟ کئی بار کوشش کی تھی لیکن ناکامی — ملکوں کی سیاحت کے لئے تو بہت بڑی رقم درکار تھی۔

## خوابوں کا مسافر

”اگیا انعامی ٹکٹ کی قرعہ اندازی کا نتیجہ۔ اپنے انعامی ٹکٹ کا نمبر تلاش کریں۔“

اگیا، اگیا۔“

اخبار فروش کی آواز اسے سنائی دی اور وہ چونک پڑا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا دل دھڑکا۔ اس کے پاس بھی ایک انعامی ٹکٹ تھا جس کا نمبر اس نے زبانی یاد کر لیا تھا۔ فائونڈر زیرو ٹو سیون فائونڈر۔ چشم تصور میں اس نے اخبار میں چھپی ہوئی انعامی فرسٹ میں ایک چھوٹے سے حاشیے کے اندر ایک بڑا بڑا نمبر دیکھا۔ فائونڈر زیرو ٹو سیون فائونڈر اور اس کے جسم میں ایک ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔ اسے اپنے چاروں طرف نوٹوں کے انبار نظر آنے لگے۔

”کیا بات ہے، البان، رک کیوں گئے؟“ اس کے ساتھی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا اور وہ چونک پڑا۔ پھر اس نے جھینپتے ہوئے لمبے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں، بس ایسے ہی کچھ سوچنے لگا تھا۔“ اور پھر وہ دفتر کی عمارت کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ چند لمحات کے بعد وہ سڑک پر تھا۔ اخبار والا اب بھی صدا لگا رہا تھا۔ اس کے قدم تیزی سے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ گئے، جہاں لوگ اخبارات کی سرخیاں دیکھ رہے تھے۔ اس نے سب سے چند سکے نکالے اور وہ اخبار خرید لیا جس میں انعامی ٹکٹوں کی فرسٹ چھپی ہوئی تھی۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اور خشک ہونٹوں کے ساتھ اس نے انعامی فرسٹ کے سب سے بڑے نمبر پر نگاہ ڈالی۔ فائونڈر زیرو۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ نو فائونڈر سیون، اس کی کھوپڑی ناچ گئی۔ ایک بار پھر اس نے نگاہ

مرحلتہ انسان کو افسوس تھا کہ وہ بہن کی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔

”یہ انعامی ٹکٹ بھی ایک دن اس نے بہن کے نام سے خرید لیا تھا اور دل ہی دل میں دعا لی تھی کہ کاش انعامی ٹکٹ پر پہلا انعام نکل آئے تاکہ وہ ستینہ کو نوٹوں کے انبار دے کر کہے کہ اب وہ دنیا کا جو ملک چاہے دیکھ سکتی ہے لیکن اخبار کی فرست میں تو اس کے ٹکٹ پر سب سے چھوٹے انعام کا نمبر بھی نہیں تھا۔ اس نے پوری فرست دیکھ کر ایک گہری سانس لی۔ بھرا چائے رکھ گیا تھا۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے بڑے درد کے ساتھ سوچا۔

وہ کیسا بد نصیب بھائی ہے، اپنی بہن کی خواہش پوری نہیں کر سکتا حالانکہ پوری دنیا میں اس بہن کے علاوہ اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے باپ کی طرح اسے پالا تھا آخر کیوں اتنی بے بسی کیوں ہے۔ کیا وہ اتنا ہی کند ذہن اور ناکارہ انسان ہے کہ اپنی بہن کے لئے کچھ نہیں کر سکتا؟ دنیا نے دولت کمانے کے لاکھوں طریقے ایجاد کئے ہیں، طرح طرح کے فراڈ ہوتے ہیں، انوکھے ڈرامے کئے جاتے ہیں۔ وہ سب کون لوگ ہیں؟ اسی دنیا کے باہمت انسان جو زندگی سکون سے گزارنے کے لئے بازیاں لگاتے ہیں اور پھر نتیجے کا انتظار کرتے ہیں۔ ریل یا جیل۔

اس نے اخبار بند کر دیا۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے نئے انداز سے سوچا۔

خود اسے زندگی گزارنے کے لئے دولت کی ضرورت نہیں وہ اپنی سادہ سے انداز میں بھی گزار سکتا ہے، بس ستینہ کی دنیا دیکھنے کی خواہش پوری کرنی ہے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے، صرف اس حد تک کہ ستینہ کی آرزو پوری ہو جائے انعامی ٹکٹ پر ٹکیہ چھوڑنا پڑے گا خود اپنی ذہنی کاوشوں سے کوئی پروگرام ترتیب دینا چاہیے۔ بے شک ایسا ہی کرنا ہو گا۔

وہ چائے کے گھونٹ لیتا رہا اور اس کے ذہن میں منصوبے بنتے اور بگڑتے رہے۔ اس نے اور چائے منگوائی اور خاموشی سے سگریٹ پھونکتے ہوئے سوچتا رہا اور پھر سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد اس نے خرید ا ہوا اخبار توڑ مروڑ کر ایک طرف ڈال دیا۔ میز پر

چائے کی رقم ڈالی اور اٹھ گیا۔ وہ اب اتنا پشیمردہ نہیں تھا۔ اس کے چہرے سے ایک دبے دبے جوش کا اظہار ہو رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر وہ بس اسٹاپ پر پہنچا اور پھر یہاں سے بس پکڑ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کے بس اسٹاپ پر اتر کر وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ ”ستینہ!“ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے آواز دی۔

”آئی بھائی جان!“ ستینہ کی مترنم آواز سنائی دی اور وہ اس کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی رنگین کتاب دبی ہوئی تھی۔

”کیا پڑھ رہی ہو؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور ستینہ نے کتاب اس کے سامنے کر دی۔

”چیکو سلواکیہ“ اس نے مسکراتے ہوئے نام پڑھا اور پھر کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔

”زندگی کی کوئی خواہش بغیر محنت کے پوری نہیں ہوتی ستینہ!“ اس نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا اور ستینہ اپنی حسین آنکھوں سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ کالی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے۔

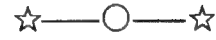
”انسان غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ وہ خود کو بے بسی کے شکنجے میں محسوس کر کے آہیں بھرنے لگتا ہے حالانکہ بے بسی نام کی کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ ہم اپنی خواہشات پوری کرنے کے بہترین مواقع رکھتے ہیں۔ بس اس کے لئے ہمیں تھوڑی سی جدوجہد کرنا ہوتی ہے اور میرا خیال ہے تم ایک باصلاحیت لڑکی ہو۔“

”میں نہیں سمجھی بھائی جان“ ستینہ نے حیرانگی سے کہا۔

”تب پھر آؤ میں تمہیں سمجھاؤں۔“ البان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھہریے میں چائے بنا لاؤں۔ پھر اطمینان سے سمجھوں گی۔“ ستینہ نے کہا اور البان نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی حالانکہ اس نے دو پیالیاں چائے کی پی تھیں لیکن وہ جانتا تھا کہ ستینہ نے اس کے انتظار میں چائے نہ پی ہوگی۔ ستینہ چائے بنانے لگی اور وہ لباس تبدیل کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اسے اپنی کامیابی کا پورا بھروسہ تھا جو پروگرام اس نے بنایا تھا دیر طلب ضرور تھا‘  
نہیں اگر ستینہ کامیابی سے اس پر عمل کرے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس کی آرزو پوری نہ  
ہو سکے باں اس کے لئے تلاش‘ جستجو اور صبر ضرور تھا۔ البان لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ  
روم میں آبیضا اور ستینہ کا انتظار کرنے لگا۔ کچن سے چائے کی سوندھی سوندھی خوشبو  
آ رہی تھی۔



فیروز برکت کی آج پھر باپ سے جھڑپ ہو گئی۔ وہ ایک آزاد خیال نوجوان تھا۔  
ٹھیک ہے اس نے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن کیا ضروری تھا کہ وطن واپس  
آئے ہی وہ کلینک کھول کر بیٹھ جائے۔ کیا ضرورت تھی اسے فوری طور پر دولت گھینے  
کی۔ وہ آزاد خیال تھا۔ آزادی سے زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ شادی اور بچوں جیسی چیزوں  
سے اسے وحشت ہوتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا کجوس باپ جو غلطی خود کر بیٹھا ہے اس  
میں اپنے بیٹے کو متید دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ فیروز کی کھوپڑی بھی درمیان سے بالوں  
سے خالی ہو جائے۔ اس کی ناک پر بھی موٹے فریم کی عینک چڑھ جائے اور دونوں باپ بیٹے  
بھائی بھائی نظر آنے لگیں۔

لیکن فیروز اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے  
وعدہ لے لیا تھا کہ تعلیم مکمل ہونے پر اسے دنیا کی سیر کی اجازت دی جائے۔ وہ عالم عجائبات  
عالم دیکھنا چاہتا تھا اور پھر جب دنیا کی سیر سے اس کا دل بھر جائے گا تو خود کو والدین کے  
حوالے کر دے گا۔ پھر وہ اس کی جوگت بنانا چاہیں بنائیں اسے اعتراض نہیں ہوگا اور اس  
کی ماں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا حالانکہ یہ وعدہ ڈاکٹر برکت کے سامنے ہی ہوا تھا۔ لیکن  
بڑے میاں کو ایسے وعدے کیوں یاد رہتے۔ وہ تو بیٹے کی واپسی کے فوراً بعد ہی کسی مناسب  
جگہ کی تلاش میں مصروف تھے جہاں ایک خوب صورت کلینک بنایا جائے اور جب فیروز کو  
یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے ماں کو وعدہ یاد دلایا۔

”جیسی تمہاری خوشی بیٹے۔ میں اپنا وعدہ پورا کرنے کو تیار ہوں۔“ ماں نے کہا تھا  
لیکن ڈاکٹر برکت نے اس کی مخالفت کی تھی۔

”نوجوانی کی یہ عمر ہی کچھ کرنے کی ہوتی ہے۔ اگر ابھی سے تم نے نام پیدا کر لیا تو  
پوری زندگی عیش کرو گے۔ سیر و سیاحت کے لئے تو ایک عمر بڑی ہے جب چاہو کر لینا۔  
میرے رائے ہے کہ فوری طور پر تم پر ٹیکس شروع کر دو تاکہ جم جاؤ۔“  
”کیا لغویت ہے امی۔ میں ڈیڈی کی بات نہیں مانوں گا۔“ اس نے چڑتے ہوئے کہا۔  
”یہ تو سدا کے پاگل ہیں۔ تم تیاری کرو۔“ مادام برکت نے کہا تھا اور درحقیقت وہ  
ڈاکٹر برکت کو پاگل کہہ سکتی تھیں اگر وہ پاگل نہ ہوتے تو بیگم برکت کو کیوں قبول کرتے  
جبکہ دونوں کی عمروں میں دس سال کا فرق تھا۔ مادام برکت، مسٹر برکت سے دس سال بڑی  
تھیں۔ لیکن دوسرے چارم تھے مثلاً وہ لکھ پتی تھی، کافی جائیداد تھی جبکہ مسٹر برکت ایک  
معمولی سے ڈاکٹر تھے بس انہوں نے مادام برکت کا علاج کیا تھا اور مادام کو وہ پسند آ گئے  
تھے۔ خود ڈاکٹر برکت نے انہیں پسند کیا تھا۔ کیونکہ مادام برکت کی دولت سے ان کے  
خواہوں کی تکمیل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ مادام برکت نے ڈاکٹر صاحب کی قسمت  
پلٹ دی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے ان پر کڑی نگاہ بھی رکھی اور مسٹر برکت کو ایک  
انچ ادھر ادھر نہ ہونے دیا۔

نتیجے میں اب مسٹر برکت کی چندیا صاف تھی۔ گو وہ ڈاکٹر اچھے خاصے تھے لیکن  
بہر حال آج تک بیگم کے محکوم تھے اور ہر معاملے میں مادام برکت کی ہی چلتی تھی۔  
چنانچہ فیروز کو کیا فکر ہو سکتی تھی۔ اس نے بین الاقوامی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ اس  
کے اپنے شوق تھے۔ گو اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اسے پراسرار علوم،  
قدیم تاریخ، آثار قدیمہ سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ خاص طور سے وہ مصر کی کہانیوں کا دلدادہ تھا۔  
اس نے مصر دیکھا تھا۔ ایک آدھ دن اس نے سیر کی تھی لیکن ایک آدھ دن بھی کوئی  
حقیقت رکھتا ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی وہ اس تاریخی ملک  
کے چپے چپے کی سیر کرے گا چنانچہ اب کے سفر کی تیاریاں تقریباً مکمل تھیں۔ اس نے  
ہزاروں روپے خرچ کر کے سلمان سفر تیار کیا تھا۔ درجنوں ٹائیاں اور ایسی ہی چیزیں خریدی  
تھیں، ملک ٹریولر چیک بنوائے تھے غرضیکہ بھرپور تیاریاں کر رہا تھا وہ۔ اس کی پہلی منزل  
مصر ہی تھا، جہاں کے ٹکٹ خرید کر آ چکے تھے۔

خواب رقصاں تھے۔

پراسرار مصر، قدیم تہذیب کا گوارہ، جہاں کی فضاؤں میں پراسرار خوشبوئیں رچی ہوئی ہیں جہاں جا کر انسان صدیوں کی تاریخ میں کھو جاتا ہے اور اگر زمین کے درہچے ذرا کھل جائیں تو فرعون کا جلال، کلویٹرا کا حسن، یوسف کے جلوے، موسیٰ کی لن ترانی کون کون سے مناظر سامنے آجاتے ہیں۔

مادام برکات اسے ایئرپورٹ تک چھوڑنے آئیں۔ انہوں نے اسے الوداع کہا اور پھر اس کا طیارہ اسے لے کر چل پڑا۔ طیارے کے فضا میں سیدھے ہونے کے بعد اس نے گہری سانسیں لیں۔ گھر کے ماحول کو ذہن سے فراموش کر دیا اور مصر کی فضاؤں میں کھو گیا۔ اس کا ہم سفر بھی ایک خاموش طبع انسان تھا اس لئے اسے خوابوں میں کھوئے رہنے کا پورا موقع مل گیا۔ ہوسٹس اُدھر سے اُدھر گردش کرتی رہیں۔ اس نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ تو خوابوں کی دنیا کا مسافر تھا۔ طیارہ کہاں کہاں رکا، اسے کچھ احساس نہیں تھا۔ ہوسٹس نے کافی پیش کی تو اس نے کھوئے کھوئے انداز میں مگ اٹھالیا۔ بس ایسی ہی کیفیت میں وقت گزارا تھا۔ مصر کے تصور کا سحر اس پر طاری تھا۔ یہاں تک کہ طویل مسافت طے کر کے طیارہ قاہرہ ایئرپورٹ پہنچ گیا تھا۔ مسافروں سے حفاظتی پٹیاں کسنے کی درخواست کی گئی تو وہ چونک پڑا۔ پائلٹ کیبن سے طیارے کے قاہرہ پہنچ جانے کی اطلاع نشر ہو رہی تھی۔

وہ چونک پڑا۔ خوابوں کی منزل آگئی تھی۔ طیارہ رن وے پر اتر گیا اور پھر کشم وغیرہ سے فراغت میں بھی زیادہ وقت صرف نہ ہوا۔ وہ ایئرپورٹ سے نکلتا تو مختلف ہوٹلوں کے نمائندوں نے اسے گھیر لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس سے کیا کہے؟ سب اسے اپنے اپنے پمفلٹ پیش کر رہے تھے تب اس نے اس جہوم سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا: ”معاف کیجئے گا حضرات مجھے کسی ہوٹل میں قیام نہیں کرنا۔ میرا اپنا ٹھکانہ موجود ہے۔“

”اوہ“ نمائندوں کی آوازیں ابھریں اور وہ منتشر ہو گئے تب اس نے اس شخص کو اشارہ کیا جو نمائندوں کے جہوم میں سب سے پیچھے تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی اس کے

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر برکات اس کے قریب پہنچ گئے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر حسب معمول ان کے ناک بھوں چڑھ گئے۔ وہ کمرے دونوں ہاتھ رکھ کر چاروں طرف دیکھتے رہے پھر بولے: ”تم ڈاکٹر ہو یا اداکار؟“

”میں نہیں سمجھا ڈیڈی؟“ اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم نے جو تیاریاں کی ہیں وہ کسی بلاوقار اور سنجیدہ انسان کی تو ہیں ہیں۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں ڈیڈی میں لمبے لمبے چنے پن کر جاؤں؟“

”میں کہتا ہوں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے صاحبزادے تمہاری ماں کو تمہارے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ مستقبل بنانے کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ دو نا تجربے کار انسان غلط فیصلے کر رہے ہیں۔ میں کیسے برداشت کر لوں“ میں تیاریاں مکمل طور پر کر چکا ہوں ڈیڈی۔ سفر سے واپسی کے بعد ہی اس بارے میں سوچ سکوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے یہ آمرانہ خیالات تمہیں ماں سے ہی ورثے میں ملے ہیں۔ میری کیا حقیقت ہے جو تمہیں اچھا برا سمجھانے کی کوشش کروں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اور پیر پختے ہوئے باہر نکل گئے۔“

فیروز کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے سوچا کہ جا کر ماں سے کہے کہ ڈاکٹر صاحب نے گڑبڑ کی ہے لیکن اب اس کی روادگی میں صرف ایک دن باقی رہ گیا اس لئے وہ کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ مادام برکات اگر یہ گفتگو سن لیتیں تو خاصا شور و غوغا مچاتیں اس لئے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

بہر حال رات خیریت سے گزر گئی۔ دوسرے دن اس نے صبح ہی سے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ڈاکٹر برکات کو معلوم تھا کہ وہ آج جا رہا ہے لیکن وہ اظہار ناراضگی کے طور پر آج علی الصبح ہی نکل گئے۔ انہوں نے گھر میں ناشتا نہیں کیا تھا لیکن ناشتے کی میز پر بھی اس نے ماں کو اس بارے میں نہیں بتایا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ خاموشی سے یہاں سے نکل جائے۔ ڈاکٹر صاحب کو تو واپسی پر بھی خوش کیا جاسکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مصر کے



ہوٹل کا پفلٹ تھا جسے اس نے اٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن دوسرے نمائندوں کی موجودگی میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

شاید اس نے بھی فیروز کے الفاظ سنے تھے اور دوسروں کی طرح وہ بھی مایوس ہو گیا تھا چنانچہ اس طرح بلانے پر وہ کسی قدر حیرت زدہ ہوا لیکن بہر حال وہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

”کونسا ہوٹل ہے تمہارا؟“

”صنوبر۔“

”کیسا ہے؟“

”نہایت اعلیٰ جناب — آپ کو وہاں ہر سہولت مہیا ہوگی۔“

”تب میری شکل کیا دیکھ رہے ہو سلمان اٹھو۔“

اس کی آنکھوں میں حیرت، پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے جلدی سے ایک طرف اشارہ کیا اور ایک لمبی کار اشارت ہو کر ایئر پورٹ کی سیڑھیوں کے نزدیک پہنچ گئی۔ اس پر ایک خوبصورت مونو گرام بنا ہوا تھا۔ باوردی ڈرائیور جلدی سے نیچے اترا۔ اس نے فیروز کا سوٹ کیس اٹھالیا۔ تب فیروز نمائندے کے ساتھ کار میں آبیٹھا اور کار چل پڑی۔

صنوبر در حقیقت انتہائی خوبصورت ہوٹل تھا۔ اس کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں لباس وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد کافی پیٹے ہوئے فیروز سوچنے لگا کہ اسے کسی گائڈ کو تلاش کرنا ہوگا۔ گائڈ کا انتظام بھی ہوٹل والے ہی کر سکتے ہیں لیکن پھر اس نے وقتی طور پر یہ پروگرام بھی ملتوی کر دیا۔ اتنی جلدی کی بھی کیا ضرورت ہے۔ پہلے مشہور مقامات تہائی دیکھے جائیں۔ گائڈ کی موجودگی میں خواہ مخواہ پابندی ہو جائے گی۔

وہ رات اس نے بڑی دلکش گزاری۔ اس کے ذہن میں اہرام سے چھو کر چلنے والی ہوائیں لہرا رہی تھیں۔ دوسرے دن کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ سو گیا اور پھر دوسری صبح ضروریات سے فارغ ہو کر وہ باہر نکل آیا۔ ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے چلنے کے لئے کہا۔ کوئی منزل نہیں تھی پہلے وہ یہاں کے گلی کوچوں کے نظارے کرنا چاہتا تھا۔ ایک

بارونق بازار میں اس نے ٹیکسی رکوائی اور بل ادا کر کے نیچے اتر گیا۔

بازار میں وہ کافی دیر تک گھومتا رہا۔ ایک بازار سے دوسرے میں۔ یہاں جدید قسم کے بازار بھی تھے اور پرانے طرز کے گلی کوچے بھی۔ بہر حال ہر جگہ ایک ندرت تھی، ایک انوکھا پن تھا۔ قدیم عمارتیں ان میں رہنے والے، بازاروں میں چلنے والے۔ ہر چیز سحر انگیز، ہر بات انوکھی۔

یا پھر یہ اس کا حسن نظر تھا۔ بہر صورت وہ ان تمام نظاروں سے بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شام تک وہ مصر کے گلی کوچوں کی سیر کرتا رہا۔ اس نے معمولی سے ہوٹلوں میں کھانا کھایا، قہوہ پیا، رات کو ایک قہوہ خانے میں رقص دیکھا۔ بڑی بڑی جگہیں تو تمام ملکوں میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اگر کسی ملک کی ثقافت دیکھنی ہے تو اس کے قدیم اور عرف عام میں گھنٹیا علاقوں میں دیکھی جائے وہاں اپنی ثقافت سے محبت کرنے والے ضرور نظر آجاتے ہیں۔

رات گئے وہ واپس ہوٹل آگیا۔ وہ بہت مسرور تھا اس کے دیرینہ خوابوں کی تکمیل ہو رہی تھی۔ آج اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اس کا انوکھا خواب تھا۔ ان گلیوں اور بازاروں کو دیکھ کر اس نے قدیم مصر کی یادوں کو تازہ کیا تھا۔ کافی دیر تک وہ یہاں کے خیالات میں گم رہا پھر دوسرے دن کے پروگرام بتاتے ہوئے سو گیا۔ دوسرے دن دوپہر تک ہوٹل میں رہا آج صرف دنیا کے عجائبات میں سے، ایک مجسمہ ابوالہول دیکھنے کا پروگرام تھا۔ دوپہر کے بعد اس نے ٹیکسی روکی اور ابوالہول دیکھنے چل پڑا۔ طویل فاصلہ طے کر کے ٹیکسی نے اسے ابوالہول کے زرد مجسمے کے سامنے اتار دیا۔ بے شمار لوگوں کا رش تھا۔ ان میں غیر ملکی سیاح بھی تھے اور مقامی لوگ بھی، سب اپنی اپنی دھن میں مست تھے۔ مقامی لوگ اس ناقابل عبور مجسمے کو سیکنڈوں میں عبور کر کے نیچے آجاتے اور لوگوں سے پیسے وصول کرتے۔ ان کی پھرتی اور مہارت دیکھنے کے قابل تھی۔

”معاف کیجئے۔“ دفعتاً اسے اپنی پشت پر ایک آواز سنائی دی۔ زبان انگریزی استعمال کی گئی تھی لیکن لہجہ مقامی تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، سانولے رنگ لیکن حسین خدوخال، کا مالک ایک نوجوان اس کے سامنے موجود تھا جسم پر پتلون اور بشرٹ پہنے ہوئے تھا اور

چہرے سے شریف نظر آتا تھا۔

”فرمائیے“ فیروز نے محبت سے کہا۔ اسے یہاں کے لوگوں سے بڑی انیت محسوس ہوئی تھی۔

”آپ سیاح ہیں؟“

”جی ہاں آپ کا وطن دیکھنے آیا ہوں؟“ فیروز نے جواب دیا۔

”غالباً“ آپ برصغیر کے کسی ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”آپ کا خیال درست ہے۔“

”مجھے آپ لوگوں سے بڑی محبت محسوس ہوتی ہے۔ آپ کچھ وقت مجھے دے سکیں گے۔“

”ضرور“ میں حاضر ہوں۔“

”تب آئیے سامنے ہوٹل میں کافی پیئیں گے۔ وہیں سے آپ ابو لہول کا نظارہ بھی کر سکیں گے۔“

”ضرور تشریف لائیے۔“ فیروز نے اس کی دعوت قبول کر لی اور پھر وہ اس کے ساتھ اس ہوٹل کی طرف چل پڑا جو شاید سیاحوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا سا ہوٹل تھا۔ دونوں ایک گوشے میں جا کر بیٹھے۔

”میرا نام الباقر ہے۔“

”مجھے فیروز کہتے ہیں۔“ فیروز نے اپنا تعارف کرایا۔

”خوب تو آپ میرے ہم مذہب بھی ہیں، دلی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔“ اس نے فیروز سے گرجوٹی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

”فیروز صاحب آپ میری زبردستی کی دوستی سے الجھے تو نہیں؟“

”نہیں میرے دوست بلکہ میری ایک خواہش پوری ہوئی ہے۔ میں نے کل رات کو سوچا تھا کہ کسی گائیڈ کو اس کیج کر دوں لیکن پیشہ ور گائیڈ سے وہ بے تکلفی نہیں ہو سکتی جو کسی دوست سے، تب میرے دل میں ایک خواہش ابھری تھی کہ کاش میں یہاں کے کسی باشندے کو اپنا دوست بنا سکوں۔ اس طرح مصر کے ماحول سے پوری طرح واقف ہونے کا

مزمہ آجائے گا۔“

”بڑی سچی خواہش تھی آپ کی۔“ خدا نے پوری کر دی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چنانچہ الباقر میرے دوست، مجھے تمہاری ملاقات سے بہت مسرت ہوئی ہے بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔“ فیروز نے کہا۔

”بس درمیانے طبقے کا انسان ہوں، چھوٹا سا ماحول ہے، بیوی بچے ہیں۔ بیوی آج کل والدین کے گھر گئی ہوئی ہے۔ میں تنہا بھٹک رہا ہوں۔“

”اوتب اور اچھی بات ہے ورنہ بیوی کی محبت اور ڈانٹ ڈپٹ دوستوں کی طلب پر بھاری ہوتی ہے۔ بیوی کی موجودگی میں انسان دوستوں پر توجہ نہیں دے سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے تمہاری پوری توجہ مل جائے گی۔“ فیروز نے کہا اور وہ ہنسنے لگا۔

تھوڑی دیر میں دونوں بے تکلف ہو گئے۔ فیروز نے اپنے بارے میں اسے بتایا کہ وہ کون ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ دنیا کی سیاحت کا پروگرام رکھتا ہے۔ فی الحال اس نے چند ممالک کا انتخاب کیا ہے۔ وہ پوری دلچسپی سے فیروز کی گفتگو سن رہا تھا۔

”خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنی خواہشات پوری کرنے پر قادر ہیں۔“

”شام کی رنگینیاں رات کے دھند لکوں میں چھپنے لگیں تو وہ دونوں اٹھ گئے اور پھر ٹیکسی اسٹینڈ تک آتے ہوئے فیروز نے کہا۔“

”تو پھر مصر کے عجائبات کی سیر کرانے میں تم میری کیا مدد کر سکتے ہو میرے دوست؟“

”روزانہ شام کو پانچ بجے میں تمہارے پاس پہنچ سکتا ہوں اس سے قبل تم اپنے طور پر گھوم پھر سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے منظور، تب آؤ رات کا کھانا میرے ساتھ میرے ہوٹل میں کھاؤ۔ ہم کھانے کے دوران کل کا پروگرام بنالیں گے۔“ فیروز نے کہا اور اس نے بلاچوں و چرا اس کی دعوت قبول کر لی۔

صنوبر کے ڈانگ ہال میں کھانا کھاتے ہوئے وہ دونوں عجائبات مصر کے بارے میں

بیٹھ کر چل پڑے۔ رات ہونے تک الباقر نے اسے کئی جگہیں دکھادیں۔ بلاشبہ وہ مصر کے بارے میں زبردست معلومات رکھتا تھا۔ فیروز کو بہت لطف آ رہا تھا۔ پیشہ ور گائیڈ کے ساتھ یہ لطف کہاں آسکتا تھا۔ الباقر سے بے تکلف دوستوں کی طرح گفتگو ہوتی، مصری حسیناؤں سے نظربازی کی جاتی اور الباقر پوری طرح اس کی گفتگو اور ان مشغلوں میں دلچسپی لیتا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ زیادہ باحیثیت انسان نہیں ہے اس لئے اخراجات میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا۔ البتہ جہاں وہ کوشش کرے وہاں اسے روک کر احساس کمتری میں مبتلا نہ کیا جائے۔

بہر حال فیروز اس پر خلوص نوجوان سے بے حد خوش تھا۔ روزانہ پانچ بجے وہ الباقر کا انتظار کرتا۔ ایک دن بھی وہ ایک منٹ کی تاخیر سے نہیں پہنچا تھا ہمیشہ صبح وقت پر پہنچتا اور اس ایک ہفتہ میں اس نے فیروز کو قاہرہ کے بے شمار عجائبات سے واقف کرا دیا تھا اور پھر وہ ہفتے کی شام کو آیا۔ اس شام کو وہ بے حد مسرور تھا۔

”آج رات کو میں تمہارے ساتھ ہی قیام کروں گا تاکہ کل کے پروگرام جلدی شروع کئے جاسکیں۔“ اس نے کہا۔

”اوہ، ویری گڈ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ فیروز نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”کل کا پروگرام یاد ہے نا؟“

”تم یاد کی بات کر رہے ہو میں نے اتوار کے انتظار میں ایک ایک دن گن گن کر کاٹا ہے۔“

”خوب“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ان خوشخبریوں کے ساتھ ایک بری خبر بھی سنو۔“

”بری خبر — وہ کیا؟“

”پیر کے روز میں اپنی بیوی کو لانے جا رہا ہوں۔ اس کا ٹیلی گرام آیا ہے۔“

”واپسی کب تک ہوگی؟“

”سسرال کا معاملہ ہے یار۔ ویسے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر جا رہا ہوں اور کوشش کروں گا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر واپس آ جاؤں۔“

گفتگو کرتے رہے۔ اہرام مصر کا ذکر ہوا، فرعون کے مقبروں کی بات ہوئی۔ پھر الباقر کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ اس کے چہرے پر عجیب تاثرات پھیل گئے۔

”تم پورے مصر کی سیر کر لو فیروز اس کے بعد میں تمہیں اپنی پسند کی ایک جگہ لے چلوں گا ممکن ہے تم مجھ سے زیادہ باہمت ہو۔ ویسے میرا خیال ہے وہ جگہ عام سیاحوں کی نگاہوں سے روپوش ہے۔ درحقیقت وہ سو فیصدی میری دریافت ہے ورنہ اس کے بارے میں کوئی تذکرہ ضرور سننے کو ملتا۔“

”کوئی جگہ وہ ہے؟“ فیروز نے پوچھا۔

”ساحل نیل کے دوسری طرف لوگ کشتیوں کے ذریعے وہاں بھی جاتے ہیں لیکن شاید ابھی تک کسی سیاح کی نگاہ وہاں نہیں پہنچ سکی۔ میں آوارہ گرد ہوں۔ مجھے پراسرار جگہوں کی تلاش کا بہت شوق ہے۔ میں نے وہ جگہ دیکھی، لیکن نہ جانے کیوں میں اس قدیم مصری تحریر کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتا سکا آج اچانک مجھے سب کچھ یاد آیا ہے، بالکل اچانک۔“

”مجھے ضرور دکھانا وہ جگہ بلکہ ابتدا وہاں سے ہی کیوں نہ کریں۔“

”نہیں میرے دوست آج پیر ہے۔ ہفتے تک میں تمہیں پورے قاہرہ کی سیر کراؤں گا“ قرب وجوار کے علاقے دکھا دوں گا۔ اتوار کا دن وہاں کے لئے رکھیں گے تاکہ وقت کی کمی کا احساس نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے“ فیروز نے جواب دیا بہر حال اس کے ذہن میں کوئی خاص جذبہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ پورا مصر ہی پراسرار باتوں کا مسکن تھا۔ کسی ایک جگہ کے بارے حیرت بے سود تھی۔ الباقر، فیروز سے رخصت ہو گیا اور فیروز الباقر کی پراسرار شخصیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ وادی نیل کا پراسرار بیٹا لیکن بہر حال وہ معصوم تھا۔ فیروز کو اس کے کسی انداز میں ہلکا پن نظر نہیں آ رہا تھا۔

”دوسرے دن فیروز اپنے طور پر تفریحات کرتا رہا لیکن پانچ بجے صوبہ میں وہ الباقر کا منتظر تھا۔ وعدے کا پکا نوجوان۔ ایک منٹ کی دیر کئے بغیر پہنچ گیا۔ اس نے فیروز کے ساتھ چائے بھی نہیں پی اور وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ الباقر نے ٹیکسی روکی اور دونوں اس میں

تک دلکشی نہ کھو سکے تھے۔ ان کی جاؤبیت باقی تھی اور یہ جاؤبیت ذہنوں میں آگ لگا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔ الباقراں کو کسی خاص علاقے کی طرف لے جا رہا تھا۔ پھر وہ لوگوں کے ہجوم سے بہت دور ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بے شمار بادبانی کشتیاں کھڑی تھیں۔ یہ کشتیاں کرائے پر ملتی تھیں بہت سے لوگ انہیں لے کر نیل کے پانی کی سیر کر رہے تھے۔ الباقراں بھی ایک کشتی کوچ کی اور پھر وہ فیروز کے ساتھ کشتی میں پہنچ گیا۔

”کیا تم کشتی چلا لیتے ہو الباقرا؟“

”یہ تو بہت آسان کام ہے میرے دوست اگر ہم کشتی چلانے والے کو ساتھ لیں گے تو کیا لطف آئے گا۔“ الباقرا نے کہا۔

اور فیروز نے گردن ہلا دی۔ کشتی نیل کی لہروں پر پھسلنے لگی۔ درحقیقت فیروز کو بہت لطف آ رہا تھا۔ بادبان ہواؤں کے زور سے چل رہے تھے، چوہ صرف کشتی کو موڑنے کے کام آ رہے تھے ورنہ اور کوئی محنت نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔

بادلوں کا ایک غول موسم کو حسن بخشنے آگیا اور الباقرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہ بادل ہمارے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ یہ ہوا کشتی کو آگے بڑھانے میں مدد دے رہی تھی۔ الباقرا کشتی کے مستول پر چڑھ گیا۔ وہ ہاتھ سے ان پرندوں کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا جو کشتی پر منزلدار ہے تھے۔ فیروز دلچسپی سے اس کا یہ مشغلہ دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر پسندیدگی کی مسکراہٹ تھی۔ درحقیقت کشتی کا یہ سفر بہت حسین تھا۔

لیکن بہت جلد اس نے محسوس کر لیا کہ کشتی ان عام لوگوں سے دور ہٹ آئی ہے جو ایک مخصوص حصے میں کشتی کی سیر کر رہے تھے۔ فیروز کو یاد تھا کہ الباقرا نے کہا تھا کہ وہ اسے ایسی جگہ لے چلے گا جہاں سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہیں۔ بہر حال وہ انتظار کرتا رہا۔ الباقرا مستول سے نیچے اتر آیا۔ اب دوسرا کنارہ زیادہ دور نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کنارے پر پہنچ گیا۔ الباقرا خشکی پر کود گیا اور پھر اس نے فیروز کی مدد سے کشتی خشکی پر کھینچ لی اور ایک کھونا زمین میں گاڑ کر اس نے کشتی کو کھونٹے

”یہ تو واقعی بری خبر ہے۔“ فیروز نے ہونٹ سکڑ کر کہا۔

”بہر حال فی الوقت اس کے بارے میں غور نہیں کریں گے مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے یہ خبر تمہیں وقت سے پہلے سنا دی۔ خود میں بھی اس سے خوش نہیں ہوں۔ لیکن بھائی بیوی کے چکر میں انسان گھن چکر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ چھوڑو ان باتوں کو چلو چلیں آج رات کو ہم کلب چلیں گے۔ ہفتے کی رات بہت حسین ہوتی ہے۔“

درحقیقت ہفتے کی رات بے حد حسین تھی۔ الباقرا نے آج کے اخراجات مکمل طور سے اپنے ذمہ لئے تھے۔ کیونکہ بقول اس کے اسے تنخواہ ملی تھی۔ فیروز نے اسے لاکھ روکا لیکن الباقرا نہیں مانا بہر حال انہوں نے رات کو تین بجے تک ایک کلب میں پروگرام دیکھا اور وہ مصر کی حسین ترین رات تھی۔ فیروز کے ذہن پر نشہ ساطاری ہو گیا تھا۔ اس نے دوسرے ملکوں میں ٹائٹ کلب بھی دیکھے تھے لیکن یہاں کی بات اور تھی۔ مصری رقاصاؤں نے جو کمال فن پیش کیا تھا اس کی مثال مشکل تھی۔

تین بجے وہ ہوٹل واپس آئے اور ساڑھے چار بجے تک مصری رقاصاؤں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر دوسرے دن گیارہ بجے ہی آنکھ کھل سکی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتا طلب کیا گیا اور الباقرا نے بیرے کو کچھ خصوصی آرڈر دیئے۔ اس نے بھنے ہوئے تیز اور سلاٹس پیک کرائے تھے۔ اس کے علاوہ کافی بھی تھراپس میں بھرنے کا آرڈر دیا تھا۔

جلدی جلدی دونوں غسل سے فارغ ہوئے، ڈٹ کر ناشتہ کیا اور پھر تیار ہو کر نیچے اتر آئے۔ الباقرا نے ٹیکسی روکی اور پھر ٹیکسی ساحل نیل کی طرف چل پڑی۔

اس سے قبل بھی ساحل نیل کی سیر کی جا چکی تھی لیکن آج کے پروگرام میں خصوصیت تھی۔ اہل مصر چھٹی ہونے کی وجہ سے نکل آئے تھے اور ساحل پر دور تک پھیلے ہوئے تھے ان میں عورتیں بھی تھیں، مرد بھی، بچے، بوڑھے سب تھے۔ کشتیوں کی سیر ہو رہی تھی۔ دونوں ساحل نیل پر اتر پڑے۔ یہ نظارے فیروز کے لئے عام تھے۔ لیکن مشرق و مغرب کا فرق نمایاں تھا۔ مغربی عورتیں ننگے بدن میں بھدی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں جاؤبیت نام کو نہیں ہوتی لیکن مشرق کے پوشیدہ جسم بے حجاب ہونے کے باوجود ابھی

فیروز کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر آگے بڑھ گیا۔

”کیا بات ہے الباقر تم کچھ سنجیدہ ہو گئے ہو؟“

”میری کسی بات کا مذاق مت اڑاؤ فیروز۔ میں استدعا کرتا ہوں۔“ الباقر نے غم زدہ

آواز میں کہا۔

”کیا ہو گیا ایک دم تمہیں؟“

”تابوت اور عبارت کی کیا بات کر رہے تھے؟“

”ابتداء تو تم نے کی تھی۔“

”شاید بے خیالی میں کچھ کہہ گیا ہوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”کیا کہا تھا میں نے؟“ اور

فیروز نے اس کے الفاظ دہرا دیئے۔ الباقر کے چہرے پر حیرت کے نقوش ابھر آئے۔

”یقین کرو میرے دوست میں نے یہ الفاظ ہوش حواس کے عالم میں نہیں کہے،

بہر حال ایک ایک لفظ درست ہے۔“

”میں تسلیم کرتا ہوں لیکن تمہاری کیفیت؟“

”میری کیفیت بھول جاؤ۔“ خود کو تیار کرو ہم اس جگہ پہنچ چکے ہیں“ الباقر نے کہا

اور پھر وہ ایک پہاڑی کٹاؤ کے پاس رک گیا۔ یہ جگہ ٹکون تھی بالکل اہراموں کی طرح

لیکن اس کا دروازہ پہاڑی کے دوسری طرف تھا دروازہ بھی ایسی جگہ تھا کہ عام نگاہوں سے

پوشیدہ رہے۔ الباقر نے وہ پتھر ہٹایا جو بہت پتلا تھا لیکن جس کے عقب میں ایک چوڑا

سوراخ موجود تھا۔ اتنا بڑا سوراخ جس سے ایک آدمی آسانی سے گزر سکتا تھا۔

”آؤ“ الباقر نے کہا اور فیروز اس کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ اندر سے اس جگہ کی

کشادگی دیکھ کر فیروز کو حیرت ہوئی تھی۔ بڑا وسیع غار تھا جس میں ایک سرنگ دور تک چلی

گئی تھی۔ غار کے اوپری حصوں میں سوراخ تھے جن سے روشنی اندر چھن رہی تھی۔

”یہ دروازہ صرف میری دریافت ہے اور میں نے ابھی تک اس کے بارے میں کسی

کو نہیں بتایا۔“

”یہاں یہ بو کیسی پھیلی ہوئی ہے؟“ فیروز نے پوچھا۔

”دیکھتے چلو“ الباقر پر اسرار انداز میں بولا۔ سرنگ کا اختتام ایک اور کشادہ غار میں

سے باندھ دیا اور اس کے بعد فیروز کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل پڑا۔ فیروز دور تک بکھری

پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو بادلوں کی چھاؤں میں بہت پر اسرار لگ رہی تھیں۔ ان پہاڑیوں

میں کہیں کہیں انسانی ہاتھوں کی تراش بھی نظر آ جاتی تھی۔

”دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ تب راستے میں الباقر نے کہا۔

”تمہارا تعلق اس ملک سے نہیں ہے۔ ممکن ہے تمہیں مصریات سے دلچسپی رہی

ہو، ممکن ہے تم نے یہاں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہو لیکن مجھ ایسے بے حقیقت

انسان کا خیال ہے کہ مصر کے بارے میں صد ہا سال کی تحقیق بھی اس کی پوری تصویر واضح

نہیں کر سکتی ہے۔ یہاں اب بھی بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔

فرعونوں کے راز اور ہم مصری انہیں صرف توہمات نہیں سمجھتے کیونکہ ہمیں ان

کے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے میرے دوست کہ وہ عبارت پڑھنے کے باوجود

میں تابوت کو کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا۔“

”کون سے تابوت، کونسی عبارت کی بات کر رہے ہو الباقر؟“ فیروز نے پوچھا اور

الباقر اس کی آواز سن کر چونک پڑا۔ فیروز نے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے۔

الباقر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

اس کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی وہ نہ سمجھنے والی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہو گیا الباقر؟“ فیروز نے حیرت سے کہا۔

”اوہ میں تمہاری بات سن نہیں سکا۔“ الباقر نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

”کونسی عبارت اور کون سے تابوت کی بات کر رہے ہو؟“

”عبارت — تابوت — تمہیں اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ الباقر

چلتے چلتے رک گیا۔ فیروز بھی حیرت زدہ سا کھڑا ہو گیا۔ الباقر ایک سنجیدہ نوجوان تھا کسی بے

تکے مذاق کی اس سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن اپنے ہی کلمے ہوئے جملوں سے

اجنبیت کا اظہار فیروز کے لئے حیرت انگیز تھا۔

”خوب، خوب گویا تم بھی عجائبات مصر میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔“

فیروز نے ہنستے ہوئے کہا لیکن الباقر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چند سکینڈ

”سنو“ الباقر نے کہا اور فیروز متوجہ ہو گیا۔

”سنو اے میرے وطن کے لوگو! یہ ورثہ ہے، رب آطوس کی منظور نظر۔ لیکن اس نے ٹھکرایا رب آطوس کو اور سزا پائی حیات میں موت کی، تو ژا رب آطوس نے اس کا غور۔ بند کیا اسے مردوں کی حیثیت سے۔ تو تم دور آطوس میں اسے نہ کھولنا۔ ورنہ سزا پاؤ گے۔ یہی ہدایت ہے اور اس پر عمل کرنے سے زندگی ہے۔“

الباقر خاموش ہو گیا۔ لیکن فیروز کی دلچسپی انتہائی حدود میں پہنچ گئی تھی۔ وہ خاموشی سے الباقر کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر کئی منٹ کے بعد اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”یہ تذکرہ شاید کسی لڑکی کا ہے۔“

”ہاں“ الباقر نے جواب دیا۔

”مجھے حیرت ہے الباقر تم اس تابوت کو کھولنے سے کیوں باز رہا؟“

”میں تمہیں بتا چکا ہوں فیروز، ہم مصری باشندے گو مسلمان ہیں۔ توہمات ترک کر چکے ہیں لیکن چند تجربات ایسے ہوئے جن کی وجہ سے ابھی تک ہمارے ذہنوں میں خوف باقی ہے۔“ الباقر نے کہا۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن رب آطوس کا دور تو کبھی کا گزر چکا ہے اور اس تابوت کو اس دور میں نہ کھولنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

”بالکل درست ہے لیکن اس کے باوجود میرا دعویٰ ہے کہ کوئی مصری اسے کھولنے کی جرات نہ کر سکے گا۔“

”اور جو مصری نہ ہو۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ الباقر نے حیرت سے فیروز کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر اجازت دو تو؟“ فیروز ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”نہیں پلیز، نہیں فیروز، مجھے اس بات کا خطرہ ہے۔“

”تم یوں کیوں نہیں سمجھتے الباقر کہ ممکن ہے کوئی اور یہاں آکر اس تابوت کو کھول

چکا ہو اور اب اس میں کچھ باقی نہ ہو۔“

”نہیں فیروز نہیں میرے دوست ایسا نہ کرو۔“ الباقر نے عاجزی سے کہا۔

ہوا تھا۔ اس کے بعد کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن یہ غار بھی روشن تھا۔ یہاں بے شمار سنگی مجسمے رکھے ہوئے تھے جو مصر کی قدیم تہذیب کے آئینہ دار تھے اور ان کے مجسموں کے درمیان ایک مجسمہ موجود تھا۔ قدیم فرعونی مجسموں سے ملتا جلتا اور اس مجسمے کے پہلو میں ایک تابوت موجود تھا۔ صندلی تابوت جس کے سرہانے لوہان سلگ رہا تھا۔

غار میں پھیلی ہوئی بویس سے جا رہی تھی۔ الباقر سے ملاقاتوں کے دوران اس نے بہت سے اہرام دیکھے تھے۔ ان کی کیفیت بھی بے حد پراسرار تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں وہاں آکر اسے بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ سحر زدہ انداز میں اس پورے ماحول کو دیکھتا رہا اور الباقر اس کا ہاتھ پکڑ کر کچھ اور آگے بڑھ گیا۔

تب فیروز کو تابوت کے اوپری حصے پر چڑے پر لکھی ہوئی ایک تحریر نظر آئی جو قدیم مصری زبان میں تھی۔ وہ جھک کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں نے یہاں تقریباً سبھی اہرام دیکھے ہیں۔ بہت سوں کا جائے وقوع اس سے بھی پراسرار ہے لیکن یہ تحریر — یہ تحریر اس اہرام کو سب سے جدا کر دیتی ہے۔ میرا دعویٰ ہے اگر کوئی اور یہاں پہنچتا تو پھر یہ تحریر موجود نہ ہوتی اور اس تابوت کا ڈھکنا کھلا ہوتا۔“ الباقر کی آواز ابھری۔

”بد قسمتی سے میں اس تحریر سے ناواقف ہوں۔ کیا تم اسے پڑھ سکتے ہو الباقر۔“

فیروز نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ہاں اسے پڑھنے کے بعد مجھے اس کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔“

”تب مجھے بتاؤ میرے دوست اس میں کیا لکھا ہے؟“

”ایک وعدہ کرنا ہو گا۔؟“

”کیا؟“

”تم اس تابوت کو کھولو گے نہیں۔“

”کیوں — کیا اس میں کوئی ایسی چیز ہے میرا مطلب ہے۔“

”ہاں تحریر کے مطابق اگر درست ہے تو۔“

”مجھے بتاؤ تو سہی۔ آخر کیا لکھا ہے اس میں؟“

”الباقر“ الباقر تم کیسے تعلیم یافتہ انسان ہو۔ دور فرعون سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم مسلمان ہو اور پھر یہ توہمات۔“

”میرے سامنے یہ ممکن نہیں ہے فیروز۔ اگر تم اتنے ہی بضد ہو تو میں باہر چلا جاتا ہوں تم اسے کھول لو۔ تم اسے کھول لو۔“ الباقر نے سسے ہوئے لمبے میں کہا اور پھر وہ سرنگ میں دوڑتا ہی چلا گیا۔ فیروز نے متحیرانہ انداز میں اس عجیب نوجوان کو دیکھا۔ ایک لمبے کے لئے اس نے سوچا کہ کیا واقعی اس تابوت کو کھولنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لیکن اب تو وہ کوشش کے باوجود خود کو نہ روک سکتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مصری دیوتاؤں کی منظور نظر کیسی ہے۔ وہ کون ہے جس نے رب آطوس کو ٹھکرا دیا اور پھر یہ فیروز کی خوش قسمتی تھی اسے ایک ایسے تابوت کو کھولنے کا موقع مل رہا تھا جسے اب تک کسی نے نہ کھولا تھا اس نے تمام خدشات نظر انداز کر دیئے۔ دوسرے لمبے وہ تابوت پر جھک گیا۔ اس نے تابوت کے ڈھکن کو ٹٹولا، کوئی تالا وغیرہ نہیں تھا۔ تابوت بھی بوسیدہ نہیں تھا بالکل نیا معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ نہ جانے یہ کتنا قدیم ہوگا۔ فیروز نے دھڑکتے دل سے تابوت کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اندر سے خوشبوؤں کا ایک طوفان امنڈ پڑا، بڑی حسین خوشبوئیں تھیں جنہوں نے ذہن و دل معطر کر دیا۔ تب اس کی نگاہ تابوت میں لیٹی ہوئی ہستی پر پڑی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ حسن و خوبصورتی کا بے مثال پیکر تھی۔ سرخ و سفید رنگ، لمبے لمبے بال جو خاص انداز سے گندھے ہوئے تھے، جسم پر قدیم مصری لباس تھا۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین تھی۔ وہ کئی منٹ تک نظریں ہٹائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ اس کے اوپر ایک عجیب سا سحر طاری تھا۔ وہ اس قدیم دور کے بارے میں سوچ رہا تھا جب یہ چلتی پھرتی ہوگی۔ نہ جانے کتنوں کے سر اس کے سامنے جھکے ہوں گے۔ آج یہ خاموش ہے۔

ابھی وہ اسی قدر سوچ رہا تھا کہ اچانک باہر سے الباقر کی دھاڑ سنائی دی وہ خوف زدہ انداز میں چیخا تھا جیسے کسی نے اس کے خنجر مار دیا ہو۔

فیروز اچھل پڑا اور سب کچھ بھول کر اس نے سرنگ میں چھلانگ لگادی۔ بے تحاشہ دوڑتا ہوا سرنگ کی دوسری طرف آیا۔ اس کا دل لرز رہا تھا۔ نہ جانے دوسری طرف الباقر

کی کیا کیفیت ہو۔ تب اس نے دیکھا الباقر سہما ہوا سا ایک دیوار سے چٹنا ہوا تھا اس کے چہرے پر گہرے خوف کے آثار تھے۔

”الباقر — الباقر کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟“ فیروز اس کے قریب پہنچ گیا۔

”وہ — وہ کون تھی۔ مجھے بتاؤ وہ کون تھی؟“ الباقر نے سسے ہوئے لمبے میں کہا۔

”کہاں کس کی بات کر رہے ہو؟“ فیروز نے حیرانی سے کہا۔

”ابھی اس سرنگ سے آئی تھی۔ پرانے طرز کے لباس میں چند ساعت رکی اور پھر مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔“

”کیا بے وقوفی ہے۔ دوسری طرف تو میں تھا۔ ادھر سے کوئی نہیں آیا۔“

”میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے باہوش و حواس دیکھا ہے۔ یقین کرو میں

جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”مگر میں اسے تمہارا وہم کہوں گا۔ آؤ میرے ساتھ میں نے تابوت کھول دیا ہے

دیکھو تو سہی اس میں کیا ہے۔“

”فیروز میرے دوست کیا تم مجھے معاف نہیں رکھ سکتے میں — میں!“

”الباقر“ الباقر کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ آؤ تو سہی دیکھو فراعنہ کے دور کی حسینہ کو

دیکھو۔“ ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے اسے دیکھ کر، آؤ تو سہی۔“

اور بمشکل تمام الباقر، فیروز کے ساتھ واپس سرنگ میں آگیا۔ وہ سسے ہوئے قدموں

سے چلتا ہوا تابوت کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے تابوت میں جھانکا اور پھر فیروز کی طرف دیکھنے

لگا۔ فیروز نے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھے اور وہ خود بھی تابوت پر جھک گیا۔

لیکن دوسرے لمبے اس کے جسم کو بھی جھٹکا لگا تھا۔

”کیا مطلب یہ کیا قصہ ہے؟“ اس کے منہ سے بوکھلائی ہوئی آواز نکلی۔

”کیوں کیا تھا اس میں؟“

”ایک پیکر حسن و دلکشی، ایک معصوم سی شکل جو قدیم مصری لباس میں تھی۔ اس

کے بدن سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔“

”وہی تھی — بالکل وہی تھی۔“ الباقر نے بتایا۔

”کون —“

”جو اس غار سے نکلی تھی۔“

”لیکن جب جھٹے تھے تم اس وقت تو وہ اسی تابوت میں تھی۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ نکل چلو فیروز خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو۔“ الباقر نے کہا لیکن فیروز کے چہرے پر سخت الجھن کے آثار تھے۔ اب اسے بھی اس پر اسرار ماحول کا احساس ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر اس نے تابوت میں جھانکا اور ایک چوکور چڑے کے نکلنے کو جھک کر اٹھا لیا اس پر بھی قدیم مصری تحریر تھی۔

”دیکھو اس میں کیا لکھا ہے الباقر۔“ اس نے تحریر کھول کر اس کے سامنے کر دی۔

”میرے محسن، میرے دوست، میرے نجات دہندہ! آہ صدیوں کے بعد تم نے تابوت کھول کر مجھے آزادی دی ہے، کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ کاش تم مجھ زندہ درگور کی حقیقت جانتے لیکن میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں گی، میں مردہ نہیں ہوں۔ میں زندہ وجود ہوں جسے سحر کی سزا دی گئی تھی لیکن بالآخر یہ سحر ایک دن ٹوٹا تھا۔

تم میرے سحر شکن ہو۔ میں تمہارے پاس آؤں گی۔ میں تم سے ضرور ملاقات کروں گی لیکن وقت کا لبادہ اوڑھ کر۔ اس جدید ماحول سے واقف ہو کر جو آج کے دور میں ہے تب خلوص دل سے تمہارا شکریہ ادا کروں گی۔“ ”در شاہ۔“

الباقر نے تحریر پڑھ کر گہرائے ہوئے انہاز میں فیروز کی طرف دیکھا لیکن اب فیروز بھی چکر میں تھا۔ تابوت کے اوپر کی تحریر سے ثابت ہوا تھا کہ جو ہستی تابوت میں ہے وہ زندہ ہے اور اس پر زے سے تصدیق ہو گئی تھی لیکن سب کچھ عقل سے باہر تھا تاہم مصریات کے بارے میں سوچتے ہوئے بہت سی باتیں عقل سے بعید لگتی ہیں۔

فیروز اپنے دل کا صحیح اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ حیرت زدہ، زیادہ ہے یا اس لڑکی سے متاثر ہے۔ بہر حال الباقر اسے وہاں سے واپس لانے میں کامیاب ہو گیا۔ فیروز کی طبیعت پر اضمحلال طاری تھا۔ تحریر کے الفاظ اسے یاد آرہے تھے۔ رات کو اس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس کے دل پر ایک بے چینی، بے قراری سی تھی۔ نہ جانے سب کچھ کیا ہے، کیا وہ درحقیقت آئے گی؟

الباقر خاصی رات گئے تک اس کے ساتھ رہا اور پھر وہ اس سے رخصت ہو گیا۔ اس نے کہا کہ زندگی رہی تو ایک ہفتے کے بعد ملاقات ہوگی ورنہ خدا حافظ۔

لیکن الباقر کے چلے جانے کا بھی فیروز کو احساس نہ ہوا۔ وہ کمرہ بند کر کے اسی حسن سحر افروز کے بارے میں سوچنے لگا۔ جوں جوں سوچتا الجھتا جاتا۔ بہر حال نیند نے اسے الجھن سے نجات دلادی اور گہری نیند سو گیا، لیکن خوابوں میں بھی وہی اسے پریشان کرتی رہی۔ وہ چاروں طرف سے آرہی تھی۔ نت نئے لباس میں، نت نئے انداز میں۔

دوسرے روز بھی فیروز کی طبیعت مضطرب تھی۔ اس نے غسل کیا، ناشتا کیا اور گہری سانسیں لیتے ہوئے اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک بار اس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ دوبارہ اسی مقبرے میں جا کر دیکھے، لیکن تابوت خالی تھا۔ وہاں جا کر کیا کرتا۔ شام تک اضمحلال کی کیفیت طاری تھی۔ پھر اس کیفیت سے تنگ آکر اس نے ایک بار پھر غسل کیا۔ لباس پہن کر وہ ڈائننگ ہال میں آگیا۔ صنوبر کی رونق بھی کم نہیں تھی۔ آج تک اس نے ہوٹل کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ڈائننگ ہال میں ایک مشروب پیتے ہوئے لوگوں کی گہما گہمی دیکھتا رہا۔ الباقر بھی چلا گیا۔ بہر حال وہ دلچسپ نوجوان تھا۔

شام گزری، رات ہو گئی، بجوم بڑھتا جا رہا تھا اور پھر اس وقت اس کی نگاہیں ایک جوڑے پر مرکوز تھیں جو ایشیائی ملک کا ہی معلوم ہوتا تھا کہ اچانک اس کے منتھوں سے ایک مخصوص خوشبو نکلرائی اور وہ چونک پڑا۔ اس نے غیر اختیاری طور پر گردن گھما کر دیکھا اور مبہوت ہو گیا۔

وہ اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ وہی حسین معصوم چہرہ، لیکن بے پناہ تبدیلیاں لئے ہوئے، لمبے لمبے خوبصورت بال لیکن جدید انداز سے سنوارے ہوئے۔ لباس بھی بالکل جدید تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔

”بیٹھ سکتی ہوں؟“ اس کی مترنم آواز گونجی۔ زبان انگریزی تھی، لہجہ مقامی۔ اس کی گردن خود بخود ہل گئی۔

”اجنبیوں کے سے انداز میں نہ دیکھو میرے محسن۔ میں اجنبی تو نہیں ہوں۔“

”دل لیکن۔“



میں اس دنیا کے بہت سے گہوارے دکھاؤں گا۔ تم دوست کی حیثیت سے سفر کرو گی۔“  
 ”یہ سفر میرے لئے خوابوں کا سفر ہو گا۔“ ان میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسا رحم دل انسان مل گیا۔“ وہ مسرت سے بے قابو ہو کر بولی۔  
 ”تم زندہ ہو تو تمہیں زندہ انسانوں جیسی حاجت بھی ہو گی۔ میں تمہارے لئے مشروب منگاؤں۔“

”مجھے قدم قدم پر تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہو گی مگر میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟“

”میرا نام فیروز ہے۔“

”میرے محسن میں تمہاری دنیا سے بالکل اجنبی ہوں۔ ممکن ہے میری اس دنیا سے ناواقفیت تمہیں گراں گزرے۔ میں تمہارے لئے تکلیف کا باعث نہ بن جاؤں۔“  
 ”نہیں ورشاشہ! مجھے تمہارے ساتھ رہ کر دلی مسرت ہو گی۔“ فیروز کے دل میں انجانے چراغ روشن ہو گئے۔ اسے اچانک اپنے دل میں عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔ اس کی طبیعت کا بوجھ ہٹ گیا۔ اس نے ورشاشہ کے لئے ایک مشروب منگایا اور پھر وہ مشروب سے لطف اندواز ہوتے رہے۔

وہ رات فیروز کے لئے بڑی پر مسرت تھی۔ اس نے ورشاشہ کے لئے دوسرا بستر منگو لیا تھا۔ اس بستر پر لیٹی ورشاشہ اسے کسی عجیب دور کی پراسرار داستانیں سناتی رہی۔ کافی رات گئے تک وہ نہ جانے کیسے کیسے قہے سناتی رہی اور فیروز اس کے معصومیت سے کھلتے اور بند ہوتے خوبصورت ہونٹ دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں مسرتیں جاگ رہی تھیں۔ پھر وہ قہے سناتے سناتے سو گئی۔ لیکن فیروز جاگتا رہا۔ وہ اس خوابیدہ حسن کو دیکھتا رہا اور پھر اسے بھی نیند آ گئی۔ دوسری صبح وہ اس طرح جاگا جیسے رات بھر خواب دیکھتا رہا۔ اس نے دھڑکتے دل سے دوسری طرف نگاہ ڈالی۔ ورشاشہ اپنی مسرت پر موجود تھی تب اس کے روئیں زونیں میں مسرت دوڑ گئی۔ وہ خواب نہ تھا حقیقت تھی۔ درحقیقت ورشاشہ اس کی زندگی میں موجود ہے۔ وہ اب بھی بے خبر سو رہی تھی۔ وہ غسل خانے میں چلا گیا۔ اس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ روح بے حد خوش تھی۔ غسل خانے سے وہ گنگلتا

”یہ زمین اسرار و رموز کا سمندر ہے کسی بات پر حیرت نہ کرو۔ میں ایک زندہ وجود ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں صدیوں پہلے پیدا ہوئی تھی۔ تمہاری دنیا میرے لئے ضرور اجنبی ہے لیکن میں خود کو ہر ماحول میں ڈھال لینے کی قوت رکھتی ہوں۔ دیکھ لو یہ ماحول اپنا لیا ہے۔“

فیروز کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا اور وہ بولتی رہی۔

”آطوس بد فطرت تھا۔ اس نے مجھے چاہا لیکن چاہت کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے۔ میرے دل نے اسے قبول نہ کیا تب اس نے مجھے زندہ درگور کر دیا تھا لیکن اس کی قوت صرف اسی قدر تھی میری زندگی جتنی اس وقت باقی تھی اتنی ہی اس وقت باقی ہے اور جب موت آئے گی تو میں مرجاؤں گی مگر آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ میرے محسن مجھے آپ نے نئی زندگی دی ہے۔“

”تو تم م۔ میرا مطلب ہے اس دور میں تمہارا کوئی نہیں ہے؟“

”نہیں میں تنہا ہوں۔ وہ سب مر چکے ہیں جو میرے دور کے انسان تھے۔ یہ دنیا میرے لئے قدم قدم پر اجنبی ہے۔ میں نہیں جانتی نئی دنیا کیسی ہے لیکن میں اپنے مقبرے میں سوچتی تھی کہ نہ جانے دور کہاں سے کہاں نکل گیا ہے۔ نہ جانے انسان کتنے بدل گئے ہیں۔ میں نے کتنی ہی بار سوچا۔ کاش کوئی مجھے اس تابوت سے نکال لے۔ کاش میں اس نئی دنیا کو دیکھ سکوں۔ لیکن پھر دل سے آہ نکل جاتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ روز محشر تک مجھے یونہی زندہ درگور رہنا پڑے گا۔ لیکن بالآخر میری دعائیں پوری ہو گئیں۔ تم اندازہ کر سکتے ہو میرے محسن میں کتنی خوش نصیب ہوں۔“

”مجھے مسرت ہے تمہارے کسی کام آسکا۔ میں تمہیں کس نام سے مخاطب کروں؟“

”ورشاشہ — یہی میرا نام ہے۔“

”کیا تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔ کیا تمہیں میری دوستی قبول ہو گی؟“

”میں تو تمہاری غلام ہوں میرے محسن۔ اس دنیا میں تنہا ہوں اگر تم نے مجھے سہارا دے دیا تو میں سمجھوں گی کہ مجھے میری پوری زندگی کی کلفتوں کا ثمر مل گیا ہے۔“  
 ”تب ٹھیک ہے تم میرے ساتھ رہو۔ میں تمہیں نئی دنیا سے روشناس کراؤں گا۔“

کی سیر کے دوران ورشاسہ اس کے ساتھ ہوگی۔ زندگی کا لطف دو بلا ہو گیا تھا۔ تیسرے دن پاسپورٹ ایجنٹ نے تمام کاغذات بمعہ پاسپورٹ کے ان کے حوالے کر دیئے اور باقی رقم لے کر چلتا ہوا اور چوتھے دن کے لئے فیروز نے پیرس کے لئے دو ٹکٹ حاصل کر لئے۔ رات کو وہ ورشاسہ کو اس حسین شہر کے بارے میں بتاتا رہا اور ورشاسہ کی آنکھوں میں پرست آرزوئیں رقص کرتی رہیں۔

شاید ورشاسہ رات کو سوئی بھی نہیں تھی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کھڑکی کے نزدیک بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔

”ارے“ آج بہت صبح جاگ گئیں۔ ورشاسہ“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں“ اس ملک کے بارے میں سوچ رہی تھی فیروز جہاں ہم جانے والے ہیں۔“

”تمہیں وہاں جانے کی بہت خوشی ہے؟“

”ہاں مجھے نئی دنیا سے بہت پیار ہے۔ بڑی حسین ہے یہ دنیا۔ بڑے ذہین ہیں اس

کے لوگ۔ نہ جانے کیا کیا بنایا ہے۔ زندگی کی ہر سہولت، ہر عیش ہر آرام۔“

”قرب سے یہ سب کچھ دیکھو گی تو تمہیں اور پسند آئے گا“ فیروز نے کہا اور ہاتھ

روم میں چلا گیا۔ غسل کرتے ہوئے وہ ورشاسہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ دور قدیم کی معصوم لڑکی اس کی زندگی پہ کیسے چھا گئی ہے، لیکن کیا وہ اسے جیون سا تھی بنا سکتا تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ صدیوں پہلے کی اس مخلوق کے ساتھ وہ اس دور میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔“

لیکن کیا کمی تھی اس میں کیا خاص بات تھی وہ ایک معصوم سی انگلیوں بھری لڑکی تھی۔ وہ نوجوانی میں سحر کا شکار ہو گئی تھی اور اس کے بعد اس کی عمر رک گئی تھی۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ کچھ کرنا ہے۔ ضرور کچھ کرنا ہے، وہ غسل خانے سے باہر نکل آیا۔ ورشاسہ ایک کرسی پر دراز تھی اس کی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کیسی معصومیت ہے ان آنکھوں میں وادی نیل کی اس پراسرار لڑکی نے کس طرح اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا ہے۔

فیروز نے ناشتا منگوا یا انہوں نے ناشتا کیا اور پھر باہر نکل آئے مزید ضروری شاپنگ کے بعد وہ دوپہر کو ہوٹل واپس آئے کھانا کھایا تھوڑی دیر آرام کیا اور شام کو چار بجے فیروز

ہوا باہر نکلا تو ورشاسہ جاگ اٹھی۔ چند لمحات وہ معصومیت سے اسے دیکھتی رہی اور پھر جلدی سے اٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مصری زبان میں کچھ کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں یہ زبان نہیں جانتا۔“ فیروز نے کہا۔

”اوہ۔ میں بھول گئی تھی۔ میں تمہیں یہ زبان سکھا دوں گی۔“

”غسل سے فارغ ہو جاؤ۔ پھر ناشتا کریں گے۔“

فیروز نے کہا اور وہ ہاتھ روم میں چلی گئی۔ اس کی کیفیت ایک فرمانبردار بچے کی طرح تھی۔ غسل خانے سے وہ نکھری نکھری برآمد ہوئی اور فیروز نے ویٹر کو بلا کر ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ دونوں نے ساتھ ناشتا کیا اور اس کے بعد پھر وہی بچوں جیسی گفتگو شروع ہو گئی۔

فیروز اسے اپنے بارے میں بتا رہا تھا اور وہ خاموشی اور دلچسپی سے سن رہی تھی۔

اس طرح کافی دیر گزر گئی تو فیروز نے اسے تیار ہو جانے کے لئے کہا۔

”کہاں چلیں گے؟“

”اب ہم زیادہ دیر نہیں رکھیں گے۔ میں آج ہی تمہارے پاسپورٹ وغیرہ کے لئے کسی ایجنٹ کو تلاش کرتا ہوں۔ کچھ خرید و فروخت بھی کرنا ہے۔“ فیروز نے کہا اور وہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھتی رہی۔

”آؤ راستے میں سب کچھ بتا دوں گا۔“ فیروز نے کہا اور پھر وہ ٹیکسی میں اسے آہستہ

آہستہ جدید دنیا کے اصولوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ حیرت سے سب کچھ سن رہی تھی۔ پاسپورٹ آفس کے سامنے بہت سے ایجنٹ مل گئے۔ دولت سے کون سا کام نہیں ہوتا، ایک ایجنٹ نے معقول رقم کے عوض تمام کام کر دینے کا وعدہ کیا۔ تب اسے رقم اور پتا وغیرہ دے کر فیروز بازاروں کی طرف نکل گیا۔ زبردست خریداری کی گئی جس میں زیادہ چیزیں ورشاسہ کے لئے تھیں۔ وہ ممنون نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ واپس آگئے۔

فیروز کی زندگی کا ایک ایک لمحہ پر مسرت گزر رہا تھا۔ اسے انتہائی مسرت تھی کہ دنیا

نی لیکن آنکھوں نے اظہار کر دیا تھا کہ دونوں کی سوچ کا دھارا ایک ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن گئے ہیں۔ اور پھر خواب کا یہ دور گزرنے کے بعد ایک نام وہ واپس قاہرہ پہنچ گئے۔ فیروز نے سیدھا صنوبر ہوٹل کا رخ کیا۔ جہاں سے اس کی زندگی کے اس عجیب دور کا آغاز ہوا تھا۔ اتفاق سے اسے وہی کمرہ کرائے پر مل گیا جس میں اس نے پہلے قیام کیا تھا۔

اور نہ جانے کیوں قاہرہ واپس آتے ہی ورشاشہ کی آنکھوں کے چراغ مدھم پڑ گئے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب ہراس ابھر آیا۔ فیروز نے ان آنکھوں کو دیکھا اب زبان بندی بیکار تھی۔ چنانچہ اس نے نہایت جذباتی انداز میں کہا ”ورشاشہ میں نہیں جانتا تمہاری زندگی کے دھارے کہاں جاتے ہیں۔ ہاں میری ہر سانس تم سے منسلک ہو گئی ہے اب تمہارے بغیر زندگی ایک مذاق معلوم ہوگی۔ میں چاہتا ہوں ورشاشہ تمہیں زندگی کا ساتھی بنا کر اپنے گھر لے چلوں۔ کیا تمہیں اس بات پر اعتراض ہے؟“

”مجھے کچھ وقت دو فیروز۔ مجھے کچھ مہلت دو“ میں بہت جلد جواب دوں گی۔“

”وہ جواب میرے لئے زندگی لائے گا یا موت؟“

”کس کی زندگی کس کی موت ہوگی۔ یہ تو وقت بتائے گا فیروز۔“ ورشاشہ نے غم زدہ انداز میں کہا۔

”تب پھر یہ جواب مجھے کب ملے گا؟“

”بہت جلد“ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔“ ورشاشہ نے جواب دیا۔ اور فیروز کے دل

میں ایک عجیب سی اداسی سمٹ آتی۔

”جب ورشاشہ کا کوئی نہیں ہے۔ اگر اسے میرا جیون ساتھی بننے میں کوئی عار نہیں ہے تو پھر سوچ کیسی لیکن اس نے ورشاشہ کو مہلت دے دی۔ حسب معمول انہوں نے ہوٹل کی تفریحات میں حصہ لیا اور رات کو اپنے کمرے میں واپس آ گئے نہ جانے کیوں ورشاشہ کے دل کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔

فیروز اس سے کچھ نہ پوچھ سکا، کچھ نہ کہہ سکا، ہاں دوسری صبح جب وہ سو کر اٹھا تو ورشاشہ موجود نہ تھی اس نے پانگوں کی طرح اسے تلاش کیا۔ غسل خانے میں، ڈائننگ

ہوٹل کابل وغیرہ ادا کر کے باہر نکل آیا ٹیکسی نے ان دونوں کو ایئر پورٹ پہنچا دیا۔ ورشاشہ اس دوران خاموش رہی تھی اس کے گلابی چہرے پر ایک سحر سا چھایا ہوا تھا۔ جس وقت ہوائی جہاز نے فضا میں پرواز کی تو اس نے مضبوطی سے فیروز کا بازو پکڑ لیا۔

یہ یہ سب کچھ میرے لئے اجنبی ہے، بالکل اجنبی۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”میں تو اجنبی نہیں ہوں، ورشاشہ میں زندگی بھر تمہیں ان راہوں پر ساتھ رکھنے کے لئے تیار ہوں۔“ فیروز نے کہا اور وہ خاموش ہو گئی۔

روشنیوں کے شہر پیرس کی رنگینیاں سمیٹتے ہوئے، اگل ٹاور کی بلندیاں ناپتے ہوئے وہ لندن آ گئے ورشاشہ دیوانگی کی حد تک خوش تھی فیروز اسے پوری دنیا سے روشناس کرا دینا چاہتا تھا دولت کی کمی نہیں تھی کوئی کام رکھا ہوا نہیں تھا۔ جہاں جو دل چاہتا کرا لیتے۔ کسی بھی جگہ انہوں نے زیادہ قیام نہ کیا۔

”اور صرف چالیس دن — چالیس دن میں انہوں نے دنیا کے بہت سے شہر دیکھ ڈالے۔ ورشاشہ کا حسن بے پناہ نکھر آیا تھا۔ خوشیوں اور مسرتوں نے اسے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اور فیروز نے ان دنوں میں صرف یہ فیصلہ کیا تھا کہ ورشاشہ کے بغیر زندگی بے کار ہے وہ اگر ساتھ نہ ہو تو سانس گھٹ جائے اب ورشاشہ اس کی روح تھی اور روح کی جدائی موت کے مترادف ہوتی ہے۔

وہ ہر جگہ ساتھ رہے تھے۔ مغرب کے جذباتی ماحول میں جہاں قدم قدم پر حسن اور عشق کی رنگینیاں بکھری ہوتی ہیں۔ انتہائی جذباتی دور سے گزرنے کے باوجود انہوں نے اپنے درمیان ایک حد قائم رکھی تھی۔ سوزر لینڈ کی شراب آلودہ فضاؤں میں فیروز نے ورشاشہ کی نگاہوں میں جذبات تڑپتے دیکھے تھے لیکن اس نے ان جذبات سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔

یہاں تک کہ وہ بیروت واپس آ گئے۔ یہاں سے پھر قاہرہ کا پروگرام تھا۔ چالیس دن کے حسین ماحول میں بھی وہ دل کی بات ایک دوسرے سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ زبان بند

تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا نام ورشاشہ نہیں، سقینہ ہے اور میرا نام البان الباقر ہے۔ میں اس احق کا بھائی ہوں۔ ایک غریب کلرک اپنی بہن کی خواہش نہیں پوری کر سکتا تھا میں اسے دنیا نہیں دکھا سکتا تھا اور وہ آہیں بھرتی تھی، تب میرے دوست مجھ بے غیرت انسان نے ایک ڈرامہ ترتیب دیا۔ میں بھی اس کے ساتھ پاگل ہو گیا تھا میری نظر انتخاب تم پر پڑی تم سیدھے سادے نیک انسان معلوم ہوئے۔“

”سنو مجھ کینے انسان کی کمائی سنو“ میں نے پروگرام کے تحت اس پاگل کو وہاں یعنی نیل کے دوسرے کنارے بھیج دیا تھا جہاں اس نے ورشاشہ کا روپ دھارا اور میں نے اس کی بھرپور مدد کی۔ میری چیخ اسے وہاں سے فرار کرنے کے لئے تھی۔ پھر وہ پروگرام کے تحت تم سے ملی۔ میں معلوم کر چکا تھا کہ تم دنیا کا دورہ کرنے کا پروگرام رکھتے ہو اگر تم یہ پروگرام نہ رکھتے ہوتے تو تمہیں اس پر آمادہ کیا جاتا اور پھر اس کے بعد کے حالات تمہیں معلوم ہیں وہ ورشاشہ نہیں میری بہن سقینہ ہے اور اسے اس فرار کی پوری پوری سزا ملی ہے وہ بھی تم سے متاثر ہے تمہارے لئے بے قرار ہے۔ لیکن وہ جانتی ہے کہ حقیقت ایک نہ ایک دن کھلے گی اس لئے اب وہ تمہیں شکل دکھانے کے لئے تیار نہیں ہے اور یہ ناگوار فرض بھی مجھے ہی انجام دینا پڑ رہا ہے۔ میں پوری ڈھٹائی اور بے غیرتی سے پھر تمہارے پاس آ گیا ہوں لیکن کیا کروں ایک خدی بہن کا بھائی ہوں۔ تیار ہوں میرے دوست اگر چاہو تم ہم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دو ہم اس فراڈ کا اقرار کر لیں گے۔ ہم ہر سزا کے لئے تیار ہیں۔“

الباقر نے گردن جھکا لی۔

فیروز پاگلوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا اس کے ذہن میں پھلجھڑیاں پھوٹ رہی تھیں۔ دھماکے ہو رہے تھے ورشاشہ کی معصوم شکل اس کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود وہ معصوم تھی وہ بدکردار نہیں تھی۔ اور اپنائے جانے کے قابل تھی۔ دونوں بہن بھائیوں کی یہ شرارت اسے پسند آئی۔ دوسرے لمحے وہ اٹھا اور الباقر کو سینے سے لگا لیا۔

”اگر یہ سچ ہے الباقر — تو — الباقر میرے دوست، میرے پیارے دوست تو

ہاں میں، ہوٹل کے ایک ایک حصے میں لیکن کہیں سے کوئی پتا نہ چل سکا۔ فیروز کی دنیا تاریک ہو گئی۔ اس کی زندگی اس سے روٹھ گئی اس کی دنیا ٹ گئی تھی اس کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی تھی۔ لٹا لٹا سا وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ ذہن ماؤف ہو گیا تھا کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دل میں دھواں اٹھ رہا تھا۔ کلیجہ نکلا پڑ رہا تھا خود کشی کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔

دفعتا اسے نیل کے دوسرے کنارے کا خیال آیا۔ اور وہ چونک پڑا۔ اور وہ وہاں مل سکے گی ممکن ہے وہ وہاں موجود ہو۔ آہ اسرار مصر نے اسے لوٹ لیا تھا اگر وہ وہاں بھی نہ ملی تو — ڈوبتے دل سے وہ اٹھا لباس تبدیل کیا اور پھر باہر نکلنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ الباقر کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ اسے اپنے دوست کا تو خیال نہیں آیا لیکن الباقر کی شکل دیکھ وہ چونک پڑا مصری نوجوان کا چہرہ اتر ا ہوا تھا۔

”آؤ میرے دوست بہت دنوں کے بعد خبر لی ہے۔“ فیروز نے اس لہجے میں کہا اور الباقر گردن لٹکائے اندر آ گیا۔

”کہاں جا رہے تھے فیروز؟“

”آہ! الباقر تمہارے شہر نے میرا سب کچھ لوٹ لیا ہے۔ مجھے دیوانہ کر دیا ہے اس پر اسرار زمین نے۔ کاش میں تمہاری بات مان لیتا۔ کاش میں وہ تابوت نہ کھولتا۔“ فیروز کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

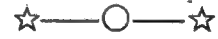
”فیروز — فیروز — آنسو نہ بہاؤ میرے دوست مجھے خود کشی پر مجبور نہ کرو۔ کاش تم اس قدر شریف انسان نہ ہوتے۔ کاش ہم تمہارا انتخاب نہ کرتے تمہاری شرافت نے تو ہماری گردنیں جھکا دی ہیں فیروز۔ فیروز میرے دوست کوئی تمہید نہیں باندھوں گا۔ سنو صاف سنو غور سے سنو فیروز۔ دیوانی لڑکی بھی تمہارے لئے بے قرار ہے اس بے وقوف نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا ہے کاش میں تمہارے سامنے نہ آ سکتا۔“

”میں نہیں سمجھا“ الباقر کیا کہہ رہے ہو؟“ فیروز نے اسے لپکتے ہوئے کہا۔

”میں بتا رہا ہوں میرے عزیز۔ احق لڑکی دنیا دیکھنے کی خواہش میں جنون کی حدود

یہ شرارت مجھے بہت پسند ہے چلو مجھے اس معصوم صورت شریر لڑکی کے پاس لے چلو دیکھوں گا۔ رب آطوس کی محبوبہ کا کیا حال ہے چلو جلدی کرو جلدی کرو الباقر میں اسے زیادہ دیر تک افسردہ نہیں رہنے دینا چاہتا۔ تم نہیں جانتے وہ شریر ہونے کے باوجود کس قدر معصوم ہے کس قدر نیک ہے۔“

اور الباقر کے چہرے پر مسرتیں بکھر گئیں۔ دوسرے لمحے وہ تیزی سے ہوٹل سے باہر نکل آئے۔



## ادھوری تصویر

سورج کا قمر زمین پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ ایسی چلچلاتی دھوپ تھی کہ چیل انڈا چھوڑ دے۔ لیکن چندن مکٹ ہاتھ میں نیم کی منی لئے بیلوں کو ٹٹٹھا رہا تھا۔ اور ہل کی تیزانی زمین کے سینے پر گہری لکیریں بناتی آگے بڑھ رہی تھی۔ چندن مکٹ کا گورا بدن مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ اس کی پھٹی ہوئی بینائن پسینے اور مٹی سے بھیگ رہی تھی لیکن وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہل چلا رہا تھا۔

جگ راج نے کھیت کی مینڈیز پر کھڑے ہو کر اس محنت کش کو دیکھا اور اس کے جسم کے روٹنے کھڑے ہو گئے یہ کیسی لگن ہے؟ یہ کون سا خیال ہے جس نے اسے موسم کے اثرات سے بے نیاز کر دیا تھا۔ چندن مکٹ کے جسم سے بننے والے پسینے نے جگ راج کے دل کی تمام کدورت دھو دی تھی اب سے کچھ دیر پہلے وہ چندن مکٹ سے نفرت کرتا تھا سخت نفرت اس کی خواہش تھی کہ چندن مکٹ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو۔ وہ کبھی ایک ہزار روپے جمع نہ کر سکے جو کوندنی سے اس کا بیاہ۔ کوندنی جگ راج کی بیٹی تھی اور چندن مکٹ ایک آوارہ گرد۔ نہ جانے کہاں سے آیا تھا۔ کون جاتی تھا۔ بس کہیں آکر گاؤں میں بس گیا تھا۔ لمبا ترنگا کڑیل جوان تھا۔ خوبصورت بھی تھا۔ پگھٹ پر جانے والی لڑکیاں آرزو کرنے لگیں تھیں کہ وہ راستے میں نظر آجائے گاؤں کی کنوئریوں کی سرگوشیوں کا موضوع وہی ہوتا۔ لیکن میدان کوندنی کے ہاتھ رہا۔ کوندنی کا اس سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اور دونوں ایک دوسرے کے گھائل ہو گئے۔ ہونٹ لرزے، لیکن زبان نہ ہل سکی البتہ دوسرے دن پھر دونوں اسی جگہ ایک دوسرے کے منتظر تھے چند دنوں خاموش ملاقاتیں

ہوئی۔ دوسری بات یہ کوندنی نادان نہیں ہے۔ وہ سمجھ دار ہے۔ بالغ ہے اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکتی ہے تم اسے نادان قرار دے کر بچانا چاہتے ہو جگ راج۔ میں چاہوں تو اس حرکت پر تمہیں جوتے لگوا کر بستی سے نکلوا سکتا ہوں۔ لیکن پرانے تعلقات کی بنا پر میں تمہیں معاف کر رہا ہوں۔ البتہ کل پنچائت بلا کر تمہارا اور چندن مکٹ کا فیصلہ ہو گا۔ چودہری صاحب نے فیصلہ کیا۔

اور دوسرے دن پنچائت میں جگ راج گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ چندن مکٹ بھی شریک تھا۔ اس کے سر اور جسم کے دوسرے حصوں پر پیناں بندھی ہوئی تھیں لیکن اس کی چال میں ذرا بھی لڑکھاہٹ نہیں تھی۔ مقدمہ پنچائت کے سامنے پیش ہو گیا۔ بچوں نے یہی کہا کہ جگ راج نے چندن مکٹ کے ساتھ انیائے کیا ہے۔ اگر اسے سزا دینی تھی تو دونوں مجرموں کو یکساں سزا دینی چاہیے تھی تب چندن مکٹ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ بھائیو جگ راج چاچا نے مجھے مارا ہے۔ بزرگ بچوں کو مارتے ہی رہتے ہیں۔ اگر میری غلطی نہ ہوتی تو میں جگ راج چاچا کو روک سکتا تھا۔ مگر میری بھول تھی اس لئے میں پٹا۔ اس کے باوجود اگر آپ لوگ جگ راج چاچا کو مجرم سمجھتے ہیں تو میں انہیں معاف کرتا ہوں مجھے جگ راج چاچا سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ اور اس وقت پوری پنچائت نے چندن مکٹ کی عظمت کو تسلیم کیا۔ اور چودہری گوپال داس کھڑے ہو کر بولے:

دیکھ لیا جگ راج۔ یہ کسی چھوت کے الفاظ نہیں ہو سکتے یہ براہمن کی نشانی ہے۔ بھگوان کی سوغند کھا کر کتا ہوں اگر چندن مکٹ میری پتری سے پریم کرتا تو میں کل ہی اس کے پھیرے کرا دیتا چندن مکٹ نے جگ راج کو معاف کر دیا ہے اس لئے ہم بھی اسے معاف کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی جگ راج کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا بیاہ چندن مکٹ سے کر دے۔

”میں اس انیائے کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں میں عزت دار آدمی ہوں۔ اور چندن مکٹ ایک بے گھر انسان ہے۔ اگر پنچائت کا فیصلہ مان لوں کہ چندن مکٹ میری بیٹی کو کماں رکھے گا۔ وہ خود چودہری کے رحم و کرم پر ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے چودہری صاحب۔“ جگ راج نے کہا۔

رہیں۔ نگاہیں محبت کی پیغامبری کرتی رہیں اور پھر زبان بھی آزاد ہو گئی۔ دونوں نے جنم جنم ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا۔ اور بالا خروبی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ دونوں کی محبت کا راز طشت از بام ہو گیا۔ جگ راج لاٹھی لے کر چندن مکٹ پر پل پڑا۔ اسے لہولہاں کر دیا۔ حالانکہ جگ راج لاٹھی لے کر چندن مکٹ کے سامنے ایک ہاتھ کا نہ تھا۔ اگر چندن مکٹ اس کی لاٹھی پکڑ کر ایک جھٹکا بھی دے دیتا تو جگ راج کئی قلابازیاں کھا جاتا۔ لیکن وہ خاموشی سے پٹتا رہا۔ اور بے ہوش ہونے سے قبل اس نے جگ راج کی طرف دیکھا اور بولا پچا۔ میں کوندنی سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

چودہری گوپال داس کے کسی ملازم کی پٹائی کرنا آسان کام نہیں تھا۔ چودہری صاحب کو جب معلوم ہوا کہ چندن مکٹ کو جگ راج نے مار مار کر لہولہاں کر دیا ہے تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے انہوں نے جگ راج کو بلا بھیجا۔ اور جگ راج ان کے حضور پہنچ گیا۔

”تم نے چندن مکٹ کو کیوں مارا ہے؟“ چودہری نے گرج کر پوچھا۔

”پورے گاؤں سے پوچھ لیں مہاراج۔ اس نے میری عزت کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تھی۔“ جگ راج نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

”کیا تم نے اپنی بیٹی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔“

چودہری نے پوچھا اور جگ راج جواب نہ دے سکا۔ تب چودہری نے کہا ہم نے کچھ لوگوں کی زبان سے چندن مکٹ اور کوندنی کی پریم کہانی سنی ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو تمہاری بیٹی بھی مجرم ہے پھر تم نے دو مجرموں میں سے صرف ایک کو سزا کیوں دی ہے کیا دوسرا مجرم اس لئے بچ گیا کہ وہ تمہاری بیٹی ہے؟“

”چندن مکٹ غیر ہے مہاراج۔ اس کے دھرم تک کا پتہ نہیں ہے۔ نہ جانے کون جاتی ہے۔ اور پھر کوندنی نادان ہے۔ وہ چندن مکٹ کی باتوں میں آگئی تھی۔“ جگ راج نے کہا۔

”جب میں نے آوارہ گرد چندن مکٹ کو اپنے ہاں ملازم رکھا تو اس نے بتایا تھا کہ وہ ذات کا کھرا براہمن ہے۔ میں نے اس کی پیشانی دیکھ کر یقین کر لیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ جب میں نے اس کی بات سچ مان لی تو تمہیں اس کی بات جھوٹ سمجھنے کی جرات کیسے

محسوس کرتا۔

”اور وقت گزرتا گیا پورے تین ماہ گزر گئے۔ چندن مکٹ سخت محنت کر رہا تھا اور جگ راج اس کی محنت سے خوفزدہ تھا۔ اسے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ چندن مکٹ ایک ہزار روپے جمع کر لے گا۔ اور پھر اور پھر وہ ہو گا جو وہ نہ چاہتا تھا کوندنی کی صحت خراب ہو گئی تھی وہ چندن کے عشق میں جل رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آس کے دیئے روشن تھے جگ راج کو بیٹی پر بھی رحم نہ آیا۔

لیکن آج چلچلاتی دھوپ میں چندن مکٹ کے جسم سے بچتے پسینے نے جگ راج کے دل کی سیاہی دھو دی تھی۔ اس کڑی دھوپ میں جبکہ غریب سے غریب پریشان حال سے پریشان حال انسان گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کر پاتا تھا۔ چندن مکٹ ہل چلا رہا تھا۔ جگ راج کے جسم میں تھر تھری پڑ گئی بے اختیار اس کے قدم منڈیر سے نیچے اتر گئے۔ اور پھر اس نے لرزتی آواز میں چندن مکٹ کو پکارا۔

”چندن — اور چندن چونک کر رک گیا۔ اس نے جگ راج کو دیکھا اور جلدی سے ہل چھوڑا کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”ارے چاچا اس دھوپ میں کیسے نکل آئے کیا کام ہے بتاؤ تم گھر جاؤ چاچا بیمار ہو جاؤ گے۔“ اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔ جگ راج کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اس کی گردن جھک گئی اور پھر وہ لڑتی آواز میں بولا:

”تم میرے ساتھ آؤ بیٹا۔ مجھے تم سے کام ہے۔“

”چلو چاچا۔ کہاں چلنا ہے۔“ چندن مکٹ مستعدی سے بولا۔

”نیل کھول کر چھاؤں میں باندھ دو۔ اتنی سخت دھوپ میں ہل چلانے سے بیمار ہو جاؤ گے۔“ جگ راج نے کہا۔

”میں بیمار نہیں ہوں ہو گا۔“ چندن مکٹ نے ایک عزم سے کہا۔

بڑوں کی بات مانتے ہیں بیٹا جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ جگ راج نے کہا اور چندن مکٹ سعادت مندی سے واپس مڑا۔ اس نے ہل کھول لیا اور بیلوں کی جوڑی کو ایک

”ہمارے ہوتے ہوئے چندن مکٹ کو کس بات کی کمی ہے ہم اسے مکان دیں

گے۔“

”یہ کیسا ایٹائے ہے مہاراج۔ میں ایک ایسے آدمی کو اپنی بیٹی دے دوں جو دان کئے ہوئے مکان میں رہے جو دوسروں کا محتاج ہو اگر چندن مکٹ کوندنی سے بیاہ کرنا چاہتا ہے مہاراج تو اس سے کہئے کم از کم ایک ہزار روپے جمع کر لے۔ اور اگر وہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے ایک ہزار روپے جمع کر کے مجھے دے گا تو میں کوندنی کو اس سے بیاہ دوں گا۔ یہ میرا چن ہے!“

”ہم چندن مکٹ کو دو ہزار روپے دے سکتے ہیں۔“ چودہری نے کہا۔

مگر میری شرط پوری نہ ہو گی مہاراج۔“ جگ راج نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ کنگال چندن مکٹ ایک جگ میں ایک ہزار روپے نہ اکٹھے کر سکے گا۔ اس سے قبل کہ چودہری اور چہ کئے چندن مکٹ بول اٹھا۔

”جھگوان کی سوگندھ کھا کر کہہ رہا ہوں جگ راج چاچا۔ اگر آج سے چند ماہ پہلے تم نے کوندنی کی قیمت مانگی ہوتی تو میں اس کے وزن کے برابر سونا تول کر اسے خرید لیتا۔ لیکن اب چندن مکٹ بدل چکا ہے اب وہ صرف ایک کسان ہے۔ لیکن اس کے بازو ہی ہیں جو۔ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر بولا۔ میں وچن دیتا ہوں چاچا کہ میں خون پسینے کی کمائی سے رقم جمع کروں گا۔ اور تمہیں پیش کروں گا۔“

تب تو کوندنی کا حق دار ہو گا چندن مکٹ۔“ جگ راج نے کہا۔ اور بات ختم ہو گئی چندن مکٹ نے چودہری کی نوکری چھوڑ دی۔ اب وہ گاؤں کے زمین داروں کے کھیتوں میں اجرت پر کام کرتا۔ ہل چلاتا۔ گائے بھینسوں کی نگرانی کرتا اور دوسری محنت مزدوری کرتا۔ اور تھوڑی تھوڑی رقم جمع کرے چودہری کے پاس رکھوا دیتا۔ چودہری نے کئی ایک بار اسے مختلف پیش کش کیں۔ لیکن اس نے ہر بار ایک ہی بات کہی۔ ”مرو نے وچن پورا نہ کیا چودہری تو وہ مرد کھلانے کا مستحق نہیں ہے اور نامرد کو استری رکھنے کا ادھیکار نہیں ہے۔“

”جھگوان کی سوگند چندن مکٹ۔ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو میں تجھے اپنا داماد بنا کر فخر

”یہ کیا کر رہے ہو چاچا۔ تم میرے بزرگ ہو۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔“ اس نے اپنے مضبوط پنجوں میں جگ راج کے شانے دبوچ لئے۔ اور اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ جگ راج کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بس تو مجھے معاف کر دے چندن میں نے تیرے ساتھ بڑا انیائے کیا ہے اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا تو بھگوان بھی مجھے معاف نہ کرے گا۔ مجھے نرک کی آگ میں بھسم ہونا پڑے گا مجھے معاف کر دے چندن۔ جگ راج پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پر بات کیا ہے چاچا مجھے بتاؤ تو چندن نے پریشان ہو کر کہا۔ ”تو لسی پی لے۔ پھر ہم چودہری جی کے پاس چلیں گے میں ان سے بھی معافی مانگوں گا۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے میں چودہری جی سے کہوں گا کہ چندن جی جگ راج کا چندن ہے میری اندھی آنکھیں اسے نہیں پہچان سکی تھیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے میں کوندنی سے تیرے پھیرے کرنے کو تیار ہوں۔“

”چاچا۔“ چندن کا چہرہ جوش مسرت سے سرخ ہو گیا۔ ”چاچا۔“ اس نے جگ راج کو اپنے چٹان جیسے سینے سے بھینچ لیا۔ تمہاری کوندنی کو میں آنکھوں میں جوت کی طرح رکھوں گا چاچا۔ میں تمہاری کوندنی کے دل پر کوئی میل نہ آنے دوں گا۔“ وہ جذبات بھری آواز میں بولا۔

پوری بستی نے یہ بات حیرت و خوشی کے ساتھ سنی کہ جگ راج نے اپنی شرط واپس لے لی ہے۔ وہ کوندنی کا بیاہ چندن مکٹ کے ساتھ کرنے کو تیار ہے۔ بیاہ کی تاریخ بھی آج کل میں چودہری جی سے طے ہو جائے گی۔

اور پھر وہ شہ سے آگیا جب چندن مکٹ اور کوندنی کا ملاپ ہونے والا تھا۔ جگ راج کے دروازے پر شہنائی بج رہی تھی۔ رنگین لباسوں میں ملبوس کنواریاں دلوں میں آرزوؤں کے چراغ روشن کئے ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں۔ پھر چندن مکٹ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا۔ چودہری جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ساتھ تھے۔ بارات چارپائیوں پر بیٹھ گئی دلہا اور چودہری جی کے لئے سرکنڈوں کے موندھوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ چندن مکٹ دو لہا بنا: کسی دیس کا راج نظر آ رہا تھا پھر بیر بہونی جیسی کوندنی کو دلہن بنا کر لگن منڈپ میں لایا گیا۔ اور پنڈت نے اشلوک شروع کر دیئے منڈپ کی آگ روشن ہو گئی

گھنے درخت کے نیچے باندھ کر ان کے سامنے چارہ پانی رکھ دیا۔ اور پھر انکو چھاندھے پر ڈال کر جگ راج کے پاس پہنچ گیا۔ جگ راج آگے آگے چل پڑا۔ اس کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کچے مکان کی ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔ تب اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو آواز دی۔ روپے ابے او روپے گڑوے میں پانی لے آمنہ دھونے کے لئے۔“ اور پھر اس نے چندن سے چارپائی پر بیٹھ جانے کے لئے کہا۔

چندن مکٹ کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش تھے۔ لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا آج سورج مغرب نکل رہا تھا۔ روپے پتیل کے گڑوے میں پانی لے آیا اور جگ راج نے چندن مکٹ سے منہ دھونے کے لئے کہا۔ گرد سے اٹے ہوئے چہرے اور دھوپ سے جلی ہوئی کھال کو ٹھنڈے پانی نے بہت سکون دیا۔ چندن مکٹ ممنونیت کے جذبات کے ساتھ انکو جیسے کے پلوے سے منہ پونچھتا ہوا دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”روپے جاگلاس میں لسی لے آ۔“ جگ راج نے دوسرا حکم دیا اور روپے اندر چلا گیا تب جگ راج نے گردن اٹھا کر چندن مکٹ کو دیکھا۔ اور بولا۔

”چندن“

”جی چاچا۔“ چندن مکٹ نے کہا۔

تو اتنی دھوپ میں ہل کیوں چلا رہا تھا۔“

”وہ چاچا ہیرے سے وعدہ کیا تھا کہ شام کھیت جوت دوں گا۔ ہیرے مجھے پانچ روپے دے گا کچے دل کا آدمی ہے چاچا خود کھیت جوتنے سے جان چراتا ہے!“ چندن ہنستے ہوئے بولا۔

”تو پانچ روپے کے لئے اپنی جان جو کھوں میں ڈالے ہوئے تھا اتنی دھوپ میں۔“

”میں تو پانچ آنے کے لئے جان کو بازی لگا سکتا ہوں چاچا مجھے اپنا وچن پورا کرنا ہے۔“ چندن مکٹ نے کہا۔

”تو مجھے معاف کر دے چندن۔ بھگوان کے لئے مجھے معاف کر دے میں بڑا پانی ہوں۔ مجھے معاف کر دے چندن۔“ جگ راج نے چندن کے پاؤں پکڑے اور چندن اچھل کر کھڑا ہو گیا۔



لیکن وہ میرے پیچھے پڑ گئی۔ تب مجھے اس سے بھی نفرت ہو گئی اور پھر میں ڈاکو چندنا بن گیا میں نے پولیس کو ناکوں پہنے چوہڑے چوہڑی صاحب پولیس میرے نام سے کانپتی تھی میرے انتقام کی آگ سرد پڑ گئی تھی پھر ایک رات میں نے ایک گاؤں میں ڈاکہ ڈالا۔ میں نے پورے گاؤں کو لوٹ لیا۔ لیکن میں نے ایک ظلم کیا تھا میں نے ایک ایسی لڑکی کا جینز لوٹ لیا تھا جس کی شادی ہونے والی تھی یہ جینز اس کے بوڑھے باپ نے بڑی محنت سے جمع کیا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں معلوم ہوا تو میرا شریر کانپ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ اب تک نہ جانے میں کتنے ایسے سہاگ اجاڑ چکا ہوں نہ جانے کتنے انسانوں کو میری وجہ سے خود کشی کرنا پڑی ہوگی۔ چنانچہ اسی دن سے میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ میں نے اپنا گردہ توڑ دیا۔ تمام لوٹی ہوئی دولت غریبوں میں تقسیم کر دی اور میں چندنا سے پھر چندن مکٹ بن گیا۔ تب مجھے پہلا گاؤں یہی نظر آیا اور میں نے یہاں زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ یہ میری کہانی ہے بھگوان جانتا ہے چوہڑی صاحب میں صرف ایک عام انسان ہوں لیکن۔

”تو پہلے کیوں نہیں بتایا چندن مکٹ۔ پاپی۔ اگھوری تو نے کوندنی کا جیون برباد کر دیا۔ بول تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔“

”مجھے حالات کا اندازہ نہ تھا چوہڑی۔ کوندنی میری ہے میں اسے لینے آؤں گا چوہڑی اسے لکھ لو میں اسے لینے آؤں گا اگر کسی نے اسے دکھ پہنچایا تو چندن مکٹ اس گاؤں میں چندنا بن کر داخل ہو گا۔ یہ تم لوگوں کے پاس میری امانت ہے۔“ اس نے کوندنی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں ضرور آؤں گا کوندنی۔ میری دلہن۔ میں ضرور آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔“

”چلو چندنا انپکٹر نے اس کی ہتھکڑی کی زنجیریں کھینچ کر کہا۔ اور چندن مکٹ کوندنی پر آخری نگاہ ڈال کر چل پڑا۔ کوندنی منڈپ کے قریب بے ہوش ہو کر گر پڑی اور پورے گاؤں میں کھرام مچ گیا۔



کون ہو تم۔ سلطان نے سامنے دبے پتلے آدمی کو گھورتے ہوئے کہا۔  
”مصور ہوں حضور۔ آپ کا اشتہار پڑھ کر حاضر ہوا ہوں۔ مفلوک الحال مصور نے

کوندنی کا پلو چندن مکٹ کے پلو سے باندھ دیا گیا اور پھیرنے ہونے لگے۔ ابھی پھیرے مکمل ہی ہوئے تھے کہ اچانک باراتیوں کی نظر سامنے اٹھ گئی پولیس کی دو جیپیں آرہی تھیں۔ پولیس والے رانٹلوں سے مسلح تھے جیپیں جگ راج کے مکان کے سامنے آکر رک گئیں اور پولیس انسپکٹر مسلح سپاہیوں کے ساتھ ان کی طرف بڑھا۔ چوہڑی جی گھبرا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پنڈت نے اشلوک بند کر دیئے تھے۔ کوندنی بھی گھبرا کر پولیس والوں کو دیکھنے لگی تھی۔ اور چندن مکٹ بت کی طرح ساکت تھا۔

”کیا بات ہے داروغہ جی۔؟“ چوہڑی جی نے ہانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تم کون ہو۔“ داروغہ نے پوچھا۔

”میں اس گاؤں کا کھیا ہوں۔“

”تب چندنا کی گرفتاری میں ہماری مدد کرو۔ اور وہ ڈاکو چندن ہے جو دو لھایا کھڑا ہے تم نے اس کا نام ضرور سنا ہو گا۔ کئی مہینے سے ہم اسے تلاش کر رہے تھے۔ بالاخر کامیاب ہو ہی گئے۔“

”اوہ“ چوہڑی صاحب پر بجلی سی گر پڑی۔ خوفناک ڈاکو چندنا کے بارے میں کون نہیں جانتا تھا۔ صرف چند ماہ قبل اس نے ایک وسیع علاقے میں تباہی مچا رکھی تھی۔ لیکن چندن مکٹ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ پولیس کے مسلح سپاہیوں نے چندن مکٹ کو چاروں طرف گھیرے میں لے لیا۔ اور انسپکٹر آگے بڑھ کر کوندنی کا پلو کھول دیا۔ پھر اس نے چندن مکٹ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

”چندن کیا تم ڈاکو چندنا ہو۔۔۔۔۔۔ بتاؤ چندن۔ کیا ان لوگوں کو غلط فہمی ہے۔ بتاؤ جواب دو۔“ چوہڑی نے اس کا گریبان جھنجھور ڈالا۔

”نہیں چوہڑی انہیں غلط فہمی نہیں ہوئی۔“ چندن مکٹ نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ”میں ہی چندنا ہوں۔ راون پور کے جاگیردار نے میرے ماں باپ اور دو بھائیوں کو قتل کر دیا تھا۔ میں ان دنوں راون پور میں نہیں تھا۔ جب میں گھر واپس آیا تو میرا گھرا جڑ چکا تھا۔ تب مجھے اپنے گھر کی تباہی کی داستان معلوم ہوئی۔ اور میں نے جاگیردار کے پورے گھرانے کو زندہ جلا دیا۔ پولیس نے میرے ماں باپ کے قتل پر جاگیردار کا کچھ نہ بگاڑا تھا۔

ملاقات سلطان سے ہوئی تھی۔“

لیکن یہ نوجوان — بظاہر سنجیدہ اور متین نظر آتا تھا۔ کافی بارعب چہرہ تھا۔ لیکن اس کے اچانک بدل جانے والا انداز — حرکت و سکنت اسے صحیح الدماغ نہ ثابت کرتی تھیں۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی جو مصور کو چھ رہی تھی۔

”بولو۔ میری مدد کرو گے مصور۔ میری تصویر مکمل کر دو گے میں اسے مکمل کرنے میں ناکام رہا ہوں آنسو اس کے گالوں پر لڑھک آئے۔  
اپنی تمام صلاحیتیں صرف کردوں گا حضور۔ پوری محنت کروں گا۔ کون سی تصویر ہے مجھے دکھائیے۔“

”اگر تم نے اسے مکمل کر دیا مصور تو تمہیں پورے ایک لاکھ روپے دوں گا۔ میرا وعدہ ہے۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ آؤ اس نے مصور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مصور کی کلائی پر اس کی گرفت بہت سخت تھی اور مصور کے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ اگر وہ پاگل ہے تو کیا اس سے جان بچانا آسان ہو گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

زرم موئے قالین پر چلتے ہوئے وہ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ اور پھر سلطان نے دروازہ کھولا۔ انتہائی حسین کمرہ تھا۔ دیواروں پر بہترین تصاویر آویزاں تھیں۔ یہ سب بڑے بڑے مصوروں کی قیمتی تصویریں تھیں۔ سامنے ایک بورڈ پر کینوس لگی ہوئی تھی، اور اس کے نیچے ایک قیمتی ایزل موجود تھا۔ کینوس پر ایک چہرہ بنا تھا۔ دلہن کا چہرہ۔ اس کی ستاروں بھری ساڑھی صاف نظر آرہی تھی لیکن چہرے کے نقوش موجود نہ تھے صرف ایک سادہ فریم تھا۔ مصور بے نقش و نگار چہرے کو دیکھنے لگا پھر وہ سلطان کی طرف مڑا۔

”اس ادھوری تصویر کو مکمل کر دو مصور اسے میرا تخیل دے دو۔ اسے زندگی دے دو مصور ورنہ ورنہ میرا ذہن پھٹ جائے گا میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ اس نے عاجزی سے کہا۔ اور مصور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”یہ چہرہ آپ نے بنایا ہے؟“

”ہاں۔“

عاجزی سے کہا۔ اور سلطان کے چہرے کے نقوش بدل گئے۔ اس نے بکھرے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے سنوارا اور مصور کے قریب پہنچ گیا۔

”تم تم مصور ہو۔ کیا درحقیقت تم مصور ہو۔“ اس نے بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

جی حضور میرے پاس میرے فن کے بے شمار سرٹیفیکٹ ہیں لیکن حضور قدر ناشناس ملک میں در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ بچوں کا پیٹ بھرنا بھی مشکل ہے اس مصوری نے مجھے کچھ نہیں دیا حضور۔“

”دس ہزار۔“ سلطان نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”جی۔“ مصور حیرت سے بولا۔

”بیس ہزار۔ پچاس ہزار۔ پورے پچاس ہزار۔ بولوراضی ہو۔“ سلطان نے پوچھا۔

”کک کیا فرما رہے ہیں حضور۔ کک کیا فرما رہے ہیں۔ خدارا میرے جذبات سے نہ کھیلے۔“ مصور بدحواس ہو گیا۔

”ایک لاکھ دے دوں گا مصور۔ آہ۔ اپنی زندگی دے دوں گا جو مانگو کے دے دوں گا۔ میری تصویر مکمل کر دو۔ خدا کے لئے مصور میری ادھوری تصویر مکمل کر دو۔ سلطان نے دوڑ کر مصور کے پاؤں پکڑے اور مصور اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے اپنے پاؤں مصور کی گرفت سے نکال لئے۔

”میرے گدگدی ہوتی ہے حضور۔“ وہ شرماتے ہوئے بولا۔

”میری زندگی کا سوال ہے مصور۔“ میری تصویر مکمل کر دو۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان مانوں گا۔“ سلطان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور مصور حیرت سے اس نوجوان کو دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کے سامنے کھڑا ہو کر نوجوان اعلیٰ درجے کے لباس میں ملبوس تھا۔ وہ ایک بہت بڑے صنعت کار کا بیٹا تھا۔ ناظم علی درجنوں صنعتوں کے مالک تھے پورا شہر انہیں جانتا تھا اور سلطان ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مصور کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ آج اخبار میں، ضرورت ہے ایک مصور کی۔ دیکھ کر وہ درج شدہ پتے پر آگیا تھا۔ بڑی امیدیں لے آیا تھا اگر یہاں کلام بن گیا تو زندگی سنور جائے گی۔ اور اس کی

بھری دلہن کا چہرہ فرشتوں جیسا تقدس حوروں کی سی پاکیزگی حیا کی سرفی لئے ہوئے۔ وہ ادھ کھلی سیاہ آنکھوں سے کسی کی منتظر تھی۔ ”مصور نے چہرے کو فاسٹل ٹچ دیئے اور اینزل رکھ دیا۔

کیا آپ تصویر دیکھنا پسند کریں گے نواب سلطان۔“ اس نے بڑے فخر سے کہا۔ اور سلطان نے سرخ آنکھیں کھول دیں۔ اس نے کھوئی ہوئی نگاہوں سے ماحول کو دیکھا۔ مصور کو دیکھا۔ جیسے سب کچھ بھول گیا ہو۔ چند لمحات یہی کیفیت رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی۔

”تصویر تیار ہے۔“ مصور نے بتایا۔

”کہاں ہے وہ کہاں۔“ وہ صوفے سے اٹھ کر بورڈ کی طرف لپکا اور بورڈ کے سامنے پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ اس نے تصویر دیکھی اور اس کی آنکھوں میں جنون ابھر آیا۔ اس نے خوفناک سرخ سرخ آنکھوں سے مصور کو دیکھا اور غراتے ہوئے بولا۔ ”یہ کون ہے۔“

”لگ۔“ کیا یہ آپ کے تخیل سے ملتی جلتی نہیں ہے۔“ مصور نے گھبرا کر پوچھا۔ اور سلطان کی آنکھیں ابل پڑیں۔

”یہ یہ میری تصویر کی توہین ہے بولو۔ تمہیں یہ مذاق کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔ تم نے اس کے چہرے کو یہ نقوش کیوں بنائے۔ میں اسے ساہا سال سے بنا رہا ہوں میں اس تخیل کو حقیقت نہیں دے سکا تو تم نے یہ کوشش کیوں کی۔ جواب دو مصور۔ ورنہ تم اس کمرے سے زندہ نہیں جاسکتے۔“ سلطان نے کوٹ کی جیب سے پستول نکال لیا۔ اور مصور کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

”اگر۔“ اگر یہ آپ کو پسند نہیں ہے تو۔ ت۔ تو۔“ تم نے اس چہرے کی توہین کیوں کی ہے۔ جواب دو ورنہ۔“ دوسرے لمحے پستول سے گولی نکلی۔ اور مصور کے کان کے قریب سے بھل گئی۔ مصور کی دل خراش چیخ گونج اٹھی اور دوسرے لمحے وہ دروازہ کھول کر بھاگا۔

”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑو گا۔ میں تجھ اس مذاق کی سزا ضرور دوں گا۔“ سلطان نے اس پر دوسرا فائر کر دیا۔ لیکن مصور کی قسمت اچھی تھی کہ یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ

”لائنوں میں پختگی ہے رنگ بھی خوب ہیں۔ کیا آپ کے تخیل میں اس کے نقوش موجود ہیں۔“

ہاں مصور میں اسے جانتا ہوں میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں لیکن یہ ناکارہ ہاتھ۔ یہ ہاتھ بے بس ہیں۔ وہ اسے نقوش نہیں دے سکتے۔ میں سینکڑوں بار یہ چہرہ بنایا۔ اس کے نقوش اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ لیکن میں انہیں کینوس پر اتارنے میں ناکام ہوں تم انہیں مکمل کرو۔ میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ سلطان نے کہا۔

”میں کوشش کروں گا۔ میں کوشش کروں گا جناب۔ براہ کرم آپ میری مدد کریں۔“

”میں تیار ہوں۔“

”کیا اس کی پیشانی کشادہ ہے۔“

”چاند کی طرح۔“

”کیا اس کی آنکھیں سیاہ ہیں۔“

”شب دبجور کی مانند۔“ سلطان نے والہیت سے جواب دیا۔

”کیا اس کی ناک ستواں ہے۔“

”تلوار جیسی۔“

”کیا اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہیں۔“

”آہ انہیں گلاب کی پنکھڑیوں سے تشبیہ دے کر ان کی توہین نہ کرو۔“

”کیا اس کی ٹھوڑی بیضی ہے۔“

”چاہ زرخداں کی طرح۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ مصور نے کہا اور اینزل اٹھالیا۔

”شکریہ مصور کاش یہ تصویر تم مکمل کر سکو۔ کاش۔ کاش۔ سلطان نے کہا اور تھکے تھکے قدموں سے ایک صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے صوفے میں گر کر آنکھیں بند کر لیں۔ مصور کا برش چہرے کے خدوخال ترتیب دینے لگا۔ وہ اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر رہا تھا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کینوس پر ایک حسین چہرہ ابھر آیا۔ ایک نوزیر ارمانوں

نکل آئے۔“

”پستول کہاں سے مل گیا ہے۔ کس پر گولی چلا رہا تھا۔؟“ ناظم علی نے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ سلطان صاحب کے بارے میں معلوم کرتا ہوا آیا تھا ہاتھ میں اخبار کا تراشہ تھا۔ کتنا تھا سلطان صاحب سے ملتا ہے۔“

”اوہ کوئی مصور تھا بے چارہ۔ پھر کسی مصور کی شامت آئی ہوگی ارے جاؤ باہر دیکھو گولی تو نہیں لگ گئی۔ جاؤ۔“ ناظم علی دھاڑے اور ملازم باہر دوڑ گئے۔ لیکن مصور تو کمپاؤنڈ کا گیٹ پھلانگ کر بھاگ گیا تھا۔ چوکیدار نے یہی بتایا۔ اور ملازموں نے یہ خبر ناظم علی تک پہنچادی۔“ ناظم علی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”عاجز ہوں۔ مگر کیا کروں۔“ بتاؤ بیگم کیا کروں۔ کیسے اس کے جنون کا علاج کروں۔ خدایا۔ تو نے مجھے یہ دکھ کیوں دے دیا۔ اکلوتا بیٹا لیکن دیوانہ۔“ ناظم علی درد بھری آواز میں بولے۔ بیگم ناظم علی کی آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے تھے۔ وہ کچھ نہ بول سکیں۔ پورے چھ سال سے وہ اس مصیبت میں گرفتار تھے۔ بائیس سال کی عمر تک سلطان ایک ہونمار نوجوان تھا۔ خوش شکل پر مذاق اور ذہین نوجوان جس نے ہر امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ لیکن ایک رات — ایک رات تقریباً تین بجے وہ اچانک اپنے کمرے سے نکل آیا وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ نہ جانے کیا بک رہا تھا۔ گھر والے بدحواس ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تین دن تک سلطان کی حالت مجنوںوں کی سی رہی۔ اس دوران نہ جانے کیا کیا ہو گیا۔ ناظم علی نے کہاں کہاں سے ڈاکٹروں کو نہ بلوایا۔ کون کون سے علاج نہ کرائے۔ دولت لٹائی جاری تھی تجوریاں کھول دی گئی تھیں لیکن ڈاکٹر تمام تر تحقیق کے باوجود اس اچانک دورے کا سراغ نہ لگا سکتے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ چوتھے دن سلطان خود بخود پرسکون ہو گیا۔ وہ ہوش مندی کی گفتگو کرنے لگا اور والدین نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن وہ تین دن اتنا نہ تھے سلطان میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی۔ ہمیشہ کا خوش مذاق انسان بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا اس کے دوست اس سے ملنے کے لئے پکراتے رہتے۔ لیکن وہ کسی سے نہ ملتا۔ ہر وقت کھویا کھویا

تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ اور سلطان نے اس پر تیسرا فائر کر دیا۔ نیچے موجود ملازموں میں بھگدڑ مچ گئی تھی سب ادھر ادھر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ مصور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ سلطان پستول ہاتھ میں لئے نیچے اتر آیا۔ فائروں کی آواز ناظم علی نے بھی سن لی تھی۔ وہ اپنی بیگم سے گفتگو کر رہے تھے۔ فائر کی آواز سنتے ہی ہال کی طرف دوڑے جب وہ ہال میں پہنچے تو سلطان پستول ہاتھ میں لیے آخری سیڑھی پر کھڑا تھا۔ اور اس کے چہرے پر خوفناک تاثرات تھے۔ ناظم علی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ آج پھر سلطان پر دورہ پڑ گیا تھا۔

بیگم بیگم اسے سنبھالو اسے سنبھالو۔“ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔ اور بیگم ناظم علی ہانپتی ہانپتی سلطان کی طرف بڑھیں۔

”سلطان سلطان بیٹے پستول پھینک دو میرے لال۔ پستول پھینک دو۔“

”وہ نکل گیا۔ امی وہ نکل گیا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پورے شہر میں تلاش کروں گا اسے اور گولی مار دوں گا۔“ سلطان نے وحشیانہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت بائیں سمت سے سارہ دوڑی ہوئی آئی اور صورت حال دیکھ کر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ کر سلطان کے قریب پہنچ گئی۔ سلطان نے اسے دیکھا۔ اور دیکھتا رہا۔

”تیری آنکھیں سارہ۔ کاش تیری آنکھیں مجھے مل جائیں۔ کاش سارہ۔ یہ آنکھیں۔ یہ آنکھیں نہ جانے کیا ہیں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ اور سارہ نے اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا پورے گھر میں وہی ایک ہستی تھی جو سلطان پر قابو پالیتی تھی۔ سلطان اس کی آنکھوں سے مصور ہو جاتا تھا۔“

”آئیے سلطان صاحب۔“ سارہ نے سلطان کی نگاہوں سے محبوب ہوتے ہوئے کہا۔ اور سلطان کا ہاتھ پکڑ کر اوپر لے گئی۔ ناظم علی اور بیگم ناظم علی کے چہرے پر درد ابھر آیا۔ پھر ناظم علی نے رندھی آواز میں ملازموں کو پکارا۔

”ارے باہر نکل آؤ کم بختو۔“ کوئی زخمی تو نہیں ہوا کوئی ہلاک تو نہیں ہوا۔“ ملازم دیکھ چکے تھے کہ پستول اب سلطان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس لئے وہ سسے ہوئے باہر

رہتا۔ اور تقریباً ایک ماہ کے بعد اسے اچانک پھر دورہ پڑ گیا۔ وہ دورے کے عالم میں کارے کر نکل گیا۔ اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ پولیس نے دوسرے دن اسے ایک پارک میں بیچ پر سوتے ہوئے پکڑا تھا۔ وہ معصوم بچوں کے سے انداز میں تھک کر سو گیا تھا۔ اور اس کی حالت پھر نارمل ہو گئی۔ وہ خود اپنے دورے سے پریشان تھا۔ کئی بار اس نے والدین نے شرمندگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ پھر ایک دن وہ بازار سے مصوری کا سامان خرید لایا۔ اور اس دن سے وہ مستحق اپنے کمرے میں بند ہو گیا اب تو اس کا کھانا ناشتہ وغیرہ بھی کمرے میں جاتا تھا۔ وہ تصویریں بنا رہا تھا۔ نہ جانے کیسی تصویریں۔

ایک صبح ایک ملازمہ اس کے لئے ناشتہ لے کر گئی تو اس کی حالت دیکھ کر ڈر گئی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں لباس تار تار تھا بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے سامنے کیونے پر رنگ بہہ رہے تھے ایسا لگتا تھا جیسے اس نے جھنجھلا کر کسی تصویر کو خراب کر دیا ہو پھر اس نے ملازمہ کی گردن پکڑی اور اس سے پوچھا کہ وہ کیوں آئی ہے اس نے ملازمہ سے کہا کہ وہ کب تک اس تصویر کے خدوخال تراشنے میں ناکام رہے گا بمشکل ملازمہ جان بچا سکی۔ لیکن سلطان نے اسے زخمی کر دیا تھا۔

اور پھر وقفے وقفے سے اس پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ ان وقفوں کی مدت روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ ناظم علی نے ایک بہت بڑے ماہر نفسیات کو اسے دکھایا۔ اور ماہر نفسیات نے پہلے تصویروں کے نقش و نگار چہرے دیکھے پھر سلطان سے چند سوالات کئے لیکن سوالات کے دوران اسے دورہ پڑ گیا۔ نتیجے میں ماہر نفسیات کا سر پھٹ گیا اور اسے یہیں کوٹھی میں ڈاکٹر سے بینڈیج کرانی پڑی۔ اگر معاملہ ناظم علی کا نہ ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا ایک بھاری رقم لینے کے بعد ماہر نفسیات نے مشورہ دیا کہ چونکہ سلطان کی ادھوری تصویریں کسی دلہن کی ہوتی ہیں جس کے خدوخال وہ نہیں بنا سکتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذہن میں دلہن کا تصور ہے۔ اگر اس کی شادی کر دی جائے تو شاید وہ سنبھل جائے۔

لیکن ناظم علی اس سے متفق نہ تھے۔ کون دیوانہ سلطان کو اپنی بیٹی دینے پر تیار ہوتا اور پھر کیا ضمانت تھی کہ سلطان ٹھیک ہو جاتا خواہ مخواہ کسی لڑکی کی زندگی برباد کرنے سے کیا

فائدہ۔ بہر حال علاج ہو رہا تھا لیکن کوئی افادہ نہ تھا اور پھر ایک دن سلطان نے فون پر ایک اخبار کو اشتہار کر دیا جس میں کسی مصور کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی اور ایک مصور اس کے پاس پہنچ گیا۔ ٹھیک دو گھنٹے کے بعد مصور کو سیڑھیوں پر سے نیچے پھینک دیا گیا اور بے چارہ کو اسٹریچر پر ڈلوایا کر ہسپتال پہنچایا گیا۔

اور اس کے بعد اب یہ دوسرا مصور تھا جس کی زندگی ہی تھی جو بیچ گیا ورنہ سلطان نے اسے ختم کرنے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ دورے کے دوران سلطان سب کچھ بھول جاتا تھا۔ والدین تک کو نہیں پہچانتا تھا پورے گھر میں صرف ایک سائرہ تھی جو اسے دورے کے عالم میں سنہول کر سکتی تھی۔ اس کا انکشاف بھی ایک صبح ہوا جب سلطان پر دورہ پڑا تھا وہ توڑ پھوڑ کر رہا تھا کہ سائرہ اس کے سامنے آگئی۔ اور وہ مسحور ہو گیا اس نے لرزتی ہوئی آواز میں سائرہ کی آنکھوں کی تعریف کی تھی۔ اس لئے بے سہارا لڑکی کی اہمیت اس گھر میں بڑھ گئی سائرہ ناظم علی نے اسے گھر میں رکھ لیا تھا بے چاری ملازموں کی طرح کام کرتی تھی لیکن اس دن کے بعد سے اسے سلطان کی نگرانی سوئپ دی گئی اور یہ نسخہ کافی کار آمد ثابت ہوا تھا سلطان سائرہ کی آنکھوں میں گم ہو کر سب کچھ بھول جاتا۔ اور پھر سائرہ اسے تھپک تھپک کر سلا دیتی۔ وہ بچوں ہی کے سے انداز میں سو جاتا تھا۔ اس وقت بھی سائرہ ہی نے اسے کنٹرول کیا تھا ورنہ سلطان کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس میں تین گولیاں باقی تھیں۔ سائرہ سلطان کو اوپر لے گئی تھی اور اب انھیں یقین تھا کہ سلطان چند لمحات کے بعد معمول پر آجائے گا۔ نہ جانے دورے کی حالت میں سلطان سائرہ سے اس قدر متاثر کیوں ہو جاتا تھا۔ ناظم علی اور ان کی بیگم یہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ ورنہ عام حالات میں سلطان سائرہ سے متاثر نہیں تھا جب سائرہ نے اس کا کنٹرول سنبھالا تھا سلطان کے دورے لمبیل نہیں ہوتے تھے اور وہ تھوڑی دیر میں معمول پر آ جاتا تھا ورنہ پہلے یہ دورے طویل ہوتے اور گھر کے لوگ کئی کئی دن پریشان رہتے۔

”بیگم“ ناظم علی گہری سوچ سے چونک کر بولے اور ان کی بیگم سوالیہ انداز میں انھیں دیکھنے لگیں۔ میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا ہے۔ سمجھیں تم؟ ہمیں اس ماہر نفسیات کی بات یاد ہے اس نے کہا تھا کہ اگر سلطان کی شادی کر دی جائے تو وہ معمول پر آ

سکتا ہے۔ درحقیقت اس کی بات سے مجھے اس وقت بھی اختلاف نہیں تھا لیکن میں سوچتا تھا کہ میرے دیوانے بیٹے سے کون شادی کرے گا۔ میں کسی کو دھوکہ دینے کا قائل نہیں ہوں۔ چنانچہ میں خاموش ہو گیا تھا لیکن اب ایک نیا خیال میرے ذہن میں جاگا ہے۔ کیا ہم اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے اپنے تصورات کی قربانی نہیں دے سکتے؟“

”میں سمجھ نہیں۔“ بیگم ناظم علی نے کہا۔

”سازہ گھر کی بچی ہے۔ خاندان ایک ہے اور پھر لاوارث ہے فطرتاً جیسی ہے ہمارے سامنے ہے۔ کیوں نہ ہم سلطان کی شادی اس سے کر دیں دورے کی حالت میں صرف وہ سلطان کو سنبھال سکتی ہے۔ ممکن ہے اس کے پیوی بننے کے بعد سلطان بالکل ٹھیک ہو جائے ایک نیک کام بھی ہوگا اور ہمارے بچے کی زندگی بھی بچ جائے گی میرے خیال میں اس سے بہتر ترکیب اور کوئی نہیں ہو سکتی بیگم۔ سازہ کو سلطان سے ہمدردی ہے وہ تیار ہو جائے گی ورنہ اور کون اس سے شادی کرے گا۔“

بیگم ناظم علی رونے لگیں۔ اور گلوگیر آواز میں بولیں۔ ”کیسی کیسی حسرتیں تھیں میرے دل میں اپنے بچے کی شادی کرنے کی۔ سب خاک میں مل گئیں۔“

”بیٹے کی زندگی کی خیر مانگو بیگم۔ سازہ خوبصورت بھی ہے اور نیک بھی ہے صرف اس کے پاس دولت نہیں ہے ورنہ ہم اسے خوشی خوشی بیاہ لاتے دولت کا ہمیں کیا کرنا ہے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ہے میرے خیال میں آج ہی سازہ سے بات کرو۔ بلکہ میں خود بات کر دوں گا۔ تمہاری منظوری کی ضرورت ہے۔“

”جیسا چاہے کریں۔ خدا سلطان کو صحت دے۔ بیگم ناظم علی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور ناظم علی گردن ہلانے لگے۔

اسی شام ناظم علی نے سازہ کو اپنے پاس بلایا۔ سازہ سر جھکائے ان کے سامنے آ بیٹھی۔ سلطان اب نارمل تھا۔

”ایک خاص مسئلے پر تم سے گفتگو کرنی تھی سازہ بیٹے۔“ ناظم علی بھرائی ہوئی آواز میں بولے اور سازہ معصوم آنکھوں سے انھیں دیکھنے لگی۔ ”ہماری بد نصیبی سے تم اچھی طرح واقف ہو بیٹی۔ اکلوتا بیٹا پاگل ہے اس سے بڑی بد قسمتی اور کیا ہوگا۔ اس دن ماہر

نفسیات نے بتایا تھا کہ اس کی شادی کر دی جائے تو وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ لیکن اس حالت میں میں کس منہ سے کسی کو اپنے بیٹے کی شادی کا پیغام دے سکتا ہوں اور کون اس پر تیار ہوگا۔ اگر اس کی شادی نہ ہوئی تو حالات نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچیں بیٹی، ممکن ہے ہمیں خود کشی ہی کرنی پڑ جائے۔ تم ہماری اپنی ہو۔ یہ مسئلہ ہم سب کا ہے کیا تم ہماری الجھنوں میں ہمارا ہاتھ بٹا سکتی ہو؟“

”میں۔ میں آپ پر اپنی زندگی قربان کر سکتی ہوں چچا جان حکم دیں۔“ سازہ نے خلوص سے کہا۔ وہ ناظم علی کی بات نہ سمجھ سکی تھی۔

”میں چاہتا ہوں — میں چاہتا ہوں کہ — کہ ناظم علی اتنے گئے۔ پھر بولے۔“ میں چاہتا ہوں کہ سلطان کی شادی تم سے کر دوں۔“ بالآخر انھوں نے یہ مشکل مرحلہ طے کر لیا۔

سازہ بھونچکی رہ گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور پھر وہ شرم سے گلابی ہو گئی۔ لیکن ناظم علی نے اس کی آنکھوں میں مسرتوں کے دیئے جگمگاتے دیکھ لئے تھے۔ اور انھوں نے سکون کی ایک گہری سانس لی اور بولے۔

”بے شک تم سے یہ بات کرنا میرا کام نہیں تھا بیٹی۔ لیکن مجبوریاں انسان سے سب کچھ کرا لیتی ہیں۔ میں جانتا ہوں تم نیک لڑکی ہو۔ اور بچیاں ایسی باتوں کے جواب باپ کو نہیں دیتیں۔ لیکن بیٹے حالات۔ تم بھی ان حالات کو قبول کرو اور اپنی زبان سے سب کچھ کہہ دو۔ تاکہ میرے دل کو سکون ہو جائے کہ میں نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ تمہارا جواب ضروری ہے اور میری بچی اور ایک انسان کے ناطے سے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تمہارا جواب نفی میں ہوا تو میری نگاہوں میں تمہاری منزلت گھٹے گی نہیں کیونکہ ہر انسان اپنی زندگی کا مالک ہوتا ہے!“

”چچا جان“ لرزتی آواز میں سازہ کے منہ سے نکلا۔

صاف صاف کہو بیٹی۔

”آپ — آپ کے علاوہ میرا کون ہے چچا جان“ وہ پسینہ پسینہ ہو کر بولی۔ آپ جو کریں گے میرے حق میں ہو گا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کیف و مسرت کے نشے سے

”شعر عرض ہے۔

یوں نگاہ مجھ پہ تو ڈالی جائے گی  
جب میں دیکھوں گا ہٹا لی جائے گی  
”مطلب — سلطانے کھردرے لہجے میں کہا۔“

”چھوڑیے۔ ہم مطلبی نہیں ہیں۔ آپ ہمیں نظر انداز کریں، ترستے رہیں۔ آپ کی آنکھوں میں میرے لئے کوئی تاثر ابھرے نہ ابھرے — لیکن میری آنکھوں کو ایسے سکون ملا ہے جیسے برسوں سے آپ کی منتظر ہوں میری آنکھیں کب سے آپ کو تلاش کر رہی تھیں۔“

”نوازش ہے۔“ سلطان نے خشک لہجے میں کہا اور پھر پلٹتے ہوئے بولا۔ ”آئیے چلیں دوسرے لوگ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے اور خاص طور سے میرا دوست شوکت۔“

اونہ چھوڑیے بھی۔“ عالیہ نے اپنا وار خالی جاتے دیکھ کر جزبہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”سب اپنی تفریحات میں مگن ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے آپ سے بہت سی باتیں کی جائیں۔ اس نے سلطان کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ اور اس کی ٹائی سے کھینے لگی۔ سلطان پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر جب کوئی نظر نہ آیا تو اس نے ہلکتا تسلیم کر لی۔ لیکن جب وہ کنج سے باہر نکلے تو سلطان عالیہ میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ بڑی نرم و نازک سی لڑکی تھی بے حد دلکش۔

”اور پھر وہ روزانہ کلب جانے لگا اب شوکت بھی اس کے ساتھ نہ ہوتا۔ عالیہ اور سلطان کے رومان کے قصے کلب کی زینت بن گئے دونوں ساتھ ساتھ دیکھے جاتے۔ اب تو عالیہ دن میں بھی ناظم علی کی کوٹھی پر آنے لگی۔ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی اس لئے وہاں بھی اس کی پذیرائی ہوتی۔ ناظم علی نے بھی سارہ کو بھلا کر خود کو سنبھال لیا تھا سب سے زیادہ خوشی کی بات تھی کہ پورے چار ماہ گزر چکے تھے اور اس کے بعد سے سلطان پر کبھی دورہ نہ پڑا تھا۔ اب تو کبھی کبھی بیگم ناظم علی دبی آواز میں کہہ دیتی تھیں کہ سلطان کے پاگل پن کی وجہ سارہ رہی تھی۔ اور اس طرح مظلوم سارہ کی قربانی بھی ایک الزام بن

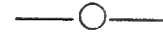
سرشار باہر نکل گئی۔“

نہایت سادگی سے سلطان کا نکاح سارہ کے ساتھ کر دیا گیا سلطان حیرت انگیز طور سے خاموش تھا۔ حالانکہ ناظم علی کا خیال تھا چونکہ وہ اب صحیح کیفیت میں ہے اس لئے ممکن ہے اس شادی پر تردید ناپسندیدگی کا اظہار کرے۔ لیکن سلطان نے حیرت انگیز طور پر خاموشی اختیار کی تھی۔ سارہ جگہ عروسی میں پہنچ گئی۔ تقدیر نے اسے بہت بڑا اعزاز بخشا تھا۔ پھر سلطان دولہا بنا اس کے پاس آگیا۔ اس نے سارہ کو دیکھا۔ دیکھتا رہا پھر بولا:

کیا تم میری ادھوری تصویر ہو تمہاری آنکھیں۔ آہ تمہاری آنکھیں آؤ میرے ساتھ آؤ تمہارے نقش ہیں جو میری آنکھوں میں ہیں آؤ اور وہ اسے اپنے نگار خانے میں لے گیا۔ سارہ پہلے بھی یہاں آچکی تھی۔ اس نے یہ نگار خانہ دیکھا تھا۔ وہ ادھوری تصویریں دیکھی تھیں۔ کس چہرے کا فریم خالی ہوتا تھا اس وقت بھی کینوس پر ایسی ہی ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔

”یہ نقش مکمل کردو۔ آہ۔ یہ نقش تمہارے نہیں ہیں۔“ آنکھیں — بال آنکھیں، صرف آنکھیں اگر یہ آنکھیں میں اس فریم میں رکھ دوں تو شاید اس کے بقیہ نقوش بھی مکمل ہو جائیں یہ آنکھیں دے سکتی ہو ستارہ یہ آنکھیں چاہئیں۔ اور شاید میری ہو یہ ہونی چاہیے۔

سارہ کی بھیانک چیخیں پہلے وفادار ساتھی خادم اور دوست شوکت نے سنی تھیں۔ ناظم علی اور دوسرے لوگ جب نگار خانے میں داخل ہوئے تو سارہ دم توڑ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو خون نما غار نظر آرہے تھے۔ سلطان سر پکڑے بیٹھا تھا۔ خون آلود خنجر اور گوشت کے دو لوٹھڑے قریب ہی پڑے ہوئے تھے۔ میرے خدا ناظم علی نے گرنے سے بچنے کے لئے دیوار کا سہارا لیا تھا۔



عالیہ فرزند علی نے کئی بار پسندیدہ نگاہوں سے سلطان کو دیکھا تھا۔ یہ کھویا کھویا نوجوان اسے بے حد پسند تھا۔ اکثر کلب آجایا کرتا تھا اور عالیہ کو علم ہو چکا تھا کہ وہ ایک رئیس ناظم علی کا بیٹا ہے۔ اس شام اس نے سلطان کو پکڑ ہی لیا۔

بے دھڑک اپنے بچے کی وکالت کر دی۔“

”ہم کسی مناسب وقت پر آپ کے پاس حاضر ہوں گے فرزند بھائی۔“ ناظم علی نے مداخلت کی۔

”ضرور ضرور“ فرزند علی نے کہا۔ اور پھر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ بیگم ناظم علی بہت خوش تھیں۔ لیکن ناظم صاحب بدستور گہری سوچ میں مبتلا تھے۔ اس سے اچھی بات اور کون سی ہو سکتی ہے۔ عالیہ خوبصورت ہے۔ اعلیٰ خاندان کی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سلطان اسے پسند کرتا ہے۔ آپ نے پھر یہ بات کیوں ٹال دی۔ ابھی ہاں کر لیتے۔ بات چکی ہو جاتی۔“

”میں بہت کچھ سوچ رہا ہوں بیگم۔ یہ درست ہے کہ سلطان اور عالیہ ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی معیت میں خوش نظر آتے ہیں لیکن کیا کروں۔ مظلوم سارہ کی تصویر میری نگاہوں میں آ جاتی ہے۔!“

”بس اب زبان نہ کھلوائے۔ میں تو صرف ایک بات جانتی ہوں۔ جب سے سارہ۔ ہمارے درمیان نہیں ہے سلطان پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ دیکھتے نہیں کیسی اچھی صحت ہو گئی ہے۔ اور پھر اب اس کا تذکرہ کیا۔ سلطان ٹھیک ہے۔ شادی تو اس کی کرنی ہے میں تو کہتی ہوں اگر عالیہ سے اس کی شادی نہ ہوئی تو خدا نخواستہ اس پر پھر دورے نہ پڑنے لگیں۔“

نہیں نہیں۔ ایسا نہ کہو۔ ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی ہو کرو۔“ ناظم صاحب گھبرا کر بولے۔ اکلوتے بیٹے کی بیماری نے ان کا دل بہت کمزور کر دیا تھا۔ چنانچہ ایک شام ناظم علی اور ان کی بیگم فرزند علی کے ہاں پہنچ گئے۔ اور انہیں باقاعدہ عالیہ کے لئے سلطان کا پیغام دیا۔ جسے منظور نہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا۔“

شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی اور تیاریاں شروع ہو گئیں اور پھر ایک شام سلطان دولہا بن کر عالیہ کے گھر پہنچ گیا وہ بالکل پرسکون تھا اور خوش نظر آ رہا تھا۔ نکاح ہوا۔ دلہن رخصت ہو کر گھر آگئی ماڈرن لوگ تھے لیکن شادی شریفانہ انداز میں ہی ہوئی تھی۔ ضروری رسموں کے بعد جب سلطان کو فراغت ملی تو وہ جلد عروسی کی طرف چل پڑا اس کے دل میں انجانی مسرتیں کوٹھیں بدل رہی تھیں۔ عالیہ کا حسین چہرہ اس کی نگاہوں کے

گئی۔

وقت گزر گیا۔ اور پھر ایک شام فرزند علی اپنی بیگم کے ساتھ ناظم علی سے ملاقات کرنے آئے۔ ناظم علی اور ان کی بیگم نے ان استقبال کیا تھا۔ ”کاروباری سلسلوں میں تو ہماری ملاقاتیں ہوتی ہی رہتی ہیں ناظم علی۔ نہ تم میرے لئے اجنبی ہو اور نہ میں تمہارے لئے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ذاتی طور پر بھی تم سے راہ و رسم بڑھائی جائے۔ فرزند علی بے تکلفی سے بولے۔

”بڑی مسرت ہوئی فرزند علی صاحب۔ آپ کی نوازش کا شکر گزار ہوں۔“ ناظم علی نے کہا۔

”زمانہ بدل گیا بھی۔ پہلے بزرگ بچوں کے تعلقات کے ذمہ دار ہوتے تھے لیکن جدید دور کے بچے بعض اوقات بزرگوں کی ملاقات کا سبب بن جاتے ہیں۔“ فرزند علی صاحب بڑی خوبصورتی سے اور بہت کم وقت میں موضوع پر آگئے تھے۔ ”میری مراد اپنی بچی عالیہ سے ہے نہ جانے آپ لوگوں نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے۔ اور وہ جو کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی اب دن رات آپ لوگوں کے گن گاتی ہے۔ ہر وقت آپ کے گھر کا تذکرہ۔ ہر وقت آپ کے حسن اخلاق کے گیت۔ میں نے سوچا میں بھی تو چلوں۔ دیکھوں میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔

ناظم علی ہنسنے لگے۔ اور بیگم ناظم علی جلدی سے بولیں۔

عالیہ ہے بڑی پیاری بچی۔ میرے کوئی لڑکی نہیں ہے فرزند بھائی اس لئے اس سے محبت قدرتی امر ہے۔“

ہاں بھی کاش ہم بھی کوئی لڑکی ہوتے۔ ایسا کریں بھابی آپ لڑکے اور لڑکی کا تبادلہ کر لیں۔ یعنی عالیہ کو آپ لے لیں اور سلطان میاں کو مجھے دے دیں۔ کیا خیال ہے۔“

بڑی واضح بات تھی بیگم ناظم علی کا تو چہرہ کھل اٹھا۔ لیکن ناظم علی کے چہرے پر تردد کے سائے لہرانے لگے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ ”دل کی بات کہہ دی بھائی جان۔ یہ بات تو ہمیں کہنی چاہیے تھی۔“ بیگم ناظم علی بولیں۔

”بھئی اپنائیت تو یہی ہوتی ہے۔ میں تو سلطان کو اپنا بچہ سمجھتا ہوں اس لئے میں نے



تم — تم کون ہو — وہ — وہ کہاں ہے۔

”کون“ عالیہ نے بدستور حیرت سے کہا

”تم — تم مجھے دھوکہ دینے آئی ہو۔ تم — تم اس کی جگہ لینا چاہتی ہو۔ لیکن تمہارا چہرہ — تمہارا چہرہ بتاؤ وہ کہاں گئی۔“ سلطان نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر جھنجھوڑا لے۔

”سلطان — سلطان کیا ہو گیا تمہیں۔“ عالیہ بستر سے نیچے اتر آئی۔ دھوکہ — بھاگ رہے ہو مصور — تم میری تصویر کے خدوخال ترتیب نہیں دے سکے۔ تم نے اسے کیا بنا دیا۔ لیکن میں یہ مذاق برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میرا تخیل مجھے دے دو — ورنہ — ورنہ۔“ اس نے دانت کچکچا کر عالیہ کی گردن پکڑ لی۔

سلطان — سل — طا — عالیہ کی آواز بھینچنے لگی۔ وہ خود کو سلطان کی گرفت سے چھڑانے کی خوفناک جدوجہد کر رہی تھی لیکن سلطان کے پنجے آہنی شکنجے تھے جن سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

نکل نہ سکو گے۔ بچ نہ سکو گے۔ تم نے میری تصویر کا مذاق اڑایا تھا۔ میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔ سلطان نے انگلیوں کی گرفت سخت کردی اور عالیہ کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ اس کا سانس رک گیا اور سلطان اس وقت تک اس کی گردن دبا تا رہا جب تک اس نے تڑپ تڑپ کر جان نہ دے دی۔ تب اس نے عالیہ کے مردہ جسم کو چھوڑ دیا سب دھوکے باز ہیں۔ یہ مصور نہیں بہروپے ہیں۔ میری تصویر کہاں ہے — میری دلہن کہاں ہے — میں اسے اپنا تصور دینا چاہتا ہوں — کہاں ہے میرا تخیل — کہاں ہو تم — اس نے گلا پھاڑ کر کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ”میرا تخیل چرانے والا اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ۔ مجھ سے یہ اذیت ناک مذاق نہ کر دو۔ میری روح مجھے واپس کر دو“ وہ دیوانوں کی طرح چیخنے لگا کوٹھی میں موجود لوگوں نے اس کی یہ وحشیانہ چیخیں سنیں — ناظم علی صاحب حواس باختہ ہو گئے۔ بیگم ناظم علی ننگے پاؤں دوڑیں۔ دوسرے لوگ بھی دوڑ پڑے۔ انہوں نے دوڑ کر سلطان کو پکڑ لیا بیگم ناظم علی نے ستون کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے روکا تھا۔ ناظم علی بھی سینہ تھامے کھڑے تھے۔

سامنے تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازے میں قدم رکھا۔ سامنے ہی پھولوں کی بیچ پر عالیہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ سلطان کی نگاہ اس سمٹی ہوئی گزیا پر پڑی۔ تو اچانک اس کا سر بہت زور سے پھرایا۔ اس کے ذہن میں انجانے سائے ریگنے لگے۔ بمشکل تمام اس نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے روکا۔ لیکن۔ آنکھوں کے سامنے تاریک لہریے رقص کر رہے تھے۔ اور پھر یہ تاریکی منور ہونے لگی۔ اس روشنی میں اسے کچھ مٹے مٹے خدوخال نظر آئے۔ ایک سمٹا سٹرا شرمایا ہوا سا چہرہ۔ سوگوار آنکھیں۔ خشک ہونٹ۔ پھر سوگوار آنکھوں نے اسے دیکھا۔ اور ان کی اداسی دور ہو گئی۔ خشک ہونٹوں پر تازگی دوڑ گئی اور وہ مسکرانے لگے۔ اور پھر سیاہ گھٹاؤں کے درمیان سرخ دھنک بکھر گئی یہ کسی مانگ کا سندور تھا۔ رنگین اوڑھنی لہرانے لگی یہ اس کا تصور تھا۔ ہاں یہی تو وہ چہرہ تھا جو اس کی روح میں جاگزیں تھا۔ یہی تو اس کی دلہن تھی۔ یہی تو تھی جسے وہ چاہتا تھا اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور اس چہرے کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن اسکے ہاتھ خلا میں جھول گئے تب اس کی نگاہ مسہری پر بیٹھی دلہن پر پڑی اور اس کا دل مسرت سے لرزنے لگا وہ سحر زدہ کے سے انداز میں آگے بڑھا اور عالیہ کے قریب پہنچ گیا — اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے عالیہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور عالیہ اس کے قریب کھسک آئی۔ سلطان نے شدت جذبات سے اسے اور قریب کر لیا اور پھر اس نے آہستہ سے عالیہ کا گھونگھٹ سر کاہا۔ اس کے پیاسے ہونٹ عالیہ کے ہونٹوں کی طرف بڑھے۔

اور دفعتاً ”ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کو بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس کی آنکھیں خوف ناک انداز میں پھیل گئیں۔ ہونٹ سکڑ گئے اور ان ہونٹوں سے ایک غیر انسانی سی آواز نکلی۔

”تم کون ہو؟“

عالیہ چونک پڑی۔ وہ اس مذاق کو نہ سمجھ سکی تھی اس نے حیران نگاہوں سے سلطان کے چہرے کو دیکھا لیکن اس کی آنکھوں کی وحشت بگڑے ہوئے خدوخال دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔

کیا بات ہے سلطان۔“ اس نے گہرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

اسے صحیح تفصیل بتائی لیکن وہ سلطان کی ہر کیفیت کے لئے تیار تھا۔ سلطان کے چہرے پر گہرے رنج کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ تو عالیہ بھی مر گئی۔ میں کیا کروں شوکت۔ بتاؤ میں کیا کرو۔ تم مجھے کیوں لے آئے مرجانے دیا ہوتا۔ موت ہی اب میرا علاج کر سکے گی۔“

”میں تمہارا خادم ہوں سلطان۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا کاش اگر میں تمہارا دوست ہوتا تم سے اس جنون کی حقیقت پوچھتا۔“

”شوکت میں — میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا دوست تصور کیا ہے لیکن میں خود نہیں جانتا کہ میں کیا چاہتا ہوں میں کچھ بھول گیا ہوں شوکت میری کوئی چیز گم ہو گئی ہے مجھے یاد نہیں آتا کہ میں کیا کھو بیٹھا ہوں ہاں شوکت وہ ایک چہرہ ہے ایک دلہن کا چہرہ اس کی شاکی آنکھیں مجھے خود سے بیگانہ کر دیتی ہیں اور مجھے اس کے روپ میں کوئی اور پسند نہیں آتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس چہرے کا سروپ بھرنے والوں کو فنا کر دوں اور — اور — آہ — کاش عالیہ قتل نہ ہوتی مجھے واپس جانے دو شوکت میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا اور پھر مجھے موت کی سزا مل جائے گی۔ شاید موت ہی میرے جنون کی دوا بن جائے۔ سلطان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور شوکت نے کار روک دی۔“

خود کو سنبھالو سلطان خدا تمہیں سکون دے۔“ بمشکل تمام وہ سلطان کو سمجھانے میں کامیاب ہو سکا۔ سلطان کی حالت اب بالکل درست تھی اور شوکت گہری سوچ میں تھا۔ اس نے سلطان سے کہا۔

سلطان پولیس ضرور ہمیں تلاش کرے گی۔ کار کے نمبروں سے ہمیں پہچانا جاسکتا ہے میرا خیال ہے ہمیں کار چھوڑ دینا چاہیے۔ میں اسے کسی پہاڑی سے گرا کر تباہ کر دیتا ہوں۔ تاکہ اگر پولیس اسے تلاش بھی کر لے تو یہی سمجھے کہ ہم مر چکے ہیں۔

”میں زندہ نہیں رہنا چاہتا شوکت زندگی میرے لئے ایک بوجھ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تاہم میرے دوست جو چاہو کرو میں تمہارے معاملات میں دخل نہ دوں گا۔“

چنانچہ کار کو ایک اونچے مقام سے گرا کر تباہ کر دیا گیا۔ اور وہ لوگ پیدل چل پڑے۔ شوکت دل و جان سے سلطان کی مدد کر رہا تھا وہ پیدل سفر کرتے رہے۔ بہت سی

سلطان صاحب — ہوش میں آئیے سلطان صاحب — کیا بات ہے کیا ہو گیا۔“ شوکت نے سلطان کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”تصویر ابھی تک نامکمل ہے شوکت۔ میں اسے مکمل کرنا چاہتا ہوں مجھے کسی مصور کی تلاش ہے۔ لیکن سب دھوکے باز آتے ہیں کوئی میری تصویر مکمل نہیں کرتا۔!“

سلطان نے درد بھرے لہجے میں کہا اسی وقت دلہن کی خواب گاہ سے چینی بلند ہوئیں — یہ ملازماؤں کی چینی تھیں جنہوں نے عالیہ فرزند علی کی لاش دیکھ لی تھی۔ ایک بار پھر پورے گھر میں کھرام مچ گیا۔ بیگم ناظم علی کو غش پر غش آنے لگے۔ ناظم علی کو سکتے ہو گیا۔ رہا سلطان تو وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہ رہا تھا لیکن وفادار شوکت کو اپنے فرائض کا احساس تھا وہ تعلیم یافتہ نوجوان تھا اور اس موقع کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ بے زبان اور لاوارث سارہ کی دوسری بات تھی اس کا بولنے والا کوئی نہ تھا اس لئے بات دب گئی تھی لیکن عالیہ — فرزند علی، سلطان کو سزا دلوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔ یوں بھی وہ ریٹائرڈ کرٹل تھا اور حکومت میں اس کے وسیع تعلقات تھے۔ اور پھر قیسمت! سارہ کا کیس بھی ابھر سکتا تھا اور سلطان اس دوہرے قتل سے نہ بچ سکے گا۔

چنانچہ اس کے ذہن میں ایک ہی ترکیب آئی۔ اس نے سلطان کو بے ہوش کیا۔ اور دوسروں کی نگاہوں سے بچا کر کار تک لے گیا۔ اسے کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر شوکت نے کار اشارت کی اور چل پڑا — کسی نامعلوم منزل کی طرف ایک پٹرول پمپ سے اس نے کار کی ٹنکی بھر والی تھی اور فالتو پٹرول بھی لے لیا تھا۔ آن کی آن میں وہ شہر سے نکل گیا۔ سلطان کی زندگی بچانے کے لئے اب یہی مناسب تھا کہ اسے کسی ایسے دور دراز علاقے میں لے جا کر رکھے جہاں پولیس اس تک نہ پہنچ سکے۔ وفادار خادم اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ جب کبھی حالات بہتر ہو جائیں گے تو وہ سلطان کو اس کے والدین سے ملا دے گا۔

کار رات بھر سفر کرتی رہی۔ شوکت نے ایسے راستے اختیار کئے تھے جن سے ان کی فرار کی سمت کا کوئی اندازہ نہ ہو سکے۔ صبح کے وقت سلطان کو ہوش آگیا تھا۔ اب وہ نارمل تھا اس نے حیرت زدہ لہجے میں شوکت سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ تب شوکت نے

صعوبتیں تھیں جو قدم قدم پر ان کی منتظر تھیں۔ ناز و نعم میں پلا ہوا سلطان صعوبتوں سے لاپرواہ شوکت کا ساتھ دے رہا تھا۔ بالآخر تین دن جنگوں میں سفر کرنے کے بعد وہ ایک ایسے علاقے میں جانکے۔ جہاں کھیت لہلہا رہے تھے۔

شوکت کھیت دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ضرور کوئی قریب ہی بستی ہے۔“ اس نے کہا۔

”اے ہاں“ سلطان کھوئے کھوئے انداز میں بولا اس کا نام راون پور ہے۔

ظالموں کی بستی ہے یہ۔“

”کیا مطلب کیا تم پہلے کبھی ادھر آئے ہو؟“ شوکت نے چونک کر پوچھا اور سلطان

بھی چونک پڑا۔

”کیا کہا تم نے؟“

”تم پہلے کبھی ادھر آئے ہو سلطان۔؟“

”پہلے نہیں کبھی نہیں لیکن یہ کھیت ان کھیتوں کے اختتام پر ایک بوڑھا برگد ہے

جس کے نیچے کونو بابا کی قبر ہے دیکھو وہ برگد کا چوڑا تا نظر آ رہا ہے۔“ سلطان نے اشارہ کیا۔

”تمہیں کیسے معلوم سلطان۔“ شوکت حیرانی سے بولا۔

”کیا کس چیز کے بارے میں۔“ سلطان نے حیرت سے پوچھا اور پھر چونک کر چاروں

طرف دیکھنے لگا۔ شوکت پریشان پریشان نظروں سے سلطان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا

کہ شاید سلطان پر پھر دورہ پڑنے والا ہے۔

اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو سلطان آؤ بستی چل کر ہم کچھ کھائیں گے۔ بھوک لگ

رہی ہے۔“ اس نے مضبوطی سے سلطان کا ہاتھ پکڑ لیا سلطان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور

خوف زدہ بھی تھا تھوڑی دیر کے بعد وہ برگد کے درخت کے نیچے سے گزرے اور برگد کے

نیچے چونے سے بنی ہوئی ایک قبر دیکھ کر شوکت حیران ہو گیا۔

اس درخت کے دوسری طرف خنجر کی نوک سے میرا نام لکھا ہوا ہے۔“ سلطان نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارا نام“ شوکت نے منہ پھاڑ کر بولا۔ لیکن سلطان نے اس کی بات کا جواب نہ

دیا۔ نہ جانے کس خیال کے تحت شوکت رک گیا وہ برگد کے دوسری سمت پہنچا۔ اور درخت کے تنے پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ بہت غور سے دیکھنے پر اسے گوند میں ڈھکا ہوا ایک نام نظر آیا۔ یقیناً یہ نام کسی نوک دار چیز سے لکھا ہوا تھا۔ لیکن یہ سلطان کا نام نہیں تھا۔ اس نے غور سے پڑھا۔ ہندی زبان میں۔ چندن مکٹ لکھا ہوا تھا۔ چندن مکٹ اس نے زیر لب دوہرایا۔

”ہوں“ سلطان نے اس طرح جواب دیا جیسے شوکت نے اسے پکارا ہو۔

کیا مطلب۔ شوکت حیرانی سے بولا۔ لیکن سلطان کھوئی کھوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے شوکت کی موجودگی کا احساس نہ بھی ہو۔ اسی وقت شوکت کو گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ ایک بیل گاڑی قریب سے گزر رہی تھی شوکت کو سخت پیاس لگ رہی تھی اس نے بیل گاڑی والے کو آواز دی بیل گاڑی میں دو بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی چلانے والا رک گیا۔

”چاچا پینے کا پانی ہے“ شوکت نے پوچھا اور ایک بوڑھا پیتل کا برتن لئے نیچے اتر آیا۔ برتن میں شاید پانی تھا۔ وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔

”اوک سے پی لو بابو جی۔ اس نے کہا اور پھر اس کی نگاہ سلطان پر پڑی دوسرے لمحے اس کا جسم کانپنے لگا پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے گر گیا اور اس کے حلق سے ایک دہشت زدہ چیخ نکلی۔ چندنا دوسرے لمحے وہ پلٹ کر بھاگا۔ اور دوسرا گاڑی والا بھی نیچے اتر آیا۔ کیا بات ہے شکر کیا ہوا۔

”بھاگو چندن چندن“ بدحواس بوڑھے نے کہا اور دوسرے بوڑھے نے بھی غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ پھر دونوں چیخنے ہوئے بستی کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ بیل گاڑی وہیں چھوڑ گئے تھے۔ یہ کیا اسرار ہے سلطان میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا کیا یہ دونوں بوڑھے پاگل تھے۔ شوکت نے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا لیکن سلطان کا چہرہ آگ کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ سکزئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کرخنگی نظر آنے لگی اور پھر اس نے سخت آواز میں کہا۔

تم کون ہو!

پنچائت ہو رہی تھی۔ اور چودھری گوپال داس کہہ رہا تھا: بھائیو! اگر تم میری بوڑھی زبان پر اعتبار کرتے ہو اگر تمہیں یقین ہے کہ میں پاگل نہیں ہوں اگر تمہیں یقین ہو کہ میں جھوٹ نہیں بولتا تو میری بات پر وشواس کرو۔ یہ چندن مکٹ ہے اور سیتہ پال کی چھوکری ر مہا کوندنی ہے میری اس بات کی گواہی دینے کے لئے آئند مہاراج اور پرکاشی موجود ہے یہ دونوں بوڑھے بھی اس بات کی گواہی دیں گے کہ آواگون کی یہ کہانی جھوٹ نہیں ہے۔ چندن مکٹ کو حالات نے ڈاکو بنا دیا تھا لیکن پھر وہ انسان بن گیا اس نے کوندنی سے محبت کی تھی۔ اور کوندنی کے ساتھ اس کے پھیرے ہو گئے پھر عین اس وقت پولیس آگئی اور اس نے چندن مکٹ کو پکڑ لیا پھر بھائی چندن مکٹ کو پھانسی دے دی گئی تھی اور کوندنی نے زہر کھا کر ہتھیا کر لی۔ لیکن بوڑھے گوپال داس کو یقین تھا۔ ان کا پریم امر ہے — اور بھگوان نے ان کو ملا دیا۔ دھرم کا اہمان نہ کرو — ان دونوں کا ملاپ کر دو ہماری بیٹی ر مہا نہیں کوندنی ہے۔ جسے ر مہا کا دو سرا جنم لیا ہے اور چندن مکٹ کا بھی یہ دو سرا جنم ہے۔ راج زندہ ہوتا تو وہ بھی میرے بیان کی تصدیق کرتا۔

”مگر چودھری یہ کیسے ممکن ہے۔“

ر مہا کے باپ سیتہ پال نے کہا۔

سیتہ پال چندن مکٹ کو اس کی کوندنی دے دے پر میوں کی آہ لے کر تو خوش نہ رہ سکے گا۔ تیری ر مہا بھی چندن مکٹ کو پہچان گئی ہے اگر اس جنم میں وہ نہ ملے تو پھر ہتھیا کر لیں گے تاکہ تیسرے جنم میں ان کا ملاپ ہو جائے۔

”نہیں نہیں چودھری جی۔ ر مہا میری اکیلی بیٹی ہے میں میں —

بھگوان پر بھروسہ کرتیہ پال ان دونوں کے پلو باندھ دے ہمارا دھرم یہی ہے دھرم میں ناگ اڑا کر بھگوان کا مجرم مت بن۔“ چودھری گوپال داس نے لرزتی آواز میں کہا۔ اور سیتہ پال گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا اور پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا جیسی تمہاری اچھا چودھری جی۔“

”اس“ شوکت چونک پڑا۔ ”ہوش میں آؤ سلطان میں شوکت ہوں۔ تمہارا دوست تمہارا خادم۔“

”ہر لال کہاں ہے بنی کہاں ہے۔ کہاں گئے نسب۔“

”سلطان سلطان ہوش میں آؤ۔“

”میں چندن مکٹ ہوں۔ وہ دونوں بوڑھے پاگل چندنا سے خوف کھا کر بھاگ گئے۔ انہیں کیا معلوم کہ چندنا انسان بن گیا ہے اب وہ صرف چندن مکٹ ہے مگر کوندنی کوندنی کہاں ہے ہر لال“ سلطان سلطان خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔“

”تصویر مکمل ہو گئی ہر لال — اس — شوکت — ہاں شوکت آؤ میری تصویر مکمل ہو گئی ہے آؤ۔ وہ میری منتظر ہوگی۔“

سلطان تیل گاڑی کی طرف بھاگا۔ پھر وہ دونوں تیل گاڑی میں سوار ہو گئے تیل تیزی سے دوڑ رہے تھے یہ جگہ شوکت کے لئے اجنبی تھی لیکن راستوں پر گاڑی دوڑاتا رہا بیلوں کی رفتار تیز تھی اور اس وقت شام کے چار بجے تھے جب تیل گاڑی بستی میں داخل ہوئی بستی کے سرے پر رہٹ چل رہی تھی لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں سلطان نے تیل گاڑی روک دی۔

”کوندنی!“ اس نے زور سے آواز لگائی اور ایک پنہاری کی کمر سے منکا گر گیا۔ وہ تصویر کی طرح ساکت ہو گئی دوسری لڑکیاں چونک چونک کر ادھر دیکھنے لگی تھیں۔ سلطان دوڑتا ہوا پنہاری کے قریب پہنچ گیا۔

”کوندنی — میں آگیا ہوں — کوندنی میں آگیا ہوں میری دلہن — اب کوئی تجھے مجھ سے جدا نہ کر سکے گا۔“ حسین دہماتی دوشیزہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ ادھ کھلی آنکھوں سے سلطان کو دیکھ رہی تھی۔ اور پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے وہ بری طرح سلطان سے لپٹ گئی اور پنہاریاں منکے پھینک پھینک کر اپنے گھروں کی طرف دوڑ پڑیں۔“ وہ موا مردوا تو تھا ہی بے غیرت — ر مہا کو کیا ہو گیا تھا۔



گاؤں کے سب سے معمر بوڑھے اور قابل احترام چودھری گوپال داس کی چوپال پر

روپیہ ہی بھیج سکتا تھا۔ انہیں میری آفیسری سے ابھی تک کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ بڑی تشویشناک صورت حال تھی۔ ہاں اگر مکان مل جاتا تو خاصی بچت ہو سکتی تھی۔

لیکن مکان۔ یہاں قبر کے لئے تو جگہ مل سکتی تھی لیکن زندہ رہ کر رہائش کے لئے مکان نہیں مل سکتا تھا۔ اس دوران میں نے کیا کیا کوششیں نہیں کی تھیں لیکن ناکامی کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا تھا۔ رشید یہاں میرا سب سے زیادہ بے تکلف دوست تھا۔ مجھ سے ہمدردی بھی رکھتا تھا لیکن مکان کا بندوبست اس کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ وہ خود بھی دوسرے شہر سے ملازمت کرنے آیا تھا۔ اور بقول اس کے اس نے بھی کئی ماہ تک ٹھوکریں کھائیں لیکن مکان نہ مل سکا۔ تب اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اس نے اخبار میں ایک اشتہار دے دیا۔ ضرورت رشتہ کا اشتہار جس میں لنگڑی لولی کلی ذات کی دھوہن یا چمارن کیسی بھی لڑکی ہو، لیکن رہائش کا بندوبست رکھتی ہو — اور بالا آخر اس کی کوشش بار آور ہو گئی۔ اسے رہنے کے لئے جگہ مل گئی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک عدد بیوی بھی برداشت کرنی پڑی تھی۔ بہر حال سودا برانہ رہا۔ وہ ٹھٹھ سے گھر داماد بنا ہوا تھا۔ یہی مشورہ اس نے مجھے بھی دیا تھا۔ لیکن میں اس کی طرح بے فکر نہیں تھا۔ میرے والدین بھی تھے اور بہن بھائی بھی جو میری شادی کی حسرت رکھتے تھے۔ میں ان کی حسرتوں کو ایک رہائش گاہ پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے رشید کا مشورہ قبول نہیں کیا اور مکان کی تلاش جاری رکھی۔

رشید بھی میرے لئے سخت کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ناکامیاں ہم دونوں کا مقدر تھیں۔ آج بھی اس نے مجھے دفتر میں بتایا تھا کہ اسے ایک خالی مکان کی اطلاع ملی ہے۔ چنانچہ میں نے اسے دفتر سے دوپہر کو ہی چھٹی دلوا دی اور مکان کے سلسلے میں بھیج دیا۔ ہمارا شام کو اسی ہوٹل میں ملنے کا پروگرام تھا۔ اور اب مجھے رشید سے ٹھنڈی سانسوں کے علاوہ اور کچھ نہ ملا تھا۔

گرم گرم چائے ہمارے معدے جلاتی رہی اور ہم دونوں سوچ میں ڈوبے رہے۔  
”سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے؟“ بلاآخر چائے کی پیالی ختم کر کے میں نے کہا۔  
”مکان ملنا بہت مشکل ہے پیارے۔ صرف وہی ترکیب ہے۔ گھر داماد بننے کا اعلان

## خالہ جان

”پہلو رشید بھی آج تو خوشخبری سنا ہی دو۔“ میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور رشید کے ہونٹوں پر مایوسانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے ہونٹوں کے حزن یہ انداز نے مجھے حسب معمول مایوسی کی کہانی سنائی اور میں ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا ”کیا غلط اطلاع ملی تھی؟“  
”کیا بتاؤں یار۔ اطلاع تو درست تھی، لیکن دیر سے ملی۔ خان صاحب نے نسوار کی چٹکی ہونٹوں کے نیچے دباتے ہوئے کہا: ”او ختم دیر سے آیا ہائی۔ ہم آج ہی کتنی دیا۔ وہ لوگ شام تک آجائے گا!“ رشید نے ٹھنڈی سانس لے کر نقل اتارتے ہوئے کہا:

”مقدر۔“ میں نے رشید سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس بھرنے کی کوشش کی اور پھر پاؤں سکود کر کہنیاں میز کی سطح پر رکھتے ہوئے کہا ”چائے منگواؤ!“ اور رشید نے دیو آئند اشاکل میں چٹکی بجا کر چائے والے کو اشارہ کیا۔ اور اس کے آجانے پر چائے کے لئے کہہ دیا۔

ساڑھے چار ماہ ہو گئے تھے اس شہر میں آئے ہوئے لیکن ابھی تک ہوٹل میں قیام تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس عظیم الشان شہر میں میرے لئے ہوٹل کے علاوہ کوئی جگہ ہی نہ ہو، ہوٹل کا کرایہ، — اور کھانے کے اخراجات میری کمر توڑے دے رہے تھے۔ کسی گھٹیا سی سرائے قسم کے ہوٹل میں ٹھہر نہیں سکتا تھا کیونکہ پوزیشن بھی برقرار رکھنی تھی۔ سات سو تنخواہ ملتی تھی۔ دو سو روپے ہوٹل کا کرایہ معمولی پیمانے پر دو سو روپے ہی کھانے کے اخراجات اور پھر سگریٹیں اور آمدورفت کا کرایہ وغیرہ الگ۔ والدین کو مشکل سے ڈیڑھ سو

کردو۔“ رشید نے کہا

”نفول باتیں مت کرو یا ر۔ میں بہت پریشان ہوں۔“ میں نے کہا۔ اور اسی وقت مجھے اپنی پشت سے عجیب سی آواز سنائی دی۔

”میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں جناب۔!“ ہم دونوں چونک پڑے اور ہماری گردنیں ایک ساتھ گھوم گئیں۔ اس کی آواز ہی متوجہ کرنے کے لئے کافی تھی۔ اور پھر اوپر سے اس کا حلیہ! وہ خون کی طرح سرخ چہرے والا درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ چہرے پر نساواریت تھی اور یہی کیفیت آواز کی تھی۔ اگر صرف اس کی آواز سنی جاتی تو یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ یہ مرد ہے یا عورت!

”میں آپ ہی سے مخاطب ہوں۔“ اس نے شرمائے ہوئے انداز میں انگلی مروڑتے ہوئے کہا۔

”واللہ۔ نایاب چیز ہے۔“ رشید نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا اور زور سے بولا ”اسی میز پر تشریف لے آئیے جناب!“ اور وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا جسامت اور حلیہ سے معقول نظر آتا تھا لیکن اس کی زبانی آواز اور زخوں کا سا انداز حیران کن تھا۔ اور اس نے ہمارے سامنے کی کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔

”آپ کس سلسلے میں ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں؟“ رشید نے پوچھا میں اس شخص کی حیرت انگیز صحت پر غور کر رہا تھا۔

”آپ لوگوں کی گفتگو میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ شاید آپ میں سے کوئی مکان کے لئے پریشان ہے!“ اس نے بدستور شرمائے شرمائے انداز میں کہا۔ دوران گفتگو وہ اس طرح ہاتھ ملتا اور پکٹتا جیسے لڑکیاں پہلی بار کسی نوجوان سے مخاطب ہوتی ہیں۔

”میں پریشان ہوں۔ مجھے کرائے کا مکان چاہئے!“ رشید کے بجائے میں جلدی سے بول پڑا۔

”اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ شہر میں تو مکانوں کی بڑی قلت ہے اور ان کا ملنا ناممکن بھی ہے لیکن مضافات میں یہ کام ہو سکتا ہے!“

”میں نے ہر جگہ کوشش کر لی ناکام رہا۔ اگر آپ میری یہ مشکل حل کرادیں محترم۔ تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا!“ میں نے لجاجت سے کہا۔

”مکان تو ہے مگر آپ کے لئے بہت دور رہے گا۔ کیا آپ شہر میں کام کرتے ہیں؟“ ”ہاں۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ کتنی ہی دور ہو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”تب ٹھیک ہے۔ آپ کل گیارہ بجے مجھے اسی ہوٹل میں مل جائیں میں آپ کو لے چلوں گا!“ اس نے کہا۔ اور میں نے جلدی سے اس کے لئے چائے کا آرڈر دے دیا۔ ”آج ہی یہ کام نہیں ہو سکے گا محترم!“ میں نے کہا۔

”خالہ جان سے پوچھنا ضروری ہے۔ میں ان سے بات کر لوں کل تک رک جائیے کیا حرج ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔“

”خادم کو نزاکت کہتے ہیں!“ اس نے پلک کر جواب دیا اور رشید نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے بمشکل ہنسی روکی ہے۔ ویسے ہنسی مجھے بھی آئی تھی لیکن میں تو مسکرا بھی نہیں سکتا تھا۔ مبادا وہ برا مان جائے اور مکان ہاتھ سے نکل جائے۔ میں رشید پر بھی دانت پیس رہا تھا جو دوسری طرف منہ کئے بل رہا تھا، یقیناً وہ ہنس رہا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ نزاکت نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ درحقیقت بڑا موزوں نام تھا اس کا۔

”بہت بہت شکریہ نزاکت بھائی۔ کل گیارہ بجے میں آپ کو یہیں ملوں گا! آپ کی بڑی مرہانی ہوگی اگر آپ میرا یہ کام کردیں۔“

”اطمینان رکھیں۔ اطمینان رکھیں۔“ وہ چائے کو پرچ میں اندھلتے ہوئے بولا اور پھر اسے پھونک مار مار کر پینے لگا۔ پھر چائے کو ختم کرنے کے بعد اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا اب مجھے اجازت دیں۔ کل گیارہ بجے حاضر ہوں گا۔“ اور وہ ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس کی چال بھی مضحکہ خیز تھی!

اس کے دروازے سے باہر نکلتے ہی رشید نے زوردار تہققہ لگایا اور لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

کرنے لگا۔ ٹھیک گیارہ بجے وہ ہوٹل کے دروازے سے اندر داخل ہوا اور میں خوشی سے اچھل پڑا جو شخص وعدے کا اس قدر پابند ہو سکتا ہے وہ یقیناً قول کا بھی پابند ہوگا۔ میں نے نہایت گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا اور وہ سینہ پر پھونکیں مارتا ہوا میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”باہر خاصی گرمی ہے!“ اس نے کہا اور میں نے جلدی سے اس کے لئے مشروب منگوا لیا۔ میری بے چینی عروج پر تھی۔ لیکن اخلاقاً میں اسے ہی بولنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

چند منٹ تک وہ گہری سانسیں لیتا رہا۔ پھر اس نے مشروب کا ایک گھونٹ لے کر کہا ”میں نے خالہ جان سے بات کر لی ہے۔“

”اوہ۔“ میں اچھل پڑا ”کیا جواب دیا انہوں نے؟“

”خالہ جان بہت نیک فطرت خاتون ہیں۔ میں نے آپ کی پریشانی کا تذکرہ کیا تو وہ تیار ہو گئیں۔ دراصل ہمارا مکان بہت بڑا ہے خالہ جان کو ورثے میں ملا تھا۔ یہاں مکانوں کی جس قدر قلت ہے تم جانتے ہو۔ اس کے علاوہ خالہ جان یوں بھی پرانے زمانے کی اور تنہائی پسند ہیں۔ شرکی گہماگہمی سے وہ بہت گھبراتی ہیں اس لئے انہوں نے ویرانے میں رہنا پسند کیا۔ وہ بے حد پردہ نشین خاتون ہیں، مرد تو کجا عورتوں کے سامنے آنے سے بھی کتراتے ہیں۔ میں نے کہا تو کہنے لگیں ان کی بے پردگی ہوگی۔ تب میں نے سفارش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں مکان کے بیرونی کمروں میں سے کچھ کمرے دے دوں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں تاکید کر دوں گا کہ وہ آپ کی تنہائی میں مغل نہ ہو۔ تب وہ تیار ہو گئیں۔“

”میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں دوست، مجھے کیا کرایہ دینا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”مکان دیکھ لو۔ پسند آجائے تو ٹھیک ہے۔ ممکن ہے تم اس ویرانے کو پسند نہ کرو۔“

”مجھے صرف مکان چاہئے۔ چاہے وہ چوتھے آسمان پر ہی کیوں نہ ہو۔ تم اس کی فکر مت کرو۔“ میں نے کہا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”تم نے تو بتایا کام بگاڑ دیا تھا۔ وہ تو شکر ہے اس نے محسوس نہیں کیا۔“

”بہت بھولے ہو جشید بھیا! ارے وہ آرٹس تھا۔ ایسے آرٹس تمہیں ہر ہوٹل میں اور ہوٹل کے دروازوں پر مل جائیں گے۔ بس تمہاری دکھتی رگ ہاتھ آجائے وہ اسی موضوع پر تم سے بات کریں گے اور تمہاری جیب سے کھاپی کر چلے بنیں گے۔ مگر وہ آدمی شریف تھا۔ صرف چائے پر اکتفا کر کے چلا گیا میرا تو خیال تھا کہ وہ ڈنر بھی تمہارے ساتھ ہی کرے گا۔“ رشید نے ہنستے ہوئے کہا۔

”دل مت توڑو یار۔ خدا کرے وہ اس قسم کا آرٹس نہ ہو۔ چاہے وہ مجھ سے مینے بھر تک چائے اور ڈنر لیتا رہے۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔ میں مکان مل جانے کی امید کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔

”بہر حال۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ ویسے کیا ارادہ ہے۔ کل اس کے لئے یہاں آؤ گے؟“ رشید نے پوچھا۔

”یقیناً۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کل ساڑھے دس بجے آفس سے اٹھ آؤں گا۔ اور یہاں اس کا انتظار کروں گا!“ میں نے جواب دیا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ آؤں گا۔ اگر وہ درحقیقت مکان دکھانے لے گیا تو میں بھی چلوں گا۔“

”بخشو یار۔ تم اس پر ہنسو گے اور مجھے خطرہ ہے وہ بدک جائے گا۔ اور پھر تم آج بھی دوسرے چھٹی کر چکے ہو۔ کل تو میں ہی چلا آؤں گا اور اگر مکان مل ہی گیا تو پھر بعد میں سہی!“ میں نے کہا اور رشید ہنستا رہا۔ اس آدمی کی شخصیت میرے لئے بھی حیرت انگیز تھی، لیکن بہر حال مجھے اس سے زیادہ دلچسپی اور کس سے ہو سکتی تھی کہ وہ میرے لئے مکان کا وعدہ کر کے گیا تھا۔

دوسرے دن میں حسب پروگرام ٹھیک ساڑھے دس بجے دفتر سے اٹھ گیا۔ میں نے ٹیکس لی اور اس ہوٹل چل پڑا جہاں ہم شام کو اکٹرا بیٹھا کرتے تھے۔ پونے گیارہ بجے تھے۔ میں نے وقت گزاری کے لئے ایک مشروب منگا لیا اور بے چینی سے گیارہ بجے انتظار

سہولت یہ تھی کہ صبح کی پریشانی نہیں تھی۔ نزاکت مجھے اپنے ساتھ لے ہی آیا کرے گا۔ ہم عمارت کے کمپاؤنڈ میں پہنچ گئے اور نزاکت نے گاڑی روک دی۔ پوری عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ بیرونی حصہ بے ترتیب گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ سوکھے درخت اگے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے برسوں سے ان کی دیکھ بھال نہ ہوئی ہو۔ میں ان تمام چیزوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔

لیکن اندر کا ماحول باہر سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں کا باہر سے کوئی موازنہ نہ تھا، جس راہداری سے ہم گذر رہے تھے اس میں قالین بچھا ہوا تھا۔ نہایت قیمتی اور نیا قالین تھا۔ راہداری کے ساتھ ساتھ خوبصورت گیلے رکھے ہوئے تھے جن میں پھول سجے تھے۔ راہداری سے گذر کر ہم ایک بڑے ہال کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ ہال میں چاروں طرف دروازے تھے اور اس کے سامنے کے حصے میں ایک اور راہداری چلی گئی تھی۔ انتہائی خوبصورت مکان تھا۔

”اس ہال میں چھ کمرے ہیں۔ وسیع اور کشادہ۔ ان میں سے جتنے چاہو اپنے استعمال میں رکھو۔ یہ سب دروازے تمہارے لئے ہیں سوائے راہداری کے اس دروازے کہ یہ عمارت کے اندرونی حصے میں جاتا ہے۔ اور وہاں خالہ جان رہتی ہیں۔ اس طرف جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔“

میں ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ انتہائی نفیس کمرہ تھا۔ پشت پر ایک بڑی کھڑکی تھی جو بائیں سمت کے لان پر کھلتی تھی۔ میرے لئے ایک ہی کمرہ کافی تھا لیکن یہاں تو پورا مکان موجود تھا اور وہ بھی نہایت عالی شان۔ کاش شہر میں مجھے اس سے گھٹیا درجے ہی کا کوئی مکان مل جاتا۔ اس مکان کی ویرانی دیکھ کر مجھے بھی وحشت ہو رہی تھی۔ لیکن مجبوری نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ چنانچہ یہی غنیمت تھا۔ اس کے علاوہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کمپنی سے کچھ قرض لے کر ایک موٹر سائیکل خرید لوں گا تاکہ آنے جانے کا محتاج بھی نہ رہوں۔

بہر حال، میں نے نزاکت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ جو کمرہ چاہے مجھے دے دے۔ ”سب ہی تمہارے ہیں۔ جہاں دل چاہے رہو۔ بس جو باتیں میں نے بتادی ہیں ان

”تب کرایہ جو دل چاہے دے دینا۔ خالہ جان کے پاس سب کچھ ہے، روپے پیسے کمی نہیں ہے۔ نہ ہی مکان سے آمدنی مقصود ہے۔“ اس نے شہرت کا آخری گھونٹ لے کر کہا اور میں نے جلدی سے پیرے کو بلا کر بل ادا کر دیا۔

”چلیں؟“ میں نے پوچھا۔

”چلو!“ وہ بھی اٹھ گیا۔ اس وقت وہ مجھے دنیا کا مخلص ترین انسان نظر آ رہا تھا۔ اس کی شخصیت کچھ بھی تھی لیکن بحیثیت انسان وہ بہت بلند تھا۔ میں اس کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ باہر اس کی دو کس وگین کھڑی تھی۔ اسنے ڈرائیونگ سیٹ کے پاس کا دروازہ کھول دیا۔ اور میں اس کے ساتھ اندر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔

”مکان کافی دور اور ویران علاقے میں ہے۔ لیکن مجھے روزانہ صبح سویرے شہر آنا ہوتا ہے۔ بہت سے کام ہوتے ہیں۔ تم صبح کو میرے ساتھ دفتر آ جایا کرنا شام کو واپسی تمہارا کام ہے۔ ہمارے مکان سے ایک میل دور ایک بستی ہے یہاں گاڑیاں آتی ہیں۔ یہاں تک پہنچ جایا کرنا باقی فاصلہ تمہیں پیدل طے کرنا پڑا کرے گا۔“

”کوئی بات نہیں۔ میرے لئے تو بہت بڑا سہارا ہے کہ صبح کو تمہارے ساتھ دفتر آ جایا کروں گا! اس کے بعد تو کوئی بات ہی نہیں رہی۔“ میں نے کہا اور وہ خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ شہر کی بیشمار سڑکوں سے مڑتا ہوا وہ مضافات جانے والی ایک سڑک پر مڑ گیا۔ میں اس فاصلے کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن میری پریشانی کے سامنے یہ فاصلہ کچھ نہیں تھا۔ پھر کافی دور نکلنے کے بعد وہ ایک طرف مڑ گیا۔ یہ سڑک کا اختتام تھا اور یہاں سے ایک کچی پنڈتدی نہ جانے کس طرف جاتی تھی۔ سڑک کے دوسری سمت وہ بستی نظر آ رہی تھی جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا۔ پھر مجھے وہ عمارت نظر آ گئی جو درحقیقت ویران اور پراسرار تھی۔

پرانے طرز کی اس عمارت کو دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ جگہ تو جنوں اور بھوتوں کا مسکن ہونا چاہئے تھی۔ لیکن اس مشینی شہر میں ایسی عمارتوں میں بھی انسان رہتے تھے۔ میں نے سوچا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے۔ اب تو گزارہ کرنا ہی ہو گا۔ اور پھر



پر عمل کرنا۔“ میں نے خلوص دل سے وعدہ کیا اور نزاکت نے ایک کمرہ میرے لئے مخصوص کر دیا۔ ”سامان کب لاؤ گے۔“

”آج ہی، اگر اجازت ہو تو۔!“ میں نے کہا۔

”تب چلو۔ سامان لے آئیں۔“

”تمہیں تکلیف ہوگی نزاکت۔“

”چلو۔ تکلف مت کرو۔ ہم تو دوستوں کے دوست ہیں۔“ اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ میرا سامان ہی کیا تھا مختصر سے سامان کو لے کر میں اس پر اسرار مکان میں منتقل ہو گیا۔ سامان کمرہ میں قرینے سے رکھتے ہوئے مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ مکان میں بجلی نہیں تھی۔ البتہ شمعدان بہت سے رکھے ہوئے تھے۔ انہیں سے کام چلانا پڑے گا: یہ بھی گوارہ تھا۔ اور پھر نزاکت کے اندر، یعنی زبان خانے میں چلے جانے کے بعد میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل مقرر کرنے لگا۔ کھانے پینے کا اکٹھا سامان لے آیا کروں گا۔ خود ہی پکایا کروں گا اور کھایا کروں گا۔ ظاہر ہے یہاں میرے لئے تکلیف کرنے والا کون تھا۔ ابھی تک کرائے کا مسئلہ طے نہیں ہوا تھا۔ وہ ہو جاتا تو بہتر تھا۔

شام کو سات بجے کے قریب میری ناک میں کھانے کی خوشبو آئی اور میں سوچنے لگا کہ رات کے کھانے کا کیا ہو گا۔ آج رات ویسے ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔ کل باقی بندوبست کر لوں گا! میں نے سوچا! تاریکی پھیل گئی تھی۔ میں نے شمعدان روشن کر دیئے اور شمعوں کی روشنی میں کمرے کا ماحول اور پر اسرار ہو گیا۔

میں بستر پر لیٹ گیا۔ نہ جانے نزاکت کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے کچھ بھی کر رہا ہو۔ مجھے ان لوگوں کو پریشان کرنے۔ ان کے بارے میں کیرید کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ میں کوئی مہمان تو نہیں تھا، صرف کرایہ دار تھا۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے جب نزاکت نے کمرہ کے دروازے پر آواز دی۔ ”سو گئے کیا۔؟“

”نہیں۔ آؤ نزاکت!“ میں نے جلدی سے کہا۔ اور نزاکت اندر داخل ہو گیا۔ لیکن اس کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔ میں نے اسے دیکھا۔ ایک جوان العمر لڑکی تھی۔ جو سینے کا

لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی ٹرے تھی جس میں کچھ رکھا ہوا تھا۔ لڑکی نے ٹرے ایک میز پر رکھ دی اور نزاکت بولا۔

”یہ رہا شمس۔ ہماری ملازمہ ہے۔ لیکن گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتی ہے۔ خالہ جان نے ہدایت کر دی ہے کہ یہ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا تمہیں دے دیا کرے اور کوئی ضرورت ہو تو اسے آواز دے سکتے ہو!“

”ارے۔ مگر یہ کیا — میرا مطلب ہے اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ میں کھانا —!“

”میں بتا چکا ہوں کہ خالہ جان بے حد رحم دل خاتون ہیں۔ بس ان کے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے تو وہ بہت اچھی ثابت ہو سکتی ہیں۔“

میں نے تشکرانہ نظروں سے نزاکت کو دیکھا۔ رہا شمس واپس جا چکی تھی۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے نزاکت کو بھی کھانے کی دعوت دی، لیکن اس نے جواب دیا کہ وہ کھا چکا ہے۔ چنانچہ میں کھانے پر ڈٹ گیا۔ بہترین کھانا تھا۔ میں نے بڑے مزے لے لے کر کھایا۔

دوسرے دن جب میں آفس پہنچا تو رشید بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ ”رات کو ہوٹل پہنچا تو پتہ چلا کہ جناب کا سامان جا چکا ہے یعنی اتنی جلدی ہاتھ مار دیا۔ بہر حال مبارک ہو بھئی۔ مکان کیسا ہے۔“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔ ”مکان تو بہت شاندار ہے رشید۔ لیکن عجیب پر اسرار جگہ ہے حیرت انگیز لوگ ہیں۔“

”ہے کہاں؟“ رشید نے پوچھا اور میں نے اسکا جائے وقوع بتایا۔

”اناللہ وانا الیہ راجعون۔!“ رشید نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”کیوں۔؟“

”ظاہر ہے بھائی۔ اب صرف تم سے دفتر میں ملاقات ہوا کرے گی۔ کسی وہاں جانے کی ہمت ہے۔ بہر حال نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے، ہاں کیا کرایہ طے ہوا؟“

”ابھی تک کچھ نہیں یار۔ نزاکت نے نہ تو کرائے کے بارے میں بتایا ہے بلکہ اس

نے تو ناشتے اور کھانے کا بھی بندوبست کر دیا ہے! بقول اس کے خالہ جان بہت نیک دل خاتون ہیں۔“

”بس تو عیش کو پیارے، تمہاری تو لائری نکل آئی۔ ویسے ان خالہ جان محترمہ کی عمر کیا ہے؟ اس بارے میں بھی معلوم ہوا؟“

”بقول نزاکت کے وہ بیحد پردہ نشین خاتون ہیں اور کسی کے سامنے نہیں آتیں، پھر عمر کے بارے میں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ مگر عمر سے کیا غرض؟“

”یہ عنایتیں خالی از علت نہیں ہو سکتیں پیارے۔ ٹھیک ہے عیش کرو۔ ایسے مالک مکان خدا سب کو دے۔ کاش میرے شادی کرنے سے پہلے ایسی کوئی خالہ جان مجھے مل جاتیں۔“ رشید نے کہا اور میں ہنسنے لگا۔

”بہر حال رشید۔ مجھے کوئی قاعدے کا مکان مل گیا تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔“

”خالہ جان کے سامنے آنے سے پہلے ایسا مت کرنا دوست! اس کے بعد ممکن ہے تمہیں نہ صرف مکان بلکہ ملازمت کی ضرورت بھی نہ رہے۔“ رشید نے بدستور ہنسنے ہوئے کہا۔ اور بات مذاق میں ٹل گئی۔

شام کو اس بستی تک جانے کے لئے آسانی سے ٹیکسی مل گئی اور پھر وہاں سے پیدل۔ حسب معمول ساڑھے آٹھ بجے ر۔شماں کھانا لے کر آگئی بہت خاموش سی لڑکی تھی اور نہ جانے کیوں سہمی سہمی سی نظر آ رہی تھی لیکن میری اس سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی، ممکن ہے یہ بات گھر والوں کو پسند نہ ہو۔ اور ابھی یہ گھر میرے لئے ایک نعمت تھا۔

زندگی نہایت خاموشی سے گذرتی رہی۔ مہینہ پورا ہونے پر میں نے نزاکت سے پوچھا کہ کیا پیش کروں۔ لیکن اس نے محبت سے مجھے ڈانٹ دیا اور بولا ”خالہ جان سنیں گی تو انہیں افسوس ہو گا کہ تم اتنے دن سے یہاں رہنے کے باوجود غیرت برتتے ہو۔ خالہ جان کے پاس سب کچھ ہے انہیں پیسے کی طمع نہیں ہے۔ عیش سے رہتے رہو۔ اور پھر خالہ جان تمہاری شرافت کو پسند کرتی ہیں۔ تم نے ان کی تمام شرطیں پوری کر دی ہیں۔“ نزاکت نے کہا۔ اور میں ان لوگوں کا بہت زیادہ ممنون ہو گیا۔ نزاکت نے میری ایک نہ

چلنے دی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان لوگوں کے احسانات کا بدلہ کیسے ادا کروں! ویسے درحقیقت اب میں اس زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ اب اس ویرانی سے مجھے کوئی وحشت نہ ہوتی۔ یہ ماحول میری عادت بن گیا تھا اب یہاں آنے جانے میں بھی مجھے کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی۔ نزاکت پابندی سے مجھے دفتر چھوڑتا تھا اور شام کو میں ٹیکسی سے آ جاتا تھا۔ اس پورے ماہ میں میں نے ایک دفعہ بھی خالہ جان کو نہ دیکھا تھا اور نہ ان کی آواز سنی تھی اب میں اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ ورنہ ابتدا میں مجھے تجسس رہا تھا۔ پھر ایک شام نزاکت خود میرے لئے کھانا لایا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔

”کیوں۔ ر۔شماں کہاں گئی۔؟“ میں نے پوچھا۔

”حسب معمول بھاگ گئی۔“ اس نے جواب دیا

”کیا مطلب؟“

”بہت سی ملازمتیں بھاگ گئیں۔ کوئی دو تین ماہ سے زیادہ کتنی ہی نہیں ہے۔ میں نے کئی بار خالہ جان سے کہا ہے کہ کسی بوڑھی ملازمہ کو رکھ لیں۔ نوجوان لڑکیوں کا اس ماحول میں گزارا مشکل ہے۔ انہیں تو چمچل پھل کی زندگی چاہئے۔ اب اس لڑکی کو دیکھ لو۔ تین سو روپے ماہوار، کھانا کپڑا الگ۔ لیکن اس کا دل ہی نہیں لگا۔“

”اوہ۔ ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ عام لڑکیوں کا گزارا مشکل ہے پھر اب کیا کرو گے؟“

”نئی ملازمہ تلاش کریں گے۔ بلکہ تم ایک کام کر دو۔ اخبار میں ملازمہ کے لئے اشتہار دے دو۔ اور خود ہی کسی کو منتخب کر کے لے آؤ۔ جب تک ملازمہ نہیں آئے گی مجھے ہی کھانا تیار کرنا پڑے گا۔ ویسے میرے ہاتھ کا کھانا لا جواب ہوتا ہے۔ مرغیاں پکانے کا تو اسپیشلسٹ ہوں۔ دیکھو میں نے مرغایوں کے کباب بنائے ہیں۔“ اس نے سامنے رکھی ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں میری وجہ سے تکلیف اٹھانا پڑی ہے نزاکت، میں خالہ اور تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے اپنوں کی سی محبت دی ہے۔!“

”ارے چھوڑو ان باتوں کو۔ ہم سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ پھر یہ کلفانہ گفتگو کیسی۔ کباب کھاؤ۔ اور ایمانداری سے ان کے بارے میں بتاؤ۔“ نزاکت نے ہنسنے

یہ لڑکی چونکہ نئی تھی اور خوفزدہ سی نظر آ رہی تھی۔ اس لئے خالہ جان کی طرف سے اسے میرے کمرے کے نزدیک ہی رہنے کی اجازت مل گئی! اور عمارت کا ایک کمرہ مرتھا کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔

مرتھا کے آجانے سے زندگی میں کچھ اور دلچسپی پیدا ہو گئی اکثر نزاکت میں اور مرتھا کافی دیر تک بیٹھے گفتگو کرتے رہتے تھے۔ چند دنوں میں مرتھا بھی اس ماحول کی عادی ہو گئی۔ خالہ جان کی طرف سے اسے بہت سی مراعات دی گئی تھیں۔ ایک انتہائی مناسب رقم دے دی گئی اور کہا گیا کہ اس رقم سے وہ اپنے بہن اور بھائی کے کپڑے وغیرہ بنا دے اور ان کے لئے مناسب انتظام کر دے۔ مرتھا بھی نیک دل خالہ جان کی بہت مشکور تھی۔

لیکن خالہ جان کی شخصیت اس کے لئے بھی بے حد پراسرار تھی۔ اسے صرف باورچی خانے تک جانے کی اجازت تھی اور بس۔ باقی حصے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ خالہ جان کے لئے کھانا وغیرہ لے جانا نزاکت ہی کے سپرد تھا۔ مرتھا نے بھی آج تک خالہ جان کو نہیں دیکھا تھا اور اسے بھی خاصا تجسس تھا۔ ایک دن جب نزاکت ہمارے پاس نہیں تھا وہ مجھ سے کہنے لگی۔

”جشید۔ یہ خالہ جان آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکیں۔ آخر یہ اس قدر تمنائی میں زندگی کیسے بسر کر لیتی ہیں؟“

”عادت پڑ گئی ہے مرتھا۔ خود میرے لئے بھی وہ بے حد پراسرار ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ صرف نزاکت کی اختراع ہے ورنہ یہاں اس عمارت میں کسی خالہ جان کا وجود ہی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ یہ بات نہیں۔ خالہ جان موجود ہیں۔ میں نے آج تک انہیں نہیں دیکھا۔ لیکن ان کے قدموں کی چاپ سنی ہے۔ ان اوقات میں جب نزاکت نہیں ہوتا۔ میں نے نزاکت اور ان کی گفتگو بھی سنی ہے۔“

”اوہ۔ ایسی کوئی کوشش مت کیا کرو مرتھا۔ ممکن ہے خالہ جان پسند نہ کریں۔ یہ دیکھو وہ کس قدر رحم دل خاتون ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی تمہیں کوئی تکلیف دی ہے؟“

”نہیں جشید۔ میرا تو رواں رواں ان کا احسان مند ہے۔ میں آئندہ خیال رکھوں

ہوئے کہا۔ اور میں کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے کباب کھائے اور اس وقت تک کھاتا رہا جب تک کھانے کی گنجائش رہی۔ بلاشبہ میں نے پوری زندگی میں ایسے لذیذ کباب نہیں کھائے تھے۔

”کیا خیال ہے۔؟“ نزاکت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بس نزاکت، اس کھانے کی تعریف الفاظ میں نہیں کر سکتا یوں سمجھ لو میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا کھانا کبھی نہیں کھایا۔“ میں نے کہا۔ اور نزاکت ہنسنے لگا، پھر بولا۔

”اور جب تک نئی ملازمہ کا بندوبست نہیں کر دو گے، مجھے ہی پھنسے رہنا پڑے گا۔“

”اور تم مرغابیوں کے کباب پکاتے رہو گے۔“ میں نے پوچھا

”ہاں۔ یہ میری پسندیدہ ڈش ہے۔“

”تب پھر میں دعا کروں گا کہ نئی ملازمہ کبھی نہ آئے۔“

”ارے نہیں۔ نئی ملازمہ تو ضروری ہے۔ ویسے میرا وعدہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد کبابوں کا پروگرام بنایا جاتا رہے گا!“ نزاکت نے جلدی سے کہا اور میں ہنسنے لگا۔

دوسرے دن میں نے اخبار میں اشتہار دے دیا۔ انٹرویو کے لئے بھی میں نے اپنے دفتر کا پتہ دے دیا تھا۔ اشتہار میں ایسی آسانیاں رکھی گئی تھیں کہ بہت سی لڑکیاں انٹرویو کے لئے آگئیں۔ لیکن بیشتر لڑکیاں ایک شرط سے گھبرا گئیں یعنی یہ کہ انہیں شہر سے دور ایک مکان میں رہنا ہو گا البتہ ایک تیار ہو گئی۔

اس کا نام مرتھا تھا۔ عیسائی لڑکی تھی جس کے انگ انگ سے زندگی جھلکتی تھی۔ وہ بھی تنہا تھی۔ بس دو بہن بھائی تھے جو بورڈنگ میں رہتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ رہنے پر رضا مند ہو گئی۔ اور میں نے اسے ملازم رکھ لیا۔ اسی شام میں اسے لے کر چل دیا۔ پہلے میں بستی پہنچا اور پھر وہاں سے ایک میل کا فاصلہ طے کر کے اس پراسرار مکان میں داخل ہو گیا۔ مرتھا اس مکان کو دیکھ کر خاصی خوف زدہ ہوئی تھی۔ لیکن پھر میں نے اندر داخل ہو کر اسے تسلی دی اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں تفصیل بتائی تو اسے قدر۔ اطمینان ہوا۔

گی۔" مرتھانے کہا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

زندگی کے معمولات یونہی چلتے رہے۔ کوئی نیا پن نہیں تھا وہی پرانے معمولات۔  
پھر ایک دن نزاکت پریشان سامیرے پاس آیا۔

"مرتھا اپنے کمرے میں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ باورچی خانے میں بھی نہیں گئی۔"

"پھر کہاں گئی؟"

"اس کے علاوہ میں نے پوری عمارت بھی چھان ماری ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو نزاکت؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہی پرانی بات"

"یعنی۔؟"

"بھاگ گئی۔" نزاکت نے گہری سانس لے کر کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے نزاکت، وہ تو یہاں بہت خوش تھی۔ ایسی ملازمت اسے کہاں مل سکتی تھی۔ اور پھر رات کو تو اس نے مجھ سے ملاقات بھی کی تھی۔ ایسا کوئی خیال اس نے ظاہر نہیں کیا تھا۔"

"مجھ سے ظاہر کیا تھا" نزاکت نے کہا۔

"اوہ۔ کیا کہا تھا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی کہ اس کی زندگی کو یہاں زنگ لگتا جا رہا ہے۔ زندگی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ کوئی تفریح نہیں۔ اس ویرانے میں دم گھٹتا ہے وغیرہ وغیرہ میں اس دن کھکا تھا، بہر حال میں نے اسے سمجھایا کہ اس پر آشوب دور میں ملازمت کہاں ملتی ہے۔ اسے اچھی تنخواہ مل رہی ہے۔ ہر سولت مہیا ہے۔ گذارتی رہے، کوئی تکلیف ہو تو بتائے۔ اس وقت وہ خاموش ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے اس کے چہرے پر الجھن کے سائے دیکھے تھے۔ اور بالا آخر وہی ہوا۔"

"مجھے حیرت ہے نزاکت، اس نے مجھ سے کبھی ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔"

میں نے کہا۔

"وہ ایک عام لڑکی تھی جمشید۔ بالکل عام۔ اسے رومان کی ضرورت تھی۔ وہ کئی بار مجھ سے اظہار عشق کر چکی تھی۔ لیکن میں تو اس فطرت کا انسان ہی نہیں ہوں۔" اس نے کہا اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ بلاشبہ نزاکت کی رنگت خون کی طرح سرخ تھی۔ اسکے خدوخال بھی اچھے تھے۔ لیکن اگر مرتھانے اس سے اظہار عشق کیا تو وہ خود بھی عجیب فطرت کی عورت تھی۔ ورنہ عمر وغیرہ کے لحاظ سے میں نزاکت سے کہیں بہتر تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس انداز میں کئی بار مرتھا کو ٹولنے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن میرے سامنے وہ بالکل ٹھس رہی تو میں نے یہ خیال چھوڑ دیا لیکن اب یہ معلوم کر کے مجھے حیرت ہوئی کہ وہ نزاکت سے عشق جتانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ چند منٹ تک میں ان خیالات میں ڈوبا رہا۔ پھر نزاکت کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا سوچ رہے ہو جمشید۔؟"

"کچھ نہیں۔ اگر کو تو میں مرتھا سے اس کے گھر پر ملنے کی کوشش کروں۔ اس طرح خاموشی سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی اگر جانا تھا تو باقاعدہ کہہ سن کر جاتی۔"

"خالہ جان کا ایک اصول ہے جمشید۔ جانے والے سے وہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں۔ اب وہ کسی قیمت پر اس کا یہاں آپنا پسند نہیں کریں گی اسلئے اس کے ذکر کو جانے دو۔"

"پھر کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال وہی مرغابی کے کباب۔" نزاکت نے بھونڈے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"دو چار دن کے بعد نئی لڑکی رکھنے پر غور کریں گے۔"

"اوہ۔ تب تو میرا خیال ہے کہ یہ عرصہ دو چار دن سے بھی زیادہ ہونا چاہئے۔ پچھلی بار تمہارے ہاتھ کے بنائے ہوئے کبابوں کا مزہ میں آج تک نہیں بھولا ہوں۔" میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا

"وعدہ۔!" نزاکت نے کہا۔ اور پھر حسب معمول مجھے شر چھوڑنے آگیا۔ آفس میں بھی دن بھر میں مرتھا کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس نے میری توہین کی تھی۔ میں تو کتنے خلوص سے اس سے پیش آیا تھا۔ لیکن اس نے میرے

”کیا بات ہے۔ بہت خوش ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”خوش ہونے کے لئے کسی خاص بات کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بس جب بھی  
 خوشی مل جائے اس کا اظہار کر دو!“ اس نے کہا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اندر داخل ہو گیا۔  
 ”خوش ہونے کے لئے یہی بات کیا کم ہے کہ تم جیسا دوست مل گیا۔“  
 ”تمہاری مہربانی سے نزاکت۔ ورنہ میں نے تمہارے لئے کیا کیا ہے۔“ میں نے  
 مخصوص لہجہ میں کہا۔

”بس بس۔ فضول باتیں مت کرو یا ر۔ پیٹ کی کیا پوزیشن ہے۔ کچھ کھا کر تو نہیں  
 آئے؟“

”ارے نہیں بھائی۔ دن بھر مرغیوں کے کبابوں کے تصور میں گم رہا ہوں۔“ میں  
 نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور وہ بھی ہنسنے لگا۔

”تب پھر حلق تک ٹھونسو۔ میں نے بہت سارے بنا ڈالے ہیں۔“ اس نے کہا اور  
 میں نے حسب معمول اپنے کمرے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، لباس تبدیل کیا اور پھر تیار ہو  
 گیا۔

نزاکت اندر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک بڑی ٹرے سجائے ہوئے اندر آ  
 گیا اور اسے میرے سامنے رکھ دیا۔

”آج تو تم بھی شروع ہو جاؤ نزاکت۔“ میں نے کہا

”توبہ کرو یا ر۔ میں تو پکاتے ہی میں کھانے کا عادی ہوں اتنا صبر کون کرے۔ ناک  
 تک بھرا ہوا ہوں۔ تم عیش کرو۔“ اس نے کہا اور میں کباب کھانے لگا۔ غضب کے مزیدار  
 کباب تھے۔ میں اس کی جس قدر بھی تعریف کرتا کم تھا۔ حسب معمول میں نے ضرورت  
 سے زیادہ ہی کھائے اور پھر جب بالکل گنجائش نہ رہی تو میں نے کہا۔  
 ”اب صبح کو ناشتے میں کھاؤں گا۔“

”تازہ۔ صبح کو تازہ بنا کر دوں گا۔“ اس نے کہا۔ کافی دیر تک ہم بات چیت کرتے  
 رہے۔ اس نے بتایا ”خالہ جان مر تھا کے چلے جانے سے بہت ناراض ہیں۔ انہیں دکھ ہے  
 کہ کوئی ان کے خلوص کو کیوں نہیں قبول کرتا۔ وہ کسی کو تکلیف بھی نہیں دیتیں لیکن

خلوص کی اس طرح توہین کی۔ اول تو اس نے نزاکت سے عشق جتانے کی کوشش کی اور  
 مجھے نظر انداز کر دیا۔ دوسرے اسے اتنے دن کے ساتھ کا بھی خیال نہیں آیا۔ کم از کم مجھ  
 سے ہی کہہ دیتی کہ وہ جانے کا خیال رکھتی ہے۔ چوروں کی طرح بھاگنے کی کیا ضرورت  
 تھی۔ وہ تو خالہ جان شریف عورت تھیں ورنہ اس پر چوری کا الزام لگا کر گرفتار بھی کرا  
 سکتی تھیں۔

اس دن لُنج پر رشید سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بگڑا بگڑا سا نظر آ رہا تھا! ”کیا بات ہے  
 رشید۔ کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو۔؟“

”ناراضگی کیسی بھائی۔ جب تک تم نے چاہا تعلقات رکھے اور جب دل چاہا توڑ  
 دیئے!“ رشید نے روکھے پن سے کہا

”ارے۔ مگر تعلقات توڑنے کی اطلاع کس نے دی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تمہارے رویئے نے!“

”اوہ۔ سوری رشید۔ لیکن تم میری مجبوری جانتے ہو۔ اتنی دور چلا گیا ہوں کہ  
 بس۔ ویسے میرے حالات واقعی بہتر ہو گئے ہیں۔ اچھی خاصی رقم بچ جاتی ہے۔ دیکھو  
 رہائش فری، کھانا فری اور کیا چاہئے۔ دوسرے معمولی سے اخراجات ہیں۔ ایسی جگہ اور  
 کون سی ملے گی۔ حالانکہ میں خود بھی ان لوگوں کے احسانات سے شرمندہ رہتا ہوں۔ لیکن  
 کچھ ایسی اپنائیت ہے ان میں کہ وہاں سے آنے یا ان سے کچھ کہنے کو بھی دل نہیں  
 چاہتا۔“

”ٹھیک ہے بھائی۔ عیش کرو۔ لیکن دوستوں کو اس طرح فرائض بھی : : :  
 اتوار تو ملتا ہے۔“

”تم خود کبھی آؤ وہاں۔ تم نے بھی تو کبھی رخ نہیں کیا۔“

”کیا بتاؤں یا ر۔ کئی بار ہمت کی۔ لیکن اول تو وہ بستی ہی اتنی دور ہے اور : : : : :

بعد بیدل سفر۔ بس ہمت جواب دے جاتی ہے بہر حال کسی وقت آؤں گا۔“

میں نے رشید کو منالیا اور پھر شام کو حسب معمول گھر پہنچا نزاکت با : : : : :  
 رہا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا!

لوگ انہیں خاطر میں ہی نہیں لاتے۔“

”دراصل ہم بھی تو بہت جلد دوسروں پر اعتبار کر لیتے ہیں کام کرنے کے لئے لڑی لی ضرورت پڑے گی ہی۔ اس بار ہم اس سے معاہدہ کریں گے کہ کم از کم دو تین سال اسے ہمارے ساتھ رہنا ہو گا ورنہ ہم اس پر ہرجانے کا دعویٰ کر دیں گے۔“

”جیسا دل چاہے کرنا۔ فی الحال چند روز تو اس کے بغیر ہی کام چلانا ہو گا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک خالہ جان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ اور میں نے گردن ہلا دی۔

تین چار دن برابر مجھے مرغابی کے کباب کھانے کو ملتے رہے۔ اتنے لذیذ ہوتے تھے کہ دل ہی نہ اکتاتا تھا۔ آخر پانچویں دن نزاکت نے مجھ سے کہا۔

”خالہ جان کی طرف سے اجازت مل گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”کل اشتہار دے دو اور کسی تندرست اور خوبصورت لڑکی کو اپائنٹ کر لو۔“

”اوکے“ میں نے کہا اور دوسرے دن کے۔۔۔۔ اخبار میں اشتہار دے دیا۔ تیسرے دن بہت سی لڑکیوں نے مجھ سے ملاقات کی۔ اس بار میں نے جس لڑکی کا انتخاب کیا وہ بھی عیسائی تھی اور اس کا نام شیلی تھا! شیلی بھی جوان اور خوبصورت تھی۔ وہ بڑی بے تکلف قسم کی لڑکی تھی۔ دو منٹ میں مجھ سے گھل مل گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ پوری دنیا میں تنہا ہے۔ کرائے کے مکان میں رہ رہی ہے اور چھ ماہ سے کرایہ ادا نہیں کیا ہے اگر مزید کچھ روز اور ملازمت نہ ملتی تو وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اپنی نسوانیت سے فائدہ اٹھائے گی اور جسم فروشی کرے گی۔“ اس نے اداس لہجے میں کہا۔

”زندگی گزارنے کے لئے کسی سارے کی ضرورت ہے۔ میں نے تعلیم کا سہارا لیا اور ملازمت کرنے لگی۔ لیکن ملازمت چھوٹ گئی اور میں ماری ماری پھرنے لگی۔ چاروں طرف پر دوس نظروں نے میرا استقبال کیا ہر نگاہ میرے جسم کو ٹٹولتی تھی۔ وہ مجھے ایک دان میں ایک ماہ کی تنخواہ دینے کے لئے تیار تھے لیکن اس کا معاوضہ میرے جسم سے وصول کرنا چاہتے تھے۔ باعزت روزی میرے لئے ختم کر دی گئی تھی۔ تب میں نے سوچا تھا کہ اگر

جسم بیچ کر ہی روٹی مل سکتی ہے تو اسے سستے داموں کیوں بیچوں۔ اور یقین کریں جناب اگر آپ مجھے ملازمت نہیں دیں گے تو یہاں سے سیدھی بازار حسن جاؤں گی اور وہاں گاہک تلاش کروں گی کیونکہ دو دن سے پانی پر گزارہ کر رہی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور میں اس سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا۔

”میں تمہیں ملازمت دینے کے لئے تیار ہوں۔ ایک باعزت ملازمت۔ لیکن ہماری کچھ شرائط ایسی ہیں جنہیں ممکن ہے تم پسند نہ کرو۔“

”وہ کیا جناب؟“

”تمہیں شہر سے دور ایک مکان میں رہنا ہو گا۔ وہاں میں ہوں ایک شخص اور ہے اور ایک گوشہ نشین خاتون ہیں جو کسی کے سامنے آنا پسند نہیں کرتیں۔ تمہیں گھر کے ضروری کام کرنے ہوں گے۔ کوئی کام تمہاری فطرت کے خلاف نہیں ہو گا لیکن کم از کم تین سال تمہیں ہمارے ساتھ گزارنے ہوں گے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ عموماً لڑکیاں اس ماحول کی ویرانی سے اکتا کر بھاگ جاتی ہیں۔“

”اس مشینی دنیا سے میرا دل بھی بھر گیا ہے جناب۔ اگر صرف ویرانی کی بات ہے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب تک آپ مجھے ملازم رکھیں گے رہوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تنخواہ چار سو روپے ماہوار ہو گی کھانا کپڑا ہماری طرف سے اور رہائش کے لئے میں بتا ہی چکا ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ اس نے کہا اور میں نے اسے ملازم رکھ لیا۔ میں اسے گھر لے گیا اور اس کا تعارف نزاکت سے کرا دیا۔

”انہیں ضروری کوائف سے آگاہ کر دیا ہے؟“ نزاکت نے پوچھا۔

”بالکل۔ یہ ہمارے لئے بالکل ٹھیک رہیں گی۔“ میں نے جواب دیا

”تم مطمئن ہو تو ٹھیک ہے۔ ویسے انہیں خالہ جان کے بارے میں بھی بتا دیا ہو گا۔“

”بالکل۔ انہیں صرف رہنے ہی سے سروکار ہو گا۔“ میں نے کہا اور نزاکت نے

گردن ہلا دی۔ شیلی کو بھی وہی کمرہ مل گیا جو کبھی مر تھا کے لئے مخصوص تھا اور شیلی نے

حسن و خوبی سے اپنا کام سنبھال لیا۔ وہ ہمارے ساتھ بہت خوش تھی البتہ فطری طور پر

”آپ کے خیال میں اس کے ملازمت چھوڑنے کی وجہ کیا تھی؟“  
 ”تنہائی۔ دراصل جس جگہ میں رہتا ہوں وہ ایک ویران سی جگہ ہے۔ عام لوگوں کا دل وہاں نہیں لگ سکتا۔“

”آپ کے ساتھ کون کون رہتا ہے؟“

”میرا ایک دوست اور اس کی خالہ جان! بس ہم دو افراد ہیں دراصل میں بھی اس مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے گیا تھا۔ لیکن پھر ہمارے تعلقات دوستانہ ہو گئے۔“ میں نے اسے تفصیل بتائی اور انسپٹر کسی خیال میں ڈوب گیا ”میں پوچھ سکتا ہوں انسپٹر کہ یہ تفتیش کس سلسلہ میں ہو رہی ہے“

”کوئی خاص بات نہیں۔ یہ لڑکی بہت دن سے غائب ہے اس کے بھائی بہن نے پولیس کو اطلاع دی ہے۔ بہر حال ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن ایک بات کی آپ کو سختی سے ہدایت کی جاتی ہے وہ یہ کہ آپ اس تفتیش کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کریں گے اپنے ان دوستوں سے بھی نہیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ قانون شکنی کے مجرم ہوں گے۔“

”بہتر ہے انسپٹر میں خیال رکھوں گا۔ ویسے اس لڑکی کی تلاش میں میری کسی قسم کی مدد درکار ہو تو آپ تکلف نہ کریں۔ وہ بہر حال ایک شریف لڑکی تھی۔“

”آپ کی جس قدر مدد درکار تھی حاصل کر لی گئی ہے۔ ہاں۔ کیا اس کے بعد آپ نے کوئی دوسری لڑکی ملازم رکھی ہے؟“

”جی ہاں۔ اس کا نام شیلی ہے اور وہ بڑے اطمینان سے کام کر رہی ہے۔“  
 ”براہ کرم آپ اپنے مکان کا پتہ نوٹ کرا دیں۔“ انسپٹر نے کہا اور میں نے پورے خلوص سے انسپٹر کو پتہ بتا دیا۔ جس پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر متعجب لہجے میں بولا ”آپ اس مکان میں کیوں رہ رہے ہیں۔؟“

”کیونکہ مجھے اس کا کوئی کرایہ نہیں دینا پڑتا۔ اور شہر میں مکان حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔“

”بہر حال شکریہ، میری ہدایت کا خیال رکھیں۔ اسے درخواست بھی سمجھ لیں اور

اسے بھی خالہ جان کے بارے میں تجسس تھا اور ڈھکے چھپے الفاظ میں وہ بھی کئی بار ان پر اسرار خالہ جان کا تذکرہ کر چکی تھی جن کی موجودگی اس نے بخوبی محسوس کی تھی لیکن جن کا سایہ اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

میں نے خاص طور سے اسے اس سلسلہ میں سمجھایا اور کہا کہ یہاں باعزت ملازمت کرنے کے لئے یہ شرط بھی ضروری ہے کہ خالہ جان کی کھوج نہ کی جائے۔ پھر میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ میں اتنے عرصہ سے یہاں رہ رہا ہوں لیکن میں نے بھی کبھی خالہ جان کا سایہ تک نہیں دیکھا۔ شبلی کافی متحیر تھی۔

پھر ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں دفتر میں تھا کہ ایک پولیس انسپٹر ایک اسسٹنٹ کے ساتھ میرے پاس آیا۔ اس نے میرا نام معلوم کیا اور بولا ”ایک خاص سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں۔“

”فرمائیے۔“ میں نے انسپٹر کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا جو صورت ہی سے بے حد ذہین اور ہوشیار نظر آتا تھا۔ اس نے کسی اخبار کا تراشا میرے سامنے کرتے ہوئے کہا:  
 ”یہ اشتہار آپ ہی کی طرف سے تھا؟“

میں نے غور سے اشتہار دیکھا۔ یہ وہ اشتہار تھا جو میں نے مرتھا کو ملازم رکھتے وقت دیا تھا۔ ”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ نے اس کے جواب میں کسی مرتھانامی لڑکی کو ملازم رکھا تھا؟“  
 ”جی ہاں۔“

”کیا وہ اب بھی آپ کے پاس ملازم ہے؟“  
 ”جی نہیں۔ وہ دو تین ماہ ہمارے ساتھ رہی۔ اور پھر ایک دن چپکے سے ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔“  
 ”کتنے عرصہ قبل؟“

”میرا خیال ہے ڈیڑھ ماہ سے زیادہ ہو گیا۔“

”کہاں چلی گئی۔ اس نے آپ کو بتایا تھا؟“

”نہیں۔ وہ خاموشی سے چلی گئی تھی۔ اور اس کے بعد سے آج تک نہیں ملی۔“

سلگتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کا وجود سلگ رہا تھا اور اس کی تپش نے موم کی طرح مجھے جگھلا دیا۔ اس رات ہم ایک جان دو قالب ہو گئے۔ اس نے اپنی تمام رعنائیاں میرے سامنے عیاں کر دیں اور میں نے اسے قبول کر لیا۔

دوسری صبح وہ بے حد مسرور تھی اور میں بھی خوش تھا۔ ہم دونوں سہانے خوابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ آج آفس میں بھی دل نہ لگا۔ شیلی کی صورت نگاہوں میں گھومتی رہی اور میں بڑی سنجیدگی سے مستقبل کے فیصلے کرتا رہا۔ شام کو روزمرہ سے کچھ قبل ہی میں واپس پہنچ گیا۔ شیلی بے چینی سے میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بیساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔!

”میں پورا دن تمہارے بارے میں سوچتی ہوں۔“ اس نے میرے سینے سے منہ رگڑتے ہوئے کہا۔

”یہاں بھی کسے قرار ہے۔“ میں نے اس کے بالوں سے کھیلے ہوئے کہا۔

”میرا سہارا توڑ نہ دینا جشید۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔“ اس نے درد بھرے انداز میں کہا۔

”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا بچی۔“ میں نے اس کی ٹھوڑی اونچی کر کے اس کے ہونٹ چومتے ہوئے کہا۔ اور اس کی آنکھوں میں مستی چھلک آئی۔

”رات کو انتظار کروں گا۔“ میں نے اس سے سرگوشی کے عالم میں کہا۔ اور اس نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ آنے والی رات کے تصور نے مجھے بے خود کر دیا۔ رات کو حسب معمول میں ’زناکت اور شیلی گفتگو کر رہے تھے۔ زناکت کچھ الجھا الجھا سا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے چینی تھی لیکن وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا بھی لیکن وہ قہقہہ لگا کر ٹال گیا۔ میں چونکہ اپنے ہی رنگ میں مست تھا اس لئے میں نے بھی توجہ نہ دی۔

پھر زناکت ہم دونوں کو سونے کا مشورہ دے کر اندر چلا گیا۔ اور شیلی ہال سے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی ”ٹھیک ایک بجے۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا۔ اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی اپنے

کمرے بھی۔ کیونکہ یہ ضروری ہے۔“

”میں وعدہ کر چکا ہوں!“ میں نے کہا اور انسپکٹر چلا گیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد میں الجھن میں پڑ گیا۔ مرتھا کہاں گئی؟ اگر اس نے ملازمت چھوڑی تھی تو اپنے گھر کیوں نہیں واپس گئی؟ اور نہ جانے کیسے کیسے دوسوے میرے ذہن میں ابھر آئے۔ لیکن پھر میں نے ان دوسووں کو جھٹک دیا۔ یہ تو پولیس کا کام تھا۔ ظاہر ہے ہم نے مرتھا کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا تھا۔ لیکن میں نے ایک فیصلہ ضرور کر لیا وہ یہ کہ انسپکٹر کی ہدایت کے مطابق نزاکت کو بھی اس سلسلہ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اور اس فیصلہ پر قائم رہا۔ دو تین دن میرے ذہن پر الجھن سوار رہی اور پھر میں انسپکٹر کی آمد کو بھول ہی گیا۔

شیلی کے آنے سے خاصی دلچسپیاں پیدا ہو گئیں۔ بڑی باغ و بہار لڑکی تھی۔ اچھا کھانے اور پینے کو ملا تو وہ نکھر گئی۔ شروع میں ان پر اسرار خالہ جان کی وجہ سے وہ بھی متعجب رہی لیکن پھر ماحول کی عادی ہو گئی۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ میری طرف مائل تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے ایک حسین پیغام تھا اور میں نے اس پیغام کو وصول کر لیا۔ میری دیران سی زندگی میں شیلی کا وجود بے حد دلکش تھا۔ وہ اکثر راتوں کو اٹھ کر میرے کمرے میں آ جاتی، کئی بار تو وہ میرے کمرے میں ہی سو بھی گئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ خالہ جان یا نزاکت کو اس بات پر اعتراض نہ ہو۔ لیکن اس نے کبھی ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اور شیلی کے اور میرے تعلقات بڑھتے رہے۔ شیلی کو اب میرے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ اور اب ہمارے درمیان جسمانی حجاب بھی اٹھ گئے تھے۔

اس رات شیلی تقریباً ایک بجے میرے کمرے میں آ گئی۔ اس کی آنکھیں نشہ آور تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے! ”جشید۔!“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی ”بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے جشید۔ تم نے مجھے ملازمت کا سہارا دیا۔ اور پھر۔ اور پھر۔ مجھے تمہارے بازوؤں کا سہارا بھی مل گیا میں، میں تم سے محبت کرتی ہوں جشید، میں بی بی۔ لے لئے تمہاری ہو جانا چاہتی ہوں۔ میں تم پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے سہارا دو گے جشید۔ تم اگر کو گے تو میں تمہارا مذہب بھی قبول کر لوں گی۔“

وہ جذبات سے بے قابو ہو رہی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا اور اس لے



کمرے میں آگیا۔ بس تبدیل کر کے لیٹ گیا۔ لیکن آنکھوں میں نیند کہاں۔ دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اٹھ کر شیل کے کمرے میں چلا جاؤں اور اسے اپنے بازوؤں میں بھر لوں۔ لیکن جلد بازی اچھی نہیں تھی۔ تھوڑی سی احتیاط ضروری تھی۔ ممکن ہے نزاکت اور خالہ جان کو ہمارے تعلقات کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ حالانکہ ان دونوں کو میرے اس ذاتی اقدام پر اعتراض کا حق نہیں تھا اور اگر وہ ناراض ہوتے تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے کہ مجھے اپنے ہاں سے نکال دیتے۔ شیل کے لئے اب میں سب کچھ کرنے کو تیار تھا اور پھر پوری زندگی ان کے ہاں گزارنے کا ٹھیکہ تو نہیں تھا۔ کسی بھی وقت وہ لوگ اکتا سکتے تھے۔ مجھے کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا بھی ضروری تھا۔

نہ جانے کب تک میں انہیں خیالات میں غلطال رہا۔ گھڑی کی سوئیاں بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ میری آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ ایک بجنے کے انتظار میں تڑپ رہا تھا۔ اس وقت پونے بارہ بجے تھے جب میرے کانوں میں ایک چیخ کی آواز گونجی۔ میں چونک پڑا۔ نسوانی چیخ تھی اور کافی واضح تھی۔ میں گھبرا کر بستر سے اٹھ گیا۔ دور دور تک ویرانہ تھا۔ اس ویرانے میں کون چیخ رہا تھا۔ میں انسانی ہمدردی سے بے چین ہو گیا چیخ کی آواز دوبارہ ابھری اور اس بار میں بری طرح اچھل پڑا۔ آواز زیادہ دور کی نہیں تھی اور اس آواز کو میں صاف پہچان گیا تھا۔ یہ شیل کے علاوہ اور کسی کی چیخ نہیں تھی۔ شیل چیخ رہی ہو اور میں کچھ نہ کروں۔ میں بے تحاشہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں نے شیل کے کمرے کے دروازے کو دیکھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر ہمارا دیکھا۔ شیل کا بستر خالی تھا۔ اسی وقت مجھے تیسری چیخ سنائی دی اور اس چیخ سے اسی وقت اس کی سمت کا بھی پتہ چل گیا۔

آواز اندر سے آرہی تھی۔ صرف ایک لمحے کے لئے میں تذبذب میں پڑا۔ اس طرف خالہ جان کی رہائش گاہ تھی اور ادھر جانے کی پابندی تھی، لیکن شیل بلاوجہ ہی نہ بیٹھ رہی ہوگی۔ ممکن ہے اسے میری مدد کی ضرورت ہو۔ چنانچہ میں تمام امداد بلالے لے کر نکلا۔ رکھ کر اندر کی طرف دوڑا۔ میں نے پہلی بار اس حصے میں قدم رکھا تھا۔ میں مارتا ہوا اس حصے سے قطعی ناواقف تھا۔ ایک طویل راہداری میں دوڑتا ہوا میں دوسری طرف

گیا۔ راہداری میں موٹا قالین بچھا ہوا تھا اس لئے میرے قدموں کی آواز نہ ہوئی۔ راہداری کے دوسرے سرے پر ویسا ہی ہال تھا جس کے دروازے سے روشنی چھن رہی تھی۔

میں رک۔ اندر سے خرخراہٹ بلند ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سی خرخراہٹ جسے میں کوئی الفاظ نہیں دے سکتا۔ میں کچھ رک کر جائزہ لیتا رہا کہ شاید چیخ کی آواز پھر سنائی دے۔ لیکن دو منٹ گزر گئے اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔ تب میں آگے بڑھا۔ ہال میں ضرور کوئی موجود تھا۔ نہ جانے کون!

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور ہال کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ ہال میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے کو تھوڑا سا اندر دھکیلا اور اندر کے منظر کو دیکھنے لگا اور اندر جو کچھ میں نے دیکھا اس نے میرے ہوش و حواس گم کر دیئے۔ میرے ذہن میں تاریکی چھا گئی اور میں پھنی پھنی نظروں سے اس میز کی طرف دیکھنے لگا جس پر شیل پڑی ہوئی تھی۔ بے سدھ۔ بے جان۔ اس کا زرخہ کٹا ہوا تھا اور اس سے خون اچھل اچھل کر چینی کے ایک طشت میں جمع ہو گیا تھا۔ جیتا جیتا سرخ خون۔ شیل کے نزدیک ہی نزاکت موجود تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک بلیڈ موجود تھا خون آلود۔ اور دوسرے ہاتھ میں شیونانے کی مشین جس سے شاید اس نے بلیڈ نکالا تھا اور اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ نزاکت نے ہی شیل کو اس بلیڈ سے ذبح کیا تھا۔

”نزاکت!“ میں جنونیوں کی طرح دہاڑا۔ اور نزاکت کے ہاتھ سے بلیڈ اور مشین چھوٹ کر نیچے گر پڑی!

”یہ تو نے کیا کیا پاگل کتے۔ تو نے اسے قتل کر دیا۔“ میں جنگلی بھینسے کی طرح اس پر پل پڑا۔ اور اس وقت میں نے ایک عجیب سے ممناتی آواز سنی۔

”ہائے۔ یہ اندر کیسے گھس آیا۔“

لیکن اس وقت میں نے اس آواز پر توجہ نہ دی۔ میں تو نزاکت کو رگید رہا تھا۔ اور تب پہلی بار مجھے نزاکت کی بے پناہ طاقت کا احساس ہوا۔ وہ چونکہ حیران تھا اس لئے مدافعت نہیں کر پا رہا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں کسی چٹان پر

”خالہ جان ذرا رسی اٹھاویں۔ یہ تو بچ پگل ہی ہو گیا ہے۔“ اس نے کہا اور چادر میں لپٹی ہوئی خالہ جان نے ایک کونے سے ایک ریشمی ڈوری اٹھا کر نزاکت کی طرف بڑھا دی۔ اور ڈوری دیتے ہوئے میں نے خالہ جان کے ہاتھ دیکھے۔ خوف سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ خالہ جان کے ہاتھوں پر گوشت نہیں تھا۔ ڈھانچے کی طرح سوکھے ہوئے خشک ہاتھ جن کی ہڈیاں صاف نظر آرہی تھیں۔

نزاکت نے میرے ہاتھ اور پاؤں کس کر باندھ دیئے اور پھر مجھے دیوار کے سارے بٹھا دیا۔

”ہاں۔ اب پوچھو گدھے۔ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ تم نے ہدایت کے خلاف اندر قدم کیوں رکھا۔ غالباً تم نے اس کی چیخ سن لی تھی۔ پھر بھی تمہیں خیال رکھنا چاہئے تھا۔“ پھر چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ”ہاں میں درست کہہ رہا تھا۔ کل میں تمہیں اس ملازمہ کے بھاگ جانے کی اطلاع دیتا اور اس کے ساتھ ہی تمہیں مرغابی کے کباب بھی کھلاتا۔ کیا تمہیں وہ کباب پسند نہیں ہیں۔ ارے احقر وہ انہیں ملازموں کے گوشت کے کباب ہوتے تھے۔ ورنہ کون سی مرغابی کا گوشت اتنا لذیذ ہوتا ہے۔ میں صرف تمہارے لئے کباب بناتا تھا ورنہ خود تو کچا گوشت کھاتا ہوں اور جو مزہ کچے گوشت میں ہے وہ کبابوں میں کہاں۔ مگر تمہاری قسمت ہی خراب ہے۔ ورنہ کبابوں کے بعد میں تمہیں کچا گوشت کھانا شروع کر دیتا۔“

میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ دماغ چکر رہا تھا۔ ”تو میں انسانی گوشت کے کباب کھاتا رہا ہوں! اف خدا!“ پھر میرے کانوں میں نزاکت کی آواز گونجی۔

”دراصل خالہ جان کو صرف خون پسند ہے۔ ان کی غذا ہی انسانی خون ہے۔ مہینہ دو مہینے میں انہیں خون کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم شریفانہ طور پر اس کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ خون خالہ جان پیتی ہیں اور گوشت میں کھا لیتا ہوں۔ خالہ جان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو لانے کے لئے کسی اور کا بھی بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ میں نے تمہارا انتخاب کر لیا۔ تمہاری وجہ سے میرے کام میں آسانی ہو گئی ورنہ مجھے لڑکیوں کو ورغلا کر لانے میں بڑی

قوت آزمائی کر رہا ہوں۔ پھر نزاکت نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ”کیا بد تمیزی ہے جمشید۔ کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ اپنی زنانہ آواز میں غرایا۔

”آئے ہائے۔ میں کہتی ہوں یہ اندر کیوں گھسا۔ اسے اتنی جرات کیسے ہوئی۔“ وہ آواز پھر سنائی دی جسے میں پہلے سن چکا تھا۔ اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سر سے پاؤں تک سفید چادر اوڑھے ہوئے خالہ جان چھپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ خالہ جان کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ میں گرج کر بولا۔

”میں کہتا ہوں تم لوگوں نے اسے قتل کیوں کیا۔ کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا؟“

”گدھے کے گدھے رہے صاحبزادے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ نزاکت نے بدستور میرے ہاتھ پکڑے پکڑے کہا ”کل صبح تمہیں اس ملازمہ کے بھاگ جانے کی اطلاع ملتی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے بدحواسی سے کہا۔ میں اپنی بے بسی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ نزاکت کے ہاتھوں میں کسی چیز کی طرح بے بس تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا۔ جیسے میری کلائیوں میں آہنی ہتھکڑیاں پڑی ہوں۔

”ہاں ہاں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مگر تم جیسا گدھا بھی آج تک میری نظرت نہیں گذرا۔ میں سمجھا کہ تم حقیقت سمجھ چکے ہو۔“

”تو۔ تو تم ان سب کو قتل کر چکے ہو۔ کیوں؟“ میں نے ایک بار پھر ذہنی انداز میں اس سے کلائیاں چھڑاتے ہوئے کہا۔

”دماغ درست کر لو۔ ورنہ وہ ہاتھ رسید کروں گا کہ دماغ درست ہو جائے گا۔“ نزاکت نے سخت لہجہ میں کہا۔ اور میرے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے۔ لیکن شبلی کی ملامت لاش میرے حواس پر مسلط تھی۔ میں ایک بار پھر نزاکت پر پل پڑا۔ اور اس بار نزاکت نے جھکائی دے کر میرے ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آرہی ہے۔ میں اچھے خاصے تن و توش کا مالک ہوتے ہوئے اچھل کر دور جا کر اٹھا۔ اور پھر نزاکت نے میرے اوپر چھلانگ لگائی اور مجھے دیوچ لیا۔

اپنے ہاتھ بلند کر دیئے۔ دوسرے لمحے وہ دونوں ہال کی چھت کی طرف پرواز کر گئے۔ انسپکٹر منہ پھاڑے انہیں دیکھتا رہا۔ انہوں نے ہال کے دو تین چکر لگائے اور ان کے انسانی جسم چمکاوڑوں میں بدل گئے۔ دیو پیکر چمکاوڑیں چند لمحے ہال میں چمکراتی رہیں اور پھر کھلے ہوئے روشن دان سے باہر نکل گئیں۔

کئی سپاہی بری طرح کھکیا رہے تھے اور خود انسپکٹر بھی حیران و پریشان کھڑا تھا۔ پھر اس نے میری رسیاں کھولیں اور میری پشت تھپتھپانے لگا۔

”ہم مرتھا کو تلاش کر رہے تھے مسٹر۔ اور اسی سلسلے میں ذاتی طور پر اس پر اسرار مکان کی نگرانی کر رہا تھا۔ شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔ اور اگر میں اپنے کانوں سے ان دونوں کی گفتگو نہ سن لیتا تو اس لاش کے سلسلے میں بھی آپ ہی کی گردن پھنستی۔ مگر میری زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے۔ اس سے قبل۔“

انسپکٹر جملہ ادھورا چھوڑ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ پھر اس نے ان سپاہیوں کو ڈانٹا جو ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے کانپ رہے تھے۔ دوسرے دن اس عمارت پر پولیس کی بھاری تعداد نے قبضہ کر لیا۔ تلاشی میں ایک کمرے سے بیشمار انسانی ہڈیاں برآمد ہوئیں جن میں یقیناً مرتھا اور پہلی ملازموں کی ہڈیاں بھی ہوں گی!

آج بھی جب میں ان واقعات کو یاد کرتا ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ میں کسی دیرانے میں کبھی نہیں جاتا۔ نہ جانے کون سے دیران مکان میں نزاکت اور خالہ جان موجود ہوں۔ مظلوم شیلی کو یاد کر کے اب بھی میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

دقت ہوتی تھی۔ اب سب عذاب تمہاری گردن پر ہے۔ اگر کسی کو پتہ بھی چل جائے تو تم ہی پکڑے جاؤ گے کیونکہ اشتہار دے کر لڑکیاں تم ہی لاتے تھے۔ یہ راز ہم تمہیں جلد ہی بتا دیتے مگر تم وقت سے پہلے اندر آگئے۔ جب تم انسانی گوشت کے عادی ہو جاتے تو پھر تمہیں ہم سے اختلاف نہ رہتا بلکہ تم خود ہی شوق سے لڑکیاں لاتے۔ دراصل اگر انسانی گوشت کی چاٹ پڑ جائے تو پھر انسان کو اور کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔“

میں حیران ہوں کہ ان باتوں کو سن کر میرا ہارٹ فیل کیوں نہیں ہو گیا۔ میری عجیب حالت تھی۔ پھر نزاکت خالہ جان کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”آپ کیوں ”خون خراب“ کر رہی ہیں خالہ جان۔ آپ خون پیئیں۔ اب اس سے کیا پردہ۔ کل اسے بھی زنج کر لیں گے اور اس سے کام چلائیں گے۔“

”آئے چھی چھی۔ میں اس کا خون نہیں پیوں گی۔ مردانہ خون پی کر مجھے زکام ہو جاتا ہے۔“ خالہ جان نے بل کھا کر کہا۔

”تب پھر میں پی لوں گا۔ اس کے کباب بھی کئی دن تک چل جائیں گے۔“ نزاکت نے کہا اور خالہ جان طشت کی طرف بڑھ گئیں۔ تب میں نے ان کی شکل دیکھی۔ اف کتنا خوفناک چہرہ تھا۔ قطعی غیر انسانی۔ وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھیں۔ چہرے پر نام کو گوشت یا کھال نہیں تھی۔ پھر انہوں نے بڑے ناز سے دونوں ہاتھ بڑھائے، چادر سرکائی اور طشت سے منہ لگالیا۔

اور اسی وقت دروازے پر زور سے ایک لات پڑی۔ اور طشت خالہ جان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ دس بارہ آدمی اندر گھس آئے تھے۔ یہ سب پولیس کی وردی میں تھے اور ان کی قیادت وہی انسپکٹر کر رہا تھا جو مجھ سے مرتھا کے بارے میں سوالات کرنے آیا تھا۔

”گرفتار کر لو ان دونوں کو۔“ اس نے پولیس والوں سے کہا جو خود بھی خوف

کانپ رہے تھے۔

”آئے تمہارا ستیاناس ہو جائے کبھو۔ تم کہاں سے آ مرے۔ چل رہے نزاکت۔“

اب یہاں گزارہ مشکل ہے۔“ خالہ جان نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے